PAGES MISSING
WITHIN THE
BOOK ONLY

یگار سے یہ سلاجیت تیار ہوتا ہے اور ہم
ہیں استعمال کیا جاسکتا ہے جس کے
ورسچا کارخانہ ہمالیہ ڈپو ہی ہے

کرنیوالی شی منی اور

ا



دینے والی کوئی دوائی نہیں ہے
ے سستی اور کمزوری یکایک
رد، چکر آنا، پاگل پن، مرگی وغیرہ
ت، آنکھوں میں روشنی،
جاتی ہے +
یعنی جسم کی ہر تکلیف کو اور
رکھتا ہے +
ب کہ جس کو سلاجیت

عمر بھی زیادہ ہوگی،
اور روپے (عہ) دس تولہ
علاوہ محصولڈاک

I

P.

سلاجیت
[illegible] جیت

نیرنگ خیال

(جملہ حقوق محفوظ)

جلد (۱۴)

سالنامہ ۱۹۳۹ء

چندہ سالانہ دو روپے (عہ)
سالنامہ سمیت تین روپے (سے)
قسم اعلےٰ سالنامہ سمیت (للعہ)

ممالک خارجہ سے سالنامہ سمیت - آٹھ شلنگ
اس پرچہ کی قیمت (عہ محصول)

بابت ماہ جنوری ۱۹۳۹ء

چیف ایڈیٹر

حکیم محمد یوسف حسن

حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے کیپٹل کو اپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر دفتر رسالہ نیرنگ خیال بیڈن روڈ - لاہور سے شائع کیا (کتبہ رفیق احمد خوشنویس)

آغاز پیرایہ

خدا کا شکر ہے کہ ۱۹۳۹ء کا سالنامہ - سالنامہ نیرنگِ خیال شائع ہو گیا۔

اپنی زبان، اپنے آرٹ، اپنے علم و ادب اور اپنی صحافت کی ترقی و حفاظت میں جو حصہ نیرنگِ خیال کا ہے، ہم نے اُسے ادا کرنے کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور یہ حقیقت آپ کے پیشِ نظر ہے۔ معاصرین کی کاوشوں اور اُن کی محنتوں کی تعریف و حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ہم اپنے متعلق صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نیرنگِ خیال کے اس سالنامہ کا بغور تمام و کمال مطالعہ فرمایئے تو آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ اس میں کچھ امتیاز ہے، اس میں کچھ نرالاپن ہے، اس میں کچھ ایسی خوبیاں ہیں جو اُسی کے لئے مخصوص ہیں، تمام سالناموں میں کئی باتیں مشترک ملتی ہیں، لیکن نیرنگِ خیال کئی ایسی خصوصیات رکھتا ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں، اس میں کم از کم پندرہ بیس ایسے نامور ادبا اور ماہرینِ فن بلکہ قائدین کے رشحاتِ قلم ہیں جو دیگر سالناموں میں نہیں ہیں، نیرنگِ خیال کا سالنامہ افسانوں اور ادبی طرز کی چیزوں کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کے مضامین میں تحقیق و تدقیق، کاوش و جستجو، علوِ تخیل، علم و عرفان کی جھلک ہے، یہ مجموعہ نہ صرف ضخیم ہے بلکہ گنجِ معانی اور رموزِ علوم جہانی کا ایک قابلِ قدر ذخیرہ ہے جس میں سے بیشتر مضامین محفوظ رکھنے اور ضرورت پر ریکارڈ و ریفرنس کے لئے کار آمد ثابت ہوں گے +

سالنامہ کی ترتیب و تدوین میں مختلف عناصر مل کر کام کرتے ہیں، سب سے اول ہمارے قلمی معاونین ہیں جو نیرنگِ خیال کیلئے خاص کاوش سے مضامین رقم فرماتے ہیں، پھر ہمارے ادارے کے وہ حضرات ہیں جو خاص خاص مضامین کے تراجم سلیس اردو میں لکھتے ہیں تاکہ اس خوانِ ادبی پر قسم قسم کے نمونے پیش کئے جا سکیں۔ پھر معاون مدیر کی محنت ہے جو پرچہ کو اغلاط سے پاک رکھنے کی سعی کرتا ہے، کاپی اور پروف کا پڑھنا بھی ایک خاص فن ہے اور اس میں راجہ مہدی علی خاں کا ممنونِ منت ہوں کہ امسال انہوں نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا ہے، راجہ مہدی علی خاں ایک نوجوان جرنلسٹ ہیں جو کامیابی سے متعدد روزناموں اور ہفتہ وار اخباروں میں کام کر رہے ہیں +

سالنامہ کی تکمیل میں دیگر کارکنوں نے بھی اپنی اپنی جگہ جو کام کیا ہے وہ آپ کے پیشِ نظر ہے، کتابت منشی رفیق احمد خاں خوشنویس رامپوری نے کی ہے طباعت کیپیٹل کو اپریٹو پرنٹنگ پریس وطن بلڈنگ لاہور کی ہے جس کے مہتمم جناب غلام احمد صاحب بڑے خوش خلق باسلیقہ اور اپنے کام میں بہت دلچسپی لینے والے بزرگ ہیں۔ تصاویر وکٹوریہ پریس لاہور میں چھپی ہیں جو نیرنگِ خیال کی تصاویر ۱۵ سال سے چھاپ رہے ہیں۔ جملہ کاغذ بی ایس مدان پیپر مرچنٹ انارکلی لاہور سے خریدا گیا ہے بلاک دی بنگال کرومو کمپنی والوں نے تیار کئے ہیں جو ایک نئی فرم ہے مگر بہت کامیابی اور محنت سے کام کر رہی ہے، جلد بندی کا کام مولوی جلال الدین صاحب بیڈن بازار لاہور نے کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم ان تمام حضرات کے ممنون ہیں جنہوں نے اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹایا اور اپنے اپنے فرائض کو بہ طریقِ احسن سرانجام دیا ہے +

گذشتہ سال سالنامہ دسمبر میں شائع ہوا تھا، امسال یہ جنوری کا پرچہ ہے، فروری کا پرچہ چھپ رہا ہے جو جلدی ہی آپ کی خدمت میں پیش کیا جائیگا، مرزا عظیم بیگ چغتائی کا مضمون اور محترمہ حجاب امتیاز علی صاحبہ کا افسانہ یہ دو چیزیں بہت دیر سے موصول ہوئیں جنہیں ہم شریکِ اشاعت کرنے کی خواہش کے باوجود شامل نہ کر سکے یہ دونوں مضامین فروری کے نیرنگِ خیال میں ملاحظہ فرمایئے گا +

جو اصحاب یہ سالنامہ بازار سے خریدیں وہ فروری سے صرف دو روپے سالانہ چندہ میں خریدار ہو سکتے ہیں یا اس سالنامہ ۱۹۳۹ء سمیت سال بھر کیلئے صرف تین روپے منی آرڈر کر سکتے ہیں یا تین روپے پانچ آنے کا وی پی منگا سکتے ہیں، ہم ہندوستان بھر کے علمی ذوق رکھنے والے حضرات سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ یہ قلیل رقم بھیجکر ادارہ کی عملی امداد کریں اور ہماری حوصلہ افزائی بھی۔ (اعلیٰ قسم کا چندہ سالانہ صرف سوا چار روپیہ ہوگا) منیجر

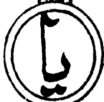
ناظرینِ نیرنگِ خیال یہ سُن کر مسرور ہوں گے کہ ڈاکٹر لمعہ حیدر آبادی کے ادبی شہ پارے کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں، اس مجموعہ کا نام **ڈاکٹر لمعہ حیدر آبادی** کا پریم رس ہوگا اور انشاء اللہ ایک ماہ تک مکمل ہو کر دنیائے ادب میں اپنی معقول جگہ حاصل کرے گا +

انسان کی ترقی کا راز اس کی کوششوں میں پنہاں ہے

مصائب سے گھبرا کر قدم پیچھے ہٹانا بزدلی ہے

جنرل فلمز لمیٹڈ بمبئی کا تیار کردہ ایک اور تازہ شاہکار :-

انڈسٹریل انڈیا



نرالا ہندوستان

فلموں کا مدعا تفریح مہیا کرنا ہے۔ لیکن ان میں قوم کیلئے پیغام بھی چاہیئے۔ "نرالا ہندوستان" میں آپ کے لئے مندرجہ ذیل پیغام ہے :- اپنی عمر اور قوت تباہ کن قمار بازی یا نوکری کی تلاش میں ضائع نہ کرو۔ بلکہ دستکاری کے کارخانے قائم کرو۔ جس سے لاکھوں کی پرورش "ہو"



عنقریب آپ کے شہر میں دکھلایا جائیگا۔ لاہور میں نشاط تھیٹر میں اس کا انتظار کیجئے

ڈسٹری بیوٹرز:- منور الجن پکچرز بیٹن روڈ لاہور

چاندنی چوک دھلی

عرق ماء اللحم

خاص الخاص



قیمت فی بوتل للعہ

یہ عرق نہایت لطیف اور مفرح اور مقوی اعضائے رئیسہ ہے۔ خون صالح پیدا کرتا ہے۔ پٹھوں کو طاقت دیتا ہے۔ مردہ جسم میں از سرِ نو جان ڈال دیتا ہے۔

قیمت فی بوتل للعہ (چار روپے)

۸۰ صفحہ کی مفصل فہرست ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمایئے۔

اکسیر سیلان الرحم

یہ دوا خاص طور سے مستورات کے واسطے دواخانہ نے تیار کی ہے۔ اکثر امراض میں اس دوا کے جسقدر تجربہ کئے گئے ہیں اور جسقدر یہ دوا مفید ثابت ہوئی ہے۔ اکسیر سیلان الرحم عورتوں کیواسطے درحقیقت آبحیات کا کام کرتی ہے سیلان الرحم کے علاوہ جملہ عارضات رحم، مثلاً ضعف الرحم، ورم رحم، ایام حیض (ماہواری خون) مثلاً بے قاعدہ آنا، زیادہ آنا یا رک رک کے آنا، درد کے ساتھ آنا، پنڈلیوں اور درد کمر کا ہونا، مانع حمل یا ساقط ہو جانا اور دبلا بدن جسم کا لاغر ہونا، اور اختناق الرحم (ہسٹیریا) کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے، تندرست عورتیں "اکسیر سیلان الرحم" کو استعمال کر کے بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتی ہیں غرض ہر نسوانی مرض کیلئے بے مثل علاج ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ محصول بذمہ خریدار۔ مفصل فہرست کارڈ آنے پر مفت بھیجی جاتی ہے۔

دواخانہ یونانی (دہلوی) کشمیری بازار لاہور

غازی اعظم مصطفےٰ کمال دنیا کی نظروں میں } غازی مصطفےٰ کمال اتاترک دنیا کا ایک بلند پایہ ڈکٹیٹر جس نے ٹرکی کے تن نیم جان کو زندگی بخشی اور جس کے تدبر و شجاعت کا لوہا دنیا کی تمام مخالف و موافق طاقتیں مانتی تھیں۔ اگر اس کے متعلق دنیا کے ہر حصہ کے اہل الرائے اور اہل قلم حضرات کے وہ مضامین جو انہوں نے غازی مرحوم کی زندگی پر بحث کرتے ہوئے لکھے تھے ملاحظہ فرمانے ہوں تو یہ کتاب منگوائیں۔ قیمت صرف ۸ر

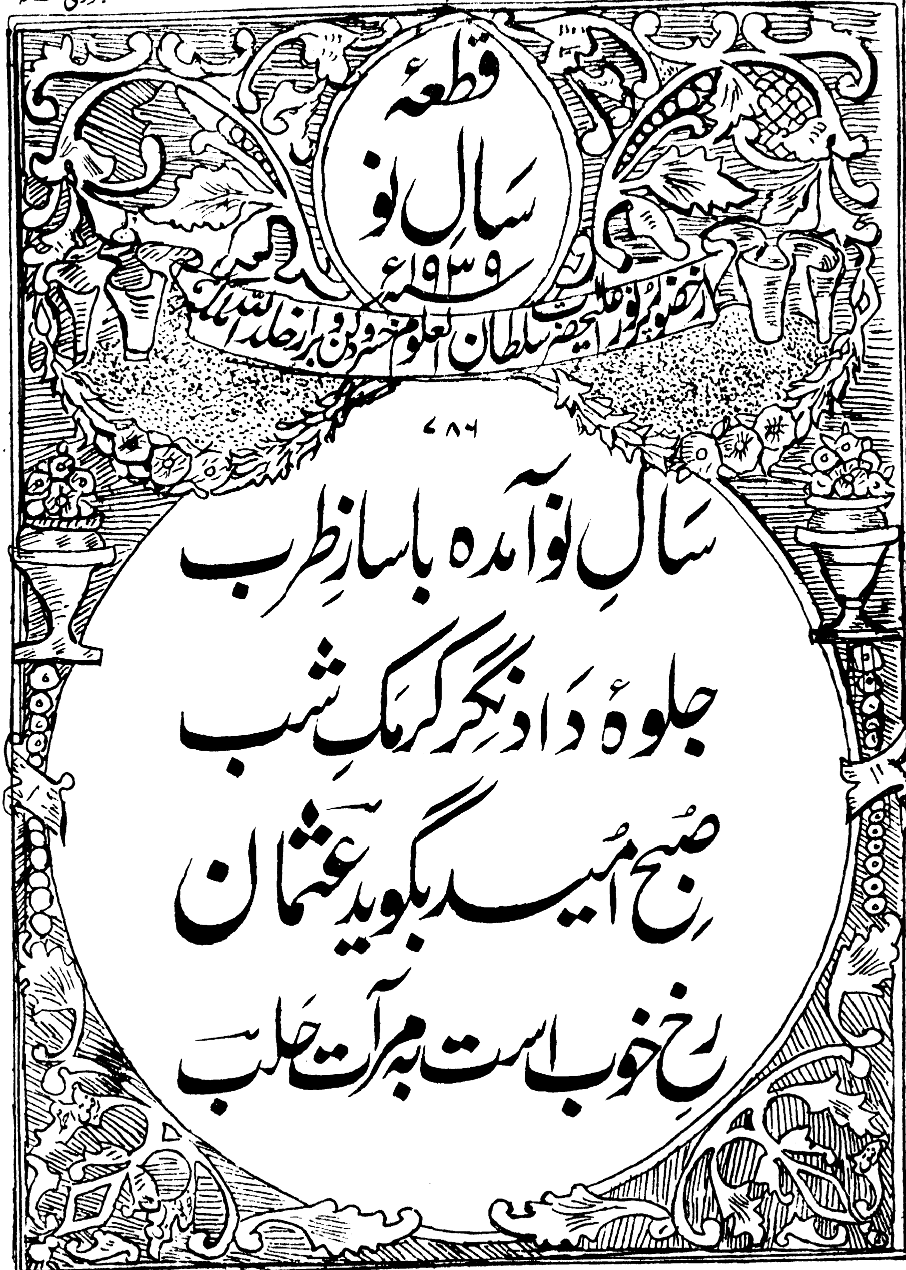
حیات خالدہ خانم:۔ اس شیر دل خاتون کو دنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ اور اس کی جنگی و فوجی خدمات دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ جنگی کارناموں کے علاوہ اس کی ادبی خدمات بھی نہایت ہی بلند پایہ ہیں۔ اس کی علمی قابلیت اور جنگی کارناموں کے حیرت انگیز واقعات اس کی سوانح حیات میں ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت صرف ۸ر

طب اکبر فارسی:۔ مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب مرحوم جن کو مجدد طب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ کتاب ان کی تصحیح اور حاشیہ سے شائع کی گئی ہے۔ یہ کتاب ہر طبیب کے مطب میں لازمی طور پر رہنی ضروری ہے۔ قیمت صرف تین روپے۔ علاوہ محصولڈاک۔

استاد حلوائی:۔ ہر قسم کے حلوے۔ مربے۔ چٹنیاں، اچار وغیرہ اس قسم کی دوسری چیزیں تیار کرنے کے مفصل طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ جن کے پڑھنے سے یہ چیزیں گھر بیٹھے تیار کی جا سکتی ہیں قیمت ۸ر

مجموعہ خواب نامہ صدیقی:۔ خواب کا فلسفہ۔ سچی اور جھوٹی خوابوں کی پہچان اور خوابوں کی قسموں کے وضاحت کے علاوہ ہر قسم کی خوابوں کی تعبیر بیان کی گئی ہے۔ پرانے خواب ناموں میں نئی ایجادات وغیرہ جو خواب میں نظر آئیں۔ مثلاً ریل، ہوائی جہاز وغیرہ ان کی تعبیر نہیں ملتی۔ لیکن اس کتاب میں زمانہ حال کے مطابق ہر وہ چیز جو خواب میں آسکتی ہے اس کی تعبیر علم الخواب کے مطابق نکال بیان کر دی گئی ہے۔ قیمت بلا جلد کے لئے ایک روپیہ آٹھ آنہ مجلد دو روپے

منگانے کا پتہ:۔ **دفتر قریشی بکڈپو (ن) لاہور**


قطعہ
سالِ نو
۱۹۳۹ء
از حضور پُر نور اعلیٰحضرت سلطان العلوم خسرو دکن و برار خلد اللہ ملکہ
۷۸۶
سالِ نو آمدہ با سازِ طرب
جلوۂ داد نگرِ گرمکِ شب
صبحِ امید بگوید عثمان
رخِ خوب است بہ مرآت حلب

آنریبل میاں عبدالحئی صاحب وزیر تعلیم پنجاب

اور

نیرنگ خیال

مکرمی حکیم صاحب - السلام علیکم

نیرنگِ خیال کا سالنامہ ۱۹۳۸ء مجھے میرے دوست شیر احمد خاں پلیڈر کے ذریعے ملا شکریہ، اس سالنامہ کو میں نے توجہ سے پڑھا، رسالہ کے بلند پایہ مضامین، رسالہ کی ترتیب اور طباعت کی صوری خوبیوں میں آپ کی کاوش ہمت اور قابلیت کا عکس دیکھتا ہوں، علمی وادبی مقالات کا یہ گرانقدر مرقع، اردو علم وادب کی بہترین خدمت ہے۔

سالنامہ کی اس کامیاب اشاعت پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں ؂

نیازمند عبدالحئی

افرنگ کی دُنیا

(ملک الشعراء حسان الملک بہادر خانصاحب ابوالاثر حفیظ جالندھری)

نیرنگ خیال آج بصد فخر ایک ایسی نظم شائع کر رہا ہے جو موجودہ اُردو دنیا کے سب سے بڑے شاعر نے مغرب کی سیر و سیاحت کے بعد لندن میں بیٹھ کر لکھی اور لندن ہی کے ایک جلسے میں سنائی۔ حضرت حفیظ جب انگلستان سے ہندوستان کو واپس پلٹ رہے تھے، ہندوستانی سپکنگ یونین نے آپ کو ایک عظیم الشان الوداعی پارٹی دی۔ جس میں ہندوستانی اور افرنگی زن و مرد کثرت سے شریک تھے، اس تقریب کی تصویر متعدد انگریزی جرائد میں شائع ہو چکی ہے، ہم اس تلاش میں تھے کہ کسی نہ کسی طرح وہ نظم حاصل کریں جو حفیظ نے اس پارٹی میں سنائی تھی اور جس کا ترجمہ شیخ سر عبدالقادر صاحب نے اُردو سے ناواقف انگریزوں اور ہندوستانیوں کو سنایا تھا ہم نے سنا کہ اس نظم پر پُرجوش نعرہائے تحسین بلند ہوئے تھے مگر حفیظ صاحب سے اس نظم کا حاصل کرنا کوئی آسان بات نہ تھا، کیونکہ وہ خود اس نظم کو بعض دوسری نظموں کے ساتھ جو آپ نے انگلستان کے سفر میں لکھیں اور جن کا ترجمہ سر عبدالقادر نے کیا کتابی صورت میں شائع کرنیوالے ہیں، ہم نے اس کو کس طرح حاصل کیا۔ یہ ایک طولانی کہانی ہے، یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ نیرنگِ خیال کے مراسم قدیمانہ نے حفیظ کو انکار پر اصرار نہ کرنے دیا۔ آج کل حفیظ صاحب کا کلام سونے میں تلتا ہے لیکن یہ فخر نیرنگ خیال ہی کو حاصل ہے کہ بہترین افکار اُس کے صفحات کی زینت بنتے ہیں نیرنگِ خیال ممدوح کا شکرگذار ہے:۔ (یوسف حسن)

افرنگ کی دُنیا

نیرنگِ طلسمات ہے افرنگ کی دُنیا — قسمت نے دکھائی یہ نئے رنگ کی دُنیا

رقص و طرب و نغمہ و آہنگ کی دُنیا — ہنگامہ و ہول و فتن و جنگ کی دُنیا

فردوس بھی ہے۔ خوف سے خالی بھی نہیں ہے

اصلی جو نہیں ہے تو خیالی بھی نہیں ہے

رنگینیٔ گل - بارش شبنم دیکھ رہا ہوں حُسنِ عمل و حُسنِ نظر دیکھ رہا ہوں
ہر لحظہ فراوانیٔ زر دیکھ رہا ہوں سرمایہ و محنت کا اثر دیکھ رہا ہوں
اس عقل نے ہمت سے بڑا کام لیا ہے
تکلیف اٹھائی ہے تو آرام لیا ہے

حیراں ہوں - سرِ راہگذر دیکھ رہا ہوں اک حشر سا تا حدِّ نظر دیکھ رہا ہوں
ہنگامۂ انبوہِ بشر دیکھ رہا ہوں ہر فرد ہے بے خوف و خطر دیکھ رہا ہوں
اس بھیڑ میں ٹکرا کے گذرتا نہیں کوئی
لڑتا نہیں - توہین بھی کرتا نہیں کوئی

آفاق پُر از فتنہ و شر دیکھ رہا ہوں یہ روز و شب و شام و سحر دیکھ رہا ہوں
قوموں کی ہلاکت کا ہنر دیکھ رہا ہوں دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
جو دیکھ رہا ہوں وہ بیاں ہو نہیں سکتا
آنکھوں سے مری کارِ زباں ہو نہیں سکتا

مٹی ہی نہیں - آگ بھی - پانی بھی ہوا بھی مغلوب نظر آتے ہیں زنجیر بپا بھی
اک زلزلہ ہے زیرِ زمیں - زیرِ سما بھی حیران فرشتے بھی ہیں شاہد ہے خدا بھی
دیوار ہیں شکستہ ہوئیں زندانِ بقا کی
انسان کے پنجے میں ہے تقدیر فنا کی

شاعر ہوں مرا کام نہیں فلسفہ دانی کھلتی ہے مجھے ٹھوس نتائج کی گرانی
انسان کی تصویر نئی ہو کہ پُرانی مطلوب ہے مجھے حُسن ہے اور حُسنِ معانی
اللہ کے بندوں سے مجھے بیر نہیں ہے
یعنی مری دنیا میں کوئی غیر نہیں ہے

مغرب میں جما یا ہے جو خورشید نے ڈیرا لازم ہے کہ چند روز رہے مشرق میں اندھیرا
جب رات گذر جائیگی - آئیگا سویرا ایام پہ کچھ زور نہ تیرا ہے نہ میرا
یہ دورِ شب و روز و مہ و سال رہیگا
گردش ہے جو قائم تو یہی حال رہیگا

مشرق بھی نہیں علم و کمالات سے خالی
مشرق ہی کے در پر کبھی مغرب تھا سوالی
ہاں ایک ادا دیکھی ہے مغرب میں نرالی
مجبور ہے مشرق کی جہاں ہمت عالی

وہ ایک ادا - نازہے؛ عورت کی لقا پر
مشرق مرا قربان ہے اسی ایک ادا پر

یہ فلسفہ، یہ علم، یہ حکمت، یہ کمالات
یہ فکر، یہ تدبیر، یہ اعمال و خیالات
یہ بحث، یہ تحقیق، جوابات۔ سوالات
یہ گولہ، یہ بارود، ہلاکت کے یہ آلات

یہ زور، یہ غصہ، یہ غضب کس کے لئے ہے
کیا علت غائی ہے، یہ سب کس کیلئے ہے

یہ جوش عمل، ولولہ و عقل و فراست
یہ شان، یہ شوکت، یہ تکلف، یہ نفاست
یہ ضبط، یہ نظم اور یہ تدبر یہ سیاست
حاوی ہے ہر اک بات پہ اک حرف ریاست

اس حرف میں ہر کام کی تحریک نہاں ہے
پھر اس میں بھی اک نکتۂ باریک نہاں ہے

یہ نکتۂ باریک ہے بے شک سبق آموز
عریاں ہے اس آئینے میں اک شکل دل افروز
مقصود ریاست کا ہے روشن صفت روز
اس ابر میں خنداں ہے عجب برق جہاں سوز

یہ برق جہاں سوز ہے حسن زن مغرب
حسن زن مغرب ہی سے ہے خرمن مغرب

بازار میں ہے گرمیٔ بازار اسی سے
آتے ہیں دکانوں میں خریدار اسی سے
سودا ہے یہی، چلتا ہے بیوپار اسی سے
اشرفیوں کی جیبوں میں ہے جھنکار اسی سے

ہر کوچہ و برزن میں ہے تشہیر اسی کی
دیکھی در و دیوار پہ تصویر اسی کی

میخانوں میں ہے رنگ مے و جام اسی کا
کس کا ہے لہو بادۂ گلفام؟ اسی کا
تصویر کے پردے پہ بھی ہے کام اسی کا
اخبار کے صفحوں میں بھی ہے نام اسی کا

اور ساز سیاست کی بھی دمساز یہی ہے
ظاہر کبھی ہوتا نہیں جو راز یہی ہے

کہتے ہیں ترقی کی ہے بنیاد اسی پر　　ایجاد ہے یہ عالمِ ایجاد اسی پر

ظاہر میں تو افرنگ ہے آباد اسی پر　　باطن میں جو دیکھو تو ہے بیداد اسی پر

عورت کو جوانی میں بناتے ہیں تماشا

ڈھل جائے جوانی تو سمجھ لیتے ہیں لاشا

مشرق میں جو زینت ہے، چھپانے کیلئے ہے　　مغرب میں مگر جلوہ دکھانے کیلئے ہے

مشرق میں تو زن گھر ہی بسانے کیلئے ہے　　مغرب میں یہ بیچاری کمانے کیلئے ہے

آزاد، معیشت کے سرانجام کی خاطر

مجبور ہے معصوم ہر اک کام کی خاطر

تشریحِ بدن کرتی ہیں مغرب کی دکانیں　　ہیرے کے یہ بازو ہیں یہ بلور کی رانیں

پلکیں ہیں یہ تیر اور یہ ابرو ہیں کمانیں　　آئینوں میں آئینہ ہیں جوبن کی اُٹھانیں

یہ جلوہ؟ مذمت نہ ستائش کیلئے ہے

بیوپار کی خاطر ہے؟ نمائش کیلئے ہے

بے جان نمونوں میں جو یہ رنگِ ادا ہے　　جاندار حسینوں کا تو پھر ذکر ہی کیا ہے

جس بُت پہ نظر ڈالئے، اک شانِ خدا ہے　　یہ شانِ خدا ہے تو بہت ہوشربا ہے

یارب جو یہی جلوہ نمائی ہے بتوں کی

ہے تیری خدائی کہ خدائی ہے بتوں کی

پیرس میں یہ انوار ہیں لندن سے زیادہ　　وہ حُسن ہے رنگین، یہاں حُسن ہے سادہ

وہ رقصِ برہنہ، وہ اچھل کود، وہ بادہ　　ہر جوشِ نمائش میں نہاں ایک ارادہ

یعنی کوئی ترکیب، کوئی چال نکالو

جیبوں سے مسافر کی زر و مال نکالو

طوفان ہیں، سیلاب ہیں یہ حُسن کے بازار　　ہر گام پہ صد فتنۂ محشر ہے نمودار

ایمان تو کیا، جان کا بچنا بھی ہے دشوار　　آنکھوں سے بھی ہشیار، ہو دل سے بھی خبردار

اے دوست! خطرناک ہے اُفتادِ نظر کی

پھسلا جو قدم، خیر نہیں کاسۂ سر کی

اِس حُسن کے انبوہ قیامت کو تو دیکھو اس نازو ادا و قد و قامت کو تو دیکھو
میں دیکھ رہا ہوں۔ مری شامت کو تو دیکھو نادار مسافر کی ندامت کو تو دیکھو

خفت وہ ملی ہے۔ کہ اٹھائی نہیں جاتی
دل خاک سے ملے۔ آنکھ ملائی نہیں جاتی

دیکھی ہے عجب سیر سمندر کے کنارے تھے ریت کے ذرّے۔ فلکِ حسن کے تارے
شمشیرِ برہنہ کے تھے سوز نظارے وہ رقص، وہ نغمہ، وہ شرارت، وہ اشارے

پانی میں تھرکتی ہوئی سیماب کی موجیں
اور دھوپ میں خورشید جہانتاب کی موجیں

جل پریاں تھیں یا محوِ طرب مردُم آبی عُنّابی سے کچھ جسم تھے کچھ رنگ گلابی
صوفی تھے وہ سب ایک فقط میں تھا شرابی چاہی میری آنکھوں نے مرے دل کی خرابی

ساحل نہیں میرے لئے گردابِ بلا تھا
اللہ نے بچایا مجھے۔ میں ڈوب چلا تھا

معمور حسینوں سے ہیں باغ اور چمن زار ہر رنگ نمایاں کوئی سادہ، کوئی پُرکار
آزاد کوئی، کوئی محبت میں گرفتار بیٹھے ہوئے، لیٹے ہوئے، خوابیدہ و بیدار

کچھ دیکھ کے اپنی ہی ادا جھوم رہے ہیں
کچھ اپنے دلآرام کا منہ چوم رہے ہیں

لڑتی ہیں سدا حُسن و محبت کی نگاہیں لیکن یہ تعجب ہے کہ اُٹھتی نہیں آہیں
چڑھتے ہیں نشے، اور اُترتی ہیں کُلاہیں لب ملتے ہیں اور زیبِ کمر ہوتی ہیں باہیں

اِس جوشِ ملاقات میں حائل نہیں کوئی
فرسودہ خیالات کا قائل نہیں کوئی

کمزور دلیلوں کی بنا ہوں میں جوانی مشغول ہے معصوم گناہوں میں جوانی
بے باک ہوسناک نگاہوں میں جوانی اٹھلائی ہوئی پھرتی ہے راہوں میں جوانی

بجلی کی چمک خندۂ گفتار سے پیدا
شعلے کی لپک گرمئ رفتار سے پیدا

قانون ہی جب برسرِ بیداد نہ آئے کیوں وصل سے ہر اہلِ ہوس شاد نہ آئے
خود حسن پہ جب تک کوئی افتاد نہ آئے کوشش یہی ہوتی ہے، خدا یاد نہ آئے

آزادیٔ افکار میں کیسا کام خدا کا
مجبوری میں آتا ہے فقط نام خدا کا

افرنگ میں دراصل حسینوں کی ہے شاہی ہے ان کے تسلّط میں سفیدی و سیاہی
ہوتی ہے انہی کیلئے اوروں کی تباہی فوجیں اسی خاطر، اسی خاطر ہیں سپاہی

توپوں سے جو ہوتی ہے یہ اقوام کی خاطر
اے حُسن! یہ سب ہے تیرے آرام کی خاطر

خوش ہو میرے مشرق، تیری قسمت ہے نرالی مغرب کے لبوں پر ہے تیرے خُون کی لالی
کالا ہے یہ چہرہ، میری ہڈّی نہیں کالی دیکھو، ہے اسی غازے سے چہرے کی بحالی

بچنے کی نہ اب میں کوئی تدبیر کرونگا
سر اپنی خوشی سے تہِ شمشیر کرونگا

اب میرا اسلام اے میرے اربابِ عنایات جاتا ہوں، کہ مطلوبِ وطن ہیں میری خدمات
رُکنے کی اجازت نہیں دیتے میرے حالات اور یاد بھی ہیں شیخ طریقت[2] کی ہدایات

میرے لئے یہ دُور کا دیدار ہی بس ہے
نظارہ بڑی بات ہے، باقی تو ہوس ہے

صحت کی خرابی نے بھی کچھ بات نباہی کچھ قلّتِ زر سے بھی کوئی چیز نہ چاہی
ماتم میں جوانی کے یہ گذری ہے پچھاہی اس پر بھی گنہگار ہوں، توبہ ہے الٰہی

سَو رنگ بتوں نے تو دکھایا مجھے یارب
تیرا ہی کرم تھا، کہ بچایا مجھے یارب

حفیظ

---

[1] اس نظم کو کوئی دوسرا رسالہ یا اخبار بحوالہ نیرنگ خیال بھی نقل کرنیکا مجاز نہیں ہے۔ تمام حقوق نقل و اخذ بحق مصنف محفوظ ہیں۔

[2] شیخ طریقت سے مراد آنریبل شیخ سر عبدالقادر ہیں۔ جو آجکل لندن میں انڈیا آفس کے ممبر ہیں۔

علامہ سر محمد اقبال کا آخری کلام

معزول شہنشاہ

ڈیوک آف ونڈسر

ہو مبارک اس شہنشاہ نکوفرجام کو
جس کی قربانی سے اسرار ملوکیت ہیں فاش

"شاہ" ہے برطانوی مندر میں اک مٹی کا بت
جسکو کرسکتے ہیں جب چاہیں پجاری پاش پاش

ہے یہ مشک آمیز افیوں ہم غلاموں کیلئے
ساحر انگلیس! مارا خواجۂ دیگر تراش

آزاد و محکوم

آزاد کی رگ سخت ہے مانند رگ سنگ
محکوم کی رگ نرم ہے مانند رگ تاک

محکوم کا دل مردہ و افسردہ و نومید
آزاد کا دل زندہ و پرسوز و طربناک

آزاد کی دولت دل روشن نفس گرم
محکوم کا سرمایہ فقط دیدۂ نمناک

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

ممکن نہیں محکوم ہو آزاد کا ہمدوش
وہ بندۂ افلاک ہے یہ خواجۂ افلاک

اقبال

رباعی

تیرے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے؟

اقبال

کلامِ شجیعؔ!

غزل

(اثرِ خامہ حضرت والاشان شاہزادہ بلند اقبال نواب معظم جاہ بہادر (حیدرآباد) شجیعؔ دام اقبالہم و اجلالہم)

دامن کو ترے تھام کے الزام نہ لیتے — رہتا جو ہمیں ہوش تو دل تھام نہ لیتے
اب تم بھی محبّت کو یہ کہتے ہو خطا ہے — ہوتی خبر اِس دن کی تو ہم نام نہ لیتے
مجبور نہ ہوتے تو کبھی عشق کے ہاتھوں — تکلیف کا کیا ذکر ہے آرام نہ لیتے
بس ان کا نہیں ورنہ وہ بے رحم ہیں ایسے — رونے کے سوا مجھ سے کوئی کام نہ لیتے
جب حشر میں ڈھونڈے گئے بدنامِ محبت — ایسے وہ کہاں تھے کہ مرا نام نہ لیتے
ظاہر ہے گذرتی ہے بڑے چین سے اُنکی — ورنہ وہ دعائے دلِ ناکام نہ لیتے

مجھ سے ہی شجیعؔ آکے وہ سنتے مری حالت
قاصد کی زبانی مرا پیغام نہ لیتے

(خاص برائے نیرنگِ خیال)

ایک تقریر!

اُردُو زبان

(از جناب سر تیج بہادر سپرو - الہ آباد)

یوم اُردو کے موقعہ پر سر تیج بہادر سپرو کے ارشادات

ڈھائی سو برس گذرے جبکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپس کے میل جول سے ایک ایسی مشترکہ زبان بنی جسے ہم اردو کہتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ آج یہ کہا جا رہا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے، ہندوؤں کی زبان تو ہندی ہے، بدنصیبی سے آج کل ہندوستان میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے جو ہندوؤں سے یہ کہتا ہے کہ انہیں صرف ہندی کو فروغ دینا اور ہندی ہی کی اشاعت کرنا چاہئے، میں نہیں سمجھتا کہ اس قسم کے لوگ ہندوستان میں ایک مشترک زبان میں تفریق کر کے کیا پائیں گے اس خراب ذہنیت کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زبان جس کو ہندو مسلمان سب ہی بولتے اور سمجھتے ہیں وہ مسلسل مشکل بنائی جا رہی ہے اور روز بروز اسکی اصلی روح کا خون ہو رہا ہے اگر اردو زبان کو مسلمان صرف اپنی زبان کہیں تو یہ اُن کی سخت غلطی ہے، اسی طرح اگر ہندو اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان سمجھیں تو یہ اُن کی ناواقفیت ہے، حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباواجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکہ کی حیثیت سے ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے اور یہی وہ زبان ہے جو قریب قریب ہر صوبہ میں کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

ہندی ایک بناوٹی اور مصنوعی زبان ہے مجھے یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس پچاس سال سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ عوام غیر فطری طور پر ایک بناوٹی زبان کو سیکھیں اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کریں جو فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور اُن کی آپس کی رواداریوں اور صدیوں کی قربانی کا نتیجہ ہے۔

لوگ مجھے جماعت سے بھٹکا ہوا ایک فرد کہتے ہیں، کہیں لیکن کوئی سمجھدار آدمی ایسے لوگوں کو اپنے آباواجداد کا سپوت نہیں کہہ سکتا جو اپنے سلف کی قربانیوں کو جان بوجھ کر بھلا بیٹھیں اور اپنی پائی ہوئی ایک مقدس میراث کو سرِ بازار لٹا دیں، میرا یہ دعوےٰ ہے کہ وہ زبان یعنی اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے، مٹائی نہیں جا سکتی، اگر چند مٹھی بھر آدمی فرقہ دارانہ سوال پیدا کر کے اکثریت کے زعم میں اسے مٹانا چاہتے ہیں تو یہ ایک سودائے خام ہے اس تحریک سے متاثر ہو کر مسلمان بھی اُردو کو اپنی ہی زبان کہنے لگے ہیں، لیکن یہ ان کی سخت غلطی ہے، اگر مسلمانوں نے اردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہے تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اُردو کے ترقی دینے میں کمی نہیں کی، اردو ہمیشہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جائداد رہی ہے اور رہے، اگر ہندو اُردو کو تباہ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود اپنی ہی جائداد کو تباہ کر رہے ہیں۔

سنسکرت کے موٹے موٹے الفاظ ایک گروہ ہے جو اُردو زبان میں سنسکرت کے نامانوس اور نہ کھپنے والے الفاظ بلا ضرورت ٹھونس رہا ہے اور دوسری طرف جوابی طور پر عربی اور فارسی کے نئے نئے

الفاظ زبان میں بھرے جا رہے ہیں، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مشترکہ قومی زبان کا تو ذکر ہی کیا آئندہ ہمارے بچوں کو اپنی روزانہ زندگی میں معمولی بات چیت کرنے کے لئے بھی اپنے ساتھ ایک مترجم رکھنے کی ضرورت ہوگی، میری نظروں سے روزانہ اُردو اور ہندی دونوں اخبارات گذرتے ہیں، جن میں اب ایسے ایسے عجیب الفاظ دیکھنے میں آتے ہیں، جن کو میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا، عوام کا تو ذکر ہی کیا، ان الفاظ کو اُس زبان کے پڑھے لکھے حضرات بھی پورے طور سے نہیں سمجھ سکتے، میں نہیں سمجھتا کہ دو سو برس کے مستعمل الفاظ، وہ الفاظ جو ایک مشترکہ زبان کی ترکیب و ترتیب میں بالکل گھل مل گئے ہیں اُنہیں کس طرح چن چن کر نکالا جا سکتا ہے، اور کس طرح غیر مانوس اور اجنبی الفاظ کو مشترکہ زبان کی عبارت میں کھپانا ممکن ہو سکتا ہے جو لوگ اپنی طرف سے سنسکرت اور عربی کے اجنبی الفاظ کو اوپر سے لا کر اپنی زبان میں بھر رہے ہیں، کوئی سمجھدار اور انصاف پسند آدمی ایسی بنائی ہوئی زبان کو ملک کی مشترک قومی زبان ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا، میں آپ سے کہتا ہوں کہ اگر آپ ہماری زبان میں کسی غلط جذبہ کے ماتحت سنسکرت اور عربی کے نامانوس الفاظ بھر رہے ہیں جنہیں ہماری زبان کسی طرح قبول نہیں کرتی تو آپ زبان کی خدمت نہیں کر رہے ہیں بلکہ آپ اس کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں بعض لوگوں کی طرف سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم وہ زبان استعمال کرنا چاہتے ہیں جو دیہات میں عام طور پر بولی اور سمجھی جا سکتی ہے لیکن جبکہ ہر گاؤں اور قصبہ کی مقامی بولی اور لب و لہجہ میں فرق ہے اور اسی طرح دیہاتی اور شہری محاوروں اور الفاظ میں فرق ہے تو آپ کہاں تک اُن کی تقلید کریں گے۔

زبان کا سوال ہندو مسلم سوال نہیں ہے

میں جو زبان بولتا ہوں اسے میں نے کسی مولوی اور پنڈت سے نہیں پڑھا بلکہ وہ ہمارا پدری ترکہ ہے جس طرح باپ دادا اسے سنتے چلے آئے ہیں اسی طرح ہم بولتے ہیں، میں اس وقت بھی جو آپ کے درمیان موجود ہوں تو اس وجہ سے نہیں کہ میں آپ لوگوں میں سے کچھ لوگوں کو خوش کرنا چاہتا ہوں اور نہ میں اس معاملہ کو صرف آپ کا معاملہ سمجھ کر آپ کا ساتھ دینے آیا ہوں، بلکہ میں اس لئے آیا ہوں کہ وہ ترکہ جو ہمارا پدری ترکہ ہے اُسے محفوظ کرنے اور محفوظ رکھنے میں حصہ ہی نہ لوں بلکہ ان چیزوں کا رد کروں جو اس کے پامال کرنے میں استعمال کی جا رہی ہیں یہ ہمارا حق ہے اور بحیثیت ہندوستانیوں کے ہمارا فرض ہے، ہمیں اس معاملہ میں ایک دوسرے کا لحاظ کرنا ہوگا، ملک میں سیاسی اختلافات کتنے ہی کیوں نہ ہوں مگر زبان کا مسئلہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جس پر ہاتھ ڈالا جائے، یہ ضرور ہے کہ یہ زبان تمام صوبوں میں بولی اور سمجھی جانے کے لحاظ سے یکساں مرتبہ نہیں رکھتی اور نہ کسی زبان کے لئے ایسا ممکن ہے مگر پھر بھی ہر جگہ سمجھی جانے کی وجہ سے قومی زبان ہونے کا مرتبہ رکھتی ہے تو ایسی صورت میں کسی کا یہ کہنا کہ ہم تو سنسکرت الفاظ استعمال کریں گے کہاں تک مناسب اور حق بجانب ہو سکتا ہے اور ہمارے لئے یہ کہاں تک جائز ہے کہ ہم کسی کے کہنے سے اپنے ادب کو خراب کر لیں اور ہم سب کچھ کھو دینے کے بعد اُسے "ہندوستانی" زبان بھی کہیں۔

ہندوستانی کی اصطلاح دھوکے کی ٹٹی ہے

میں "ہندوستانی" کو ایک دھوکہ کی ٹٹی سمجھتا ہوں جس کے ذریعہ یقیناً خود غرض لوگ اپنے خود ساختہ پیمانے سے زبان اور ادب کو مٹانا چاہتے ہیں، حضرات میں آپ کی کوشش میں ہر طریقہ سے شامل ہوں، اگر آپ بھی اپنی قومی زبان کی وراثت کو اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھیں اور اپنی قومی زبان "اُردو" کو اُردو کہنے سے نہ ڈریں اور اعلان کے ساتھ کہیں کہ ہماری زبان "اُردو" ہے اور اُس کی عبارت کو ایسی سلیس بنائیں کہ اس کی اشاعت روز بروز بڑھتی جائے تو میں ہر حیثیت سے آپ کے ساتھ ہوں۔

اگر کوئی صاحب اپنی طرف سے عربی کے الفاظ قصداً استعمال کریں گے تو وہ اُردو کی خدمت نہ ہوگی، اگر ہندو بھائی اپنی قومی زبان میں سنسکرت کے الفاظ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر بھریں گے تو سمجھ لیں کہ وہ اٹھتے بیٹھتے اپنی قومی زبان کی بنیاد کو ہلا رہے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ "اُردو" روز بروز ترقی کرے اور آپ میں یہ اخلاقی جرأت ہو کہ آپ لفظ اُردو کو استعمال کرنے میں نہ شرمائیں اور خواہ مخواہ اس کے بجائے لفظ "ہندوستانی" استعمال کرنے کی کوشش

سائنس اور مذہب

(پنڈت جواہر لال نہرو کے قلم سے)

زمانہ سائنس کے ابتدائی ایام میں سائنس اور مذہب کی کشمکش کے متعلق بہت چرچے رہا کرتے تھے، اور سائنس کو مادیت اور مذہب کو روحانیت کے نام سے تعبیر کیا جاتا تھا، لیکن آج جبکہ سائنس نے اپنے بازو پھیلا کر تمام کائنات کو میدانِ عمل بنانے کی جسارت کر لی ہے۔ اور ٹھوس مادے تک کو ہوا میں اُڑا دیا ہے، وہ کشمکش حقیقت سے دور نظر آتی ہے، اس کے باوجود یہ کشمکش حقیقی تھی، کیونکہ یہ سائنٹیفک طریقوں کی پروردہ آزاد انسانی روح اور تخیلی مذہب کی عائد کردہ ذہنی استبداد کی کشمکش تھی، دونوں میں مصالحت کی کوئی صورت نہیں ہوسکتی ؛

کیونکہ سائنس فہم و ادراک کی راہیں مسدود کرنے کو خواہ اسے کتنے ہی خوش کن نام سے پکارا جائے کبھی تسلیم نہیں کر سکتی اور نہ کسی کے اعتقاد پر اندھادھند آمنّا کہنے کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے، لہذا سائنس کو اس بات کے لئے ضرور تیار رہنا چاہئے کہ وہ نہ صرف فردوس کی طرف دیکھ کر اسے اپنے قابو میں لانے کی کوشش کرے بلکہ بلاخوف و خطر جہنم کے گڑھے کی طرف نیچے بھی دیکھے، کیونکہ ان میں سے کسی ایک سے بھی پہلو تہی کرنے کی کوشش کرنا سائنس کا کام نہیں ہے ؛

شاید حقیقی مذہب اور سائنس میں دراصل کوئی کشمکش نہ ہو لیکن اگر یہ صورت ہے تو پھر مذہب کو سائنس کا لبادا اوڑھ کر اپنے تمام مسائل کو سائنس کی روشنی میں دیکھنا چاہئے، اب وقت ہے کہ ہم سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ اپنے دماغوں کی تربیت کریں اور زمانۂ گذشتہ کے بے معنی اختلافات کو پس پشت ڈالیں، اس میں شک نہیں کہ سائنس میں تغیر ہے اور اس کی کوئی بات حکمی یا قطعی نہیں، لیکن اس کا اصول نہیں بدلتا، اور ہمیں اپنے خیالات مشاغل مذہبی، اقتصادی، سیاسی و معاشرتی زندگی اور تحقیق و تدقیق میں اسی کو مدنظر رکھنا چاہئے ؛

ہمیں بے شمار مسائل کا سامنا کرنا اور اُن کا حل سوچنا ہے۔ سیاستدان اکیلے انہیں حل نہ کر سکیں گے، کیونکہ بہت ممکن ہے وہ ماہر علم کی سی نظر نہ رکھتے ہوں، سائنسدان بھی اکیلے حل نہ کر سکیں گے کیونکہ ان میں ایسا کرنے کی طاقت یا وہ وسیع النظری نہ ہو گی جو تمام چیزوں کے گرد احاطہ کر لیتی ہے، وہ ایک مخصوص و محدود معاشرتی مقصود کے لئے دونوں کے تعاون سے حل کئے جا سکتے ہیں اور کئے جائینگے اس مقصد کا ہونا لازمی ہے کیونکہ اس کے بغیر ہماری کوششیں لاحاصل اور بے معنی ہیں اور انہیں ربط مفقود ہے، ہم نے دیکھ لیا ہے کہ سوویٹ روس میں سوچ سمجھ کر مقرر کئے ہوئے مقصد نے متفقہ جدوجہد کا سہارا لے کر کس طرح ایک پسماندہ ملک کو ایک ایسے ترقی یافتہ صنعتی علاقے میں تبدیل کر دیا ہے، جہاں زندگی کا معیار آئے دن ترقی پر ہے، اگر ہمیں بھی بہت جلد ترقی حاصل کرنی ہے تو ہمیں کسی ایسی ہی راہ پر گامزن ہونا پڑے گا۔

ہمارے اہم مسائل میں سے ایک زمین کا مسئلہ ہے لیکن صنعت کا موضوع بھی اس سے پوری طرح وابستہ ہے اور ان کے پہلو بہ پہلو خدمات ملی کا درجہ ہے، ان تمام کا حل ایک ہی وقت میں سوچ کر انہیں باہمی تعاون کرنا پڑے گا۔ یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے لیکن ہمیں اس بوجھ کو کندھا دینا ہو گا، ہم اس بات کے بہت زیادہ عادی ہو گئے ہیں کہ ہر کام میں گورنمنٹ کی طرف سے پہل ہونے کے منتظر رہیں لیکن سائنسدانوں کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنی طرف سے پہل کریں، ہم اب کسی ایک سرے کے منتظر نہیں رہ سکتے ہمیں راہ عمل پر گامزن ہوجانا چاہیئے ؛

پنچایت

(از آنریبل مسز وجیا لکشمی پنڈت)

اس فقرے کی حقیقت میں کلام نہیں کہ جس طرح قوم شہریوں سے مل کر بنتی ہے، اسی طرح شہر قومیت کے ادارے ہیں، ہندوستان میں کچھ عرصہ پہلے تک ہم شہریت اور اس کے اعلےٰ مقاصد کو بہت ہی کم اہمیت دیتے رہے ہیں، مقامی حکومت اختیاری جیسی کہ آج ہندوستان میں موجود ہے، غیر ملکی درآمد ہے اور یہ ہماری ملکی ضروریات کیلئے غیر موزوں ہے، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ لوگ اس پر کاربند ہو کر اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کے اہل نہیں ہیں۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے تمام ہندوستان میں اختیاری حکومت کا ایک مساویانہ طریق جاری تھا، اور یہ دیہاتی برادری یا پنچایت کا طریق تھا، جس کا نظام اور حکومت اپنی ہی قسم کی تھی اور جس کا معمولی عملہ تاجروں اور کاریگروں پر مشتمل تھا،

مقامی اختیاری حکومت کا یہ طریق کار ہزاروں سال تک جاری رہا، لیکن انگریزوں کے قائم کردہ حکمرانوں کو اقتدار کا مرکز بنا دینے سے پنچایت اپنی مراعات سے محروم رہ گئی اور رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی، اگرچہ یہ اس کے بعد بھی ہم مذہب و ہم قوم لوگوں کے آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لئے باقی رہی، ۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن نے اختیاری حکومت کے متعلق اپنا مشہور حکم نافذ کیا، جس میں اس نے اس بات پر زور دیا کہ بنیادی بورڈوں کی عملداری رقبے کے لحاظ سے اس قدر محدود ہو کہ ہر ممبر کو یقینی طور پر اس سے دلچسپی اور واقفیت حاصل ہو، یہ ایک ایسا موقعہ تھا جبکہ سرعت سے نابید ہوتی ہوئی دیہاتی پنچایتوں کو از سرِ نو زندہ کیا جا سکتا تھا، لیکن اس طرف کوئی قدم نہ اٹھایا گیا، اور اس کے بہت عرصہ بعد ۱۹۱۵ء میں جبکہ مرکزی کمیشن نے اپنی رپورٹ دیہاتی پنچایتوں کے حق میں لکھی، حکومتِ ہند نے پھر معاملہ کو ہاتھ میں نہ لیا مختلف صوبوں میں دیہاتی پنچایتوں کے متعلق قوانین منظور کئے گئے لیکن ان میں کئی ایک خرابیاں ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ فائدہ نہ پہنچا۔

ہمارے ملک میں حکومت خود اختیاری کی حالت ایک الم انگیز مرقع کی سی ہے، اب ہمارے روبرو سوال یہ ہے کہ ہم اپنی مقامی جماعتوں کو دوبارہ کس ترتیب سے بنائیں، کہ اُن سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچے اور کام بھی بآسانی ہو سکے، نیز یہ کہ لوگوں میں شہریت اور فرائض کے احساس کی روح کیونکر پھونکی جائے؟

مجالس قانون ساز اور عورتیں

(از قلم محترمہ بیگم عزیز رسول صاحبہ ڈپٹی پریزیڈنٹ یوپی کونسل)

گذشتہ سو سال کے عرصے میں عورت کی حیثیت سراسر بدل گئی ہے اور ایک نئے زاویہ نظر نے انکی مشترکہ بشریت کو حیاتی اختلافات سے زیادہ اہم تسلیم کر لیا ہے، تغیر ناآشنا مشرق میں اب تبدیلیاں اس قدر جلد جلد آرہی ہیں کہ مغرب کو اُن کا احساس کبھی نہیں ہو سکتا، عورت کی حیثیت تمام ایشیا میں نمایاں طور پر اپنی کایا پلٹ رہی ہے، اسکی بڑی وجہ مغرب زدگی، جنگ عظیم کے تاثرات اور سوویٹ روس میں حکومت کی وہ کامیاب حکمت عملی ہے جس کی رو سے عورت کو درجۂ مساوات دینے کا اصول معرض عمل میں لایا جا رہا ہے - اور تمام روایتی کمزوریوں کو دُور کیا جا رہا ہے، سنہ ۱۹۱۹ء میں ہندوستان کے قانون آزادی رائے دہندگی نے عورتوں اور مردوں کو ایک ہی شرائط کے ماتحت رائے دینے کی آزادی دی لیکن جائیداد کی تخصیص نے سوائے چند عورتوں کے باقی سب کو محروم کر دیا - سنہ ۱۹۳۵ء کی ترمیم کردہ سکیم کے مطابق ایسے لوگوں کی بیویوں یا بیواؤں کو جو مقررہ جائیداد کی مالک ہوں، رائے دینے کی آزادی حاصل ہوئی اور تعلیم یا جائیداد کی بنا پر عورتوں کو خود بھی رائے دینے کا حق ملا - چنانچہ اب بہ مقابلہ تین کروڑ پچاس لاکھ آدمیوں کے . . . . تقریباً پچاس لاکھ عورتوں کو بھی رائے دہندگی کا حق حاصل ہے

ہندوستان میں نئے آئین کے ماتحت صوبجاتی مجالس قانون ساز کے لئے پہلے انتخابات اس وجہ سے بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں کہ ان میں عورتیں اپنی مخصوص نشستوں کے ساتھ ساتھ عام نشستوں کے لئے بھی کھڑی ہوئیں، اور تمام صوبوں میں پہلی مرتبہ عورتوں نے آزادی رائے دہندگی سے پورا پورا کام لیا۔

ان انتخابات نے ہندوستان میں نسوانی تحریک پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے اور آئندہ بھی ڈالیں گے :

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہندوستان یعنی اس ملک کی مجالس قانون ساز میں جسے سب سے آخر میں ایک قسم کی جمہوری حکومت دی گئی، اضلاع متحدہ امریکہ کو چھوڑ کر باقی تمام دنیا کے ملکوں سے زیادہ عورتیں ہیں اور یہ حالت اس ملک میں ہے جسے اکثر لوگ عورتوں کے معاملے میں پسماندہ سمجھتے ہیں، اضلاع متحدہ اپنی ریاستوں کی مجالس قانون ساز میں ۱۴۸ عورتیں اور کیبنٹ میں دو عورتیں رکھنے کی بنا پر سب سے اول ہے، اس میں شک نہیں کہ روس میں بھی ۱۳۰ عورتوں کو سیاسی اقتدار حاصل ہے، لیکن اس ملک کا نظام سلطنت دوسرے ملکوں سے اس قدر مختلف ہے کہ اسے مستثنےٰ کیا جا سکتا ہے اور اس طرح ہندوستان جہاں ۶۰ - عورتیں مجالس قانون ساز میں ہیں، دنیا میں دوسرے درجہ پر ہے اگر فیڈریشن پر عمل ہوا تو ان عورتوں میں جو پہلے سے مختلف صوبوں میں موجود ہیں چھ کا اضافہ اور ہو جائے گا۔

یہ امر حد درجہ تعجب خیز ہے کہ قانون ساز عورت تو کیا فرانس، اٹلی سوئٹزرلینڈ، نازی، جرمنی اور جاپان میں کوئی عورت رائے دینے والی بھی نہیں ہے، عورتوں کی رفتار ترقی میں کبھی باقاعدگی استواری اور

یکسانیت نہیں پائی جاتی، ہٹلر کے طرزِ حکومت سے پہلے جرمن دارالحکومت میں تینتیس عورتیں تھیں، لیکن اب ایک بھی نہیں ہے۔

ہندوستان میں آج ایک عورت صوبجات متحدہ میں لوکل سلف گورنمنٹ اور صحت عامہ کی وزارت کا قلمدان سنبھالے ہوئے ہے، دو عورتیں مدراسی اور صوبجات متوسط کی مجالس قانون ساز میں ہیں، دو عورتیں اضلاع متحدہ اور آسام کی قانون ساز کونسلوں میں نائب صدر ہیں، دو عورتیں پنجاب اور بمبئی میں پارلیمنٹری سکرٹری ہیں اور کئی عورتیں بہت سے ممبروں کی رائے اپنے حق میں رکھتی ہیں۔ قانون سازی کے دائرے میں ہندوستانی عورتوں کا قدم رکھنا ان کی کامیابی اور عملی زندگی اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ ملک بیش از بیش ترقی کر گیا ہے ؛

سیاست سے ہماری عملی وابستگی کا مطلب یہ ہے کہ اُن مسائل کو جن کا اثر بچوں اور عورتوں کی مزدوری بلالحاظ مرد و زن مساوی کام کے لئے مساوی اُجرت، دائیوں کے متعلق ایک مبسوط قانون صغرسنی کی شادی کا انسداد، بدچلنی کو دبانا، بیواؤں کے حقوق، عورتوں کا حق وراثت اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے مزید سہولتیں بہم پہنچانے پر پڑتا ہے، زیادہ اچھی طرح سمجھیں۔ یہ اور بہت سے دوسرے ضروری مسائل ایسے ہیں، جن کے لئے عورت کے نقطۂ نظر سے فوری قانون کی ضرورت ہے۔

عورتوں کے اس طبقے میں جسے رائے دہندگی کا حق حاصل ہے، اور جن کی تعداد اب پچاس لاکھ تک پہنچ چکی ہے، حال ہی میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ یہ بیداری بہت جلد بڑھ جائے گی، ہندوستان کی خوشی اور استحکام بہت بڑی حد تک اس کے نسوانی طبقے پر منحصر ہے اور اگر ہم اُن مواقع سے جو اب بہم پہنچائے گئے ہیں پورا پورا فائدہ اٹھائیں تو مستقبل میں ہمیں مزید اعتماد کئے جانے کا زیادہ بہتر موقع ملے گا۔

ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ہم قوم کے لئے باعث عزت اور قبولِ عام انسانی ترقی، آشتی اور خوشی کی ضامن ثابت ہوں ہمیں اپنا فرض اس جذبہ کے ماتحت ادا کرنا چاہئے کہ ہم اپنے ملک اور اپنے طبقہ کی خدمت بجا لا رہی ہیں ؛ (اے آئی آر)

کمال اتاترک

موت اُس حیرت انگیز شخصیت کو لے گئی ہے جس کی قوتِ فیصلہ، جرأت اور دلیری نے پہلے تو ترکی کو اس کے دشمنوں سے نجات دلائی تھی اور اس کے بعد اس کے باشندوں کی زندگی میں ایک ایسا سیاسی اور معاشرتی انقلاب پیدا کر دیا تھا جس کے مقابلہ میں پیٹر اعظم یا لینن کا انقلاب ہی پیش کیا جا سکتا ہے، ایک سپاہی، ایک قائد اعظم اور ایک منتظم کی حیثیت سے غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی نظیر نہیں ملتی، بلکہ زمانہ قدیم کے جنگجو سلاطین میں سے بھی بہت کم اس کی ہمسری کا دعوےٰ کر سکتے ہیں، اس کی کاوشوں نے ترکوں کو یورپین قوموں کے برابر لا کھڑا کیا اور مشرق بعید کی تاریخ بدل ڈالی۔

اتاترک کے متعلق ایک ترک خاتون کی وہ تنقید جس میں انہوں نے غازی کے متعلق کہا تھا "وہ ایک ایسے لاجواب لیڈر ہیں کہ انہیں سوائے اپنی قوم کے اور کسی چیز سے محبت نہیں ہو سکتی"۔ شاید جانبداری پر محمول کی جائے لیکن کم از کم اس نظریئے کی پُر زور تائید ضرور ہوتی ہے کہ مشرق بعید کے اس کرومویل کا رویہ نہایت مستحکم اور غیر متزلزل رہا ہے ؛

ٹائمز آف لنڈن

ناگ رانی

(از جناب ڈاکٹر محمد الدین صاحب تاثیر۔ ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی)

چھٹا دن

راجہ نے کہا بھاگیرت پانچ دن ہوگئے مگر مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں، وہ چمکتا ہوا آنسو جو اس کی پلکوں میں اٹک رہا تھا میری قسمت کا ستارا تھا، بھاگیرت میرے سوئے ہوئے نصیب کچھ کچھ جاگ رہے ہیں، مجھے اُداسی کے اندھیرے میں اجالا سا نظر آرہا ہے مگر نہیں، یہ روشنی نہیں دھوکا ہے، مگر چاندنی ہے، سراب ہے، میری آرزوئیں چھلاوا بن کر مجھے نت نئی صورتیں دکھا رہی ہیں، بھٹکا رہی ہیں، مگر یہ تصویر سچی ہے اس کا روپ اصل کو بڑھا کر نہیں دکھاتا، جھوٹ کو سچ نہیں بناتا، یہ تصویر نہ ہوتی تو میں اتنے دن نہ جی سکتا، اور تصویر سے یونہی باتیں کرتے کرتے راجہ نے رات گذار دی، سورج نکلا تو یہ بھی کمرے سے باہر نکلا، دن کی گھڑیاں باغ میں ٹہلتے اور بھاگیرت سے باتیں کرتے کٹ گئیں، سورج ڈوبا تو دونوں دربار میں جا پہنچے، وہاں راجکماری لباس اور جواہر لہو کے رنگ میں رنگے ہوئے پہنے بیٹھی تھی؛

راجہ نے جو آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو اس کا لہو سوکھ کر رہ گیا اور وہ بے سکت ہو کر فرش پر بیٹھ گیا، بھاگیرت آگے بڑھا اور کہنے لگا:-

راجکماری جی ایک راجہ تھا، جس کی تین رانیاں تھیں، ایک سے ایک بڑھ کر روپ میں، سبھاؤ میں، دیکھنے میں، بولنے میں، ہر طرح - چودھویں کی چاندنی میں کوئی دیکھے تو یہ نہ کہہ سکے کہ چاروں میں کون چندرما ہے اور کون رانی - ایک رات جب راجہ اور رانیاں مرمر کی بارہ دری میں سو رہے تھے، راجہ جاگ اُٹھا اور رانیوں کے چاندنی میں چمکتے ہوئے روپ کو گھور گھور کر دیکھنے لگا، اور سوچنے لگا کہ عورت کا روپ کئی سانچوں میں ڈھلا ہوتا ہے، مگر میں نہیں کہہ سکتا کہ ان تینوں میں سے کون زیادہ حسین ہے؟ اور ایک سے دوسری، دوسری سے تیسری پر آنکھیں جما جما کر جانچنے لگا، ایک رانی چت لیٹی ہوئی تھی، اور چاندنی اس کے بدن پر کھل کر برس رہی تھی، ایک کا بازو ماتھے کے اوپر دہرا پڑا تھا اور ایک طرف سے سینہ اُبھرا ہوا تھا، ہر دم ہوا کے جھونکے جالی کی چادر کو اِدھر اُدھر بکھیر دیتے تھے، اور اس کا روپ جھلک جھلک پڑتا تھا - دوسری رانی مرمر کی جالی کے سائے میں لیٹی ہوئی تھی، نور اور سایہ اس کے بدن پر آنکھ مچولی کھیل رہا تھا یا جیسے آبنوس اور ہاتھی دانت کی محرابیں ہم دست و گریباں ہوں، تیسری رانی گھنے سائے میں لیٹی تھی، سر سے پاؤں تک اندھیرے کی چادر میں لپٹی ہوئی، مگر چاند کی ایک کرن اس کے چنبیلی کے پتے سے کان پر پڑ رہی تھی، غرض راجہ تمام رات یونہی گھومتا رہا، کبھی ایک کو گھورتا، کبھی دوسری کو پرکھتا، کبھی تیسری کو جانچتا، رات بھر یونہی سر دھنتا رہا اور جس کسی پر نظر جماتا یہی سمجھتا کہ وہی سب سے زیادہ حسین ہے، آخر وہ ہار تھک کر بیٹھ گیا، ہزار سوچا مگر کوئی فیصلہ نہ کر سکتا، اور اسی اُدھیڑ بُن میں تھا کہ سورج نکل آیا -

صبح کے وقت جب دربار سے پہلے اس کا وزیر بنانیتری اس کے پاس آیا تو اس نے چھوٹتے ہی کہا "مہاراج خیر تو ہے آپ کی آنکھیں لال ہو رہی

ہیں، جیسے رات بھر نیند نہ آئی ہو، راجہ نے کہا۔ نیا آنیتری تم نے سچ کہا
رات یونہی میں نے سوچا کہ میری رانیوں میں سے کون سب سے
زیادہ سندر روپ والی ہے اور اسی سوچ میں رات گذر گئی، ابھی تک
مجھے وہی وچار ہے اور میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا، وزیر نے کہا، مہاراج
آپ کو شانت ہونا چاہئیے کہ آپ کی رانیاں ایسی ہیں کہ ایک سے ایک
بڑھ چڑھ کر ہے، اپنی اپنی جگہ ہر ایک ایسی کہ کسی کو دوسرے کے روپ کا
میلا پا نہیں اور آپ کو کیا چاہئیے، یونہی مفت کا سوچ وچار بیکار رہے،
اور اس نکمی کھوج سے من کی شانتی کا ستیاناس ہوتا ہے۔ لیکن راجہ نے
کہا کچھ بھی ہو میں یہ فیصلہ کر کے رہوں گا ٭

وزیر نے یہ دیکھ کر کہ راجہ راج ہٹ پر اُتر آیا ہے، کہا مہاراج
بڑے بڑے شاہسوار بھی یہی کرتے ہیں کہ پہلے تو گھوڑے کو روکتے تھامتے
ہیں اور اگر وہ زیادہ منہ زور ہو جائے تو پھر لگام ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں اور
خطرے کے مقام پر ادھر اُدھر موڑ دیتے ہیں کہ سوار اور گھوڑے دونوں کا
بچاؤ اسی میں ہوتا ہے، میں تو آپ کا چاکر ہوں، اگر مہاراج کی یہی اچھیا ہے
کہ آپ پتہ لگائیں کہ تینوں رانیوں میں کون زیادہ سندر روپ والی ہے تو بہت اچھا
یونہی سہی، سنئے آپ کے شہر میں ایک بڑا انتر برہمن بچہ آیا ہوا ہے جو عورت کے روپ
جانچ کیلئے دنیا بھر میں مشہور ہے اسے بلوا لیجئے وہ آپ کو بتا دے گا کہ کونسی مہارانی
زیادہ حسین ہیں ٭

یہ سنکر راجہ بہت خوش ہوا اور اُسنے اس حسن کے جوہری کانتی گر ہا کو بلا بھیجا۔
جب برہمن اور راجہ آپس میں باتیں کر رہے تھے تینوں رانیاں راجہ کے حکم سے
اسی کمرے میں سے ہو کر گذریں، جب پہلی رانی گذری تو برہمن بھچکا سا رہ گیا جیسے
زمین میں گڑ گیا ہو۔ جب دوسری رانی گذری تو برہمن لرز سا گیا، اور
جب تیسری گذری تو برہمن کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا، جب سب
چلی گئیں تو راجہ نے کہا۔ اے برہمن بچے اب بتا ان میں سے کون
زیادہ حسین ہے، برہمن نے سوچا کہ اگر میں نے راجہ کو اپنی رائے
بتا دی تو شاید بگڑ جائے کہ اس کی چہیتی رانی کی ہیٹی ہو گئی ہے اور
مجھے قتل کرا دے، ان راجوں مہاراجوں کا کیا ہے۔ اس نے
ادب سے منت کی کہ مجھے ایک دن کی مہلت دی جائے، راجہ
مان گیا اور کانتی گر ہا بھاگم بھاگ گھر پہنچا، تاکہ راتوں رات
شہر سے باہر نکل جائے۔ مگر اسے رہ رہ کر یہ خیال آتا کہ ایک رانی
ضرور ایسی ہے کہ اُسے ایک بار کھینچ کر سینہ سے لگایا جائے اور
جی بھر کر لطف اُٹھایا جائے ٭

مگر نیا آنیتری بڑا اتانترک بوڑھا تھا جو اوروں کے دلوں
میں ہوتا اس کے ناخنوں میں تھا۔ اس نے کہا۔ مہاراج یہ برہمن
بچہ گھبرا گیا ہے اور یہاں سے بھاگنے کی ٹھہرا رہا ہے، مگر میں آپ کو
ایک ترکیب بتاتا ہوں جس سے اس کی اصلی رائے معلوم ہو سکتی ہے
راجہ نے وزیر کا کہا کیا اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ کون زیادہ حسین ہے
تو اس کا اس رانی سے پیار بڑھ گیا، دوسری رانیوں نے جلاپے کے
زور میں اسے زہر دے کر مروا دیا۔ اور راجہ نے ان دونوں کو قتل
کروا دیا۔ اس طرح مفت کی کھوج لگانے سے تینوں رانیاں کھو بیٹھا۔

راجکماری جی بتائیے راجہ نے برہمن کی رائے کس طرح معلوم کی
وزیر کی وہ ترکیب کیا تھی؟ بھاگیرت چپ ہو گیا اور راجکماری
بولی:۔

"راجہ کو کسی چال چلنے کی ضرورت ہی نہ تھی، تیسری رانی
زیادہ حسین تھی، پہلی رانی کے روپ سے برہمن حیران رہ گیا،
دوسری کے روپ سے رعب میں آ گیا۔ مگر تیسری کے روپ نے
اس کے دل پر اثر کیا۔ نیا آنیتری شاید پوری طرح تسلی کرنا چاہتا
تھا، اس لئے اس نے راجہ کو کہا کہ تینوں رانیوں کی طرف سے برہمن کو
ایک ایک خط بھجوائیں جس میں ہر ایک نے مختلف جگہوں پر ایک ہی
وقت پر ملنے کے لئے کہا ہو، کانتی گر ہا کا چلن تو وزیر کو معلوم ہی تھا
ایک وقت میں وہ اپنی من پسند رانی ہی کے پاس جا سکتا تھا وہاں
راجہ کے چاکر موجود تھے، انہوں نے اسے پکڑ لیا، آدمی کے ہردے کا
صحیح حال اس کے چلن ہی سے کھلتا ہے!"

راجکماری نے یہ کہا اور راجہ پر افسوس کی نظر ڈالتی
ہوئی باہر چلی گئی۔ راجہ اور بھاگیرت چپ چاپ واپس
لوٹ آئے ٭

بلیک ہول کی داستان

(از جناب پروفیسر ہمایوں کبیر صاحب - ایم - ایل - اے)

پروفیسر ہمایوں کبیر ایم - ایل اے نے کلکتہ میں بلیک ہول کی یادگار کے متعلق تاریخی حالات بیان کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ بلیک ہول کی الم انگیز تاریخی حیثیت کے مقابلے میں قوی دلائل کی بنا پر اب وقت ہے کہ اس داستان کو فراموش کر دیا جائے اور وہ یادگار جو اس کی یاد کو تازہ کرنے کی علمبردار ہے، عوام کی نظروں سے دور کر دی جائے ؛

پروفیسر کبیر صاحب ایک ممتاز ماہر تعلیم اور پہلے شخص ہیں جو انگلستان میں آکسفورڈ یونین کے سکرٹری بنے - انہوں نے بنگال کونسل میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ بلیک ہول کی یادگار کو یک قلم مٹا دیا جائے چنانچہ اس تجویز کے متعلق کثرت آرا سے یہ فیصلہ ہوا کہ اس ہفتہ جب کونسل کا دوسرا اجلاس منعقد ہو تو اس پر بحث کی جائے ؛

اس یادگار کے متعلق تاریخی کھوج نکالتے ہوئے پروفیسر کبیر صاحب بیان کرتے ہیں، کہ تمام دنیا میں ہزاروں مرد و زن کلکتہ کے نام کو بلیک ہول کے الم انگیز واقعہ سے وابستہ کرتے ہیں اور وثوق سے یہ کہتے ہیں کہ ۲۰ جون ۱۷۵۶ء کو ۱۴۶ یورپین جن میں ایک عورت بھی شامل تھی، ۱۸ فٹ مربع کمرے میں بند کر دیئے گئے اور انہیں سے صبح کو صرف ۲۳ زندہ بچے ؛

وہ لوگ جن کے لئے ہندوستان کا نام سانپوں اور جنگلوں کا مبہم تخیل لئے ہوئے ہے اس کے ساتھ ساتھ اُن ہولناک مظالم کا بھی گہرا اثر رکھتے ہیں جو بنگال کے بے رحم اور ظالم نواب سراج الدولہ نے نہتے یورپین لوگوں پر توڑے - متذکرہ بلیک ہول کے واقعات نے ہندوستان اور ہندوستانیوں کے متعلق اس قدر نفرت اور عداوت کا بیج بویا ہے کہ تخیل کا رہوار وہاں پہنچنے سے قاصر ہے اور اس وقت تک کہ بدنامی کے اس بدنما داغ کو پورے طور پر نہ مٹا دیا جائے اُن لوگوں کو ہندوستانیوں کے متعلق بہتر رویہ اختیار کرنے کی ترغیب دینا شاید ناممکن ہے -

مورخین آج اس بات پر متفق ہیں کہ بلیک ہول کے حق میں دلائل نہایت قوی ہیں، ہول ویل جس نے اس داستان کو وجود دے کر اسے زبان زد خلائق کیا، ایک ایسا شخص تھا جس پر اس کے اپنے دوست بھی اعتبار نہ کر سکتے تھے، یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ وہ خود اُن حالات کے متعلق جو اس نے ابتدا میں پیش کئے مطمئن نہ تھا بلکہ اُن پر حاشیہ آرائی کرتا رہا یہانتک کہ اس کا ناپاک تخیل ان لرزہ خیز واقعات کے بیان کرنے میں اس سے زیادہ پرواز نہ کر سکا ؛

اپنے پہلے واقعہ میں جسے سائیک نے اپنے خط مورخہ ۸ جولائی ۱۷۵۷ء میں بیان کیا ہے - ہول ویل نے وحشیانہ بے رحمی سراج الدولہ کے سر تھوپی ہے، اور زندہ بچنے والوں کی تعداد پچاس بتائی ہے، اس میں اشارتاً بھی یہ ذکر نہیں کہ اس واقعہ سے کسی عورت کا بھی تعلق ہے - ۱۷ جولائی کو ہول ویل سراج الدولہ کے مظالم کو پھر بیان کرتا ہے، لیکن زندہ رہنے والوں کی تعداد صرف ۱۶ بتاتا ہے، لیکن سراج الدولہ کے خلاف یہ الزام اُسوقت بالکل ڈھل جاتا ہے جب

ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہول ویل اپنے خط مورخہ ۳۔ اگست ۱۷۵۶ء میں یہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کا الزام بے بنیاد تھا اور پھر ۲۸ فروری ۱۷۵۷ء میں وہ نہایت ٹھنڈے دل سے اُمی چند کو اس وحشیانہ بے رحمی کا ذمہ دار گردانتا ہے، صرف اس ایک خط میں جو متذکرہ واقعہ کے آٹھ ماہ بعد لکھا گیا، پہلی مرتبہ ایک ایسی عورت کا ذکر ہے جو اس لرزہ خیز و ہولناک واقعہ میں شریک تھی:

ہول ویل کی داستان کو بے بنیاد و پھسپھسا ثابت کرنے کیلئے اور بھی، بہت سے ایسے حقائق ہیں۔ ولندیزوں کے ۵ و ۶ جولائی ۱۷۵۶ء کے واقعات میں حادثہ بلیک ہول کا کوئی ذکر نہیں حالانکہ کلکتہ پر قبضہ حاصل کرنے کے علاوہ بہت سے ایسے واقعات درج ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ولندیزوں کا اس جگہ کے واقعات سے گہرا تعلق تھا۔

۱۷ ستمبر ۱۷۵۶ء کو جب کورٹ آف ڈائرکٹرز کا کلکتہ پر قبضہ ہو گیا۔ تو فورٹ ولیم کی کونسل نے سرکاری کاغذات میں بھی اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں کیا، نہ ہی ۱۷۵۷ء میں کلایو نے کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے بعد جبکہ وہ برسر اقتدار ہونے کی وجہ سے سراج الدولہ سے لکھوا سکتا تھا اس نے عہد نامے میں اس کے متعلق ایک لفظ تک نہیں لکھوایا، اس سے کہیں زیادہ کھلا ثبوت یہ ہے کہ جون ۱۷۵۷ء میں باوجود اس کے کہ مسٹر آفیٹن نے اپنے خط مورخہ ۲۰۔ اپریل ۱۷۵۷ء میں واضح طور پر یہ رائے دی کہ عہد نامے میں حادثہ بلیک ہول کے متعلق ایک فقرہ ضرور ہونا چاہئیے، کلایو نے متذکرہ بلیک ہول کا ذرا بھی ذکر نہیں کیا۔

ایک ہندوستانی مورخ نے اس واقعہ کے خلاف اقلیدس کے ثبوت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ داستان حساب کی رو سے غلط ثابت ہوتی ہے کیونکہ ۱۴۶ آدمیوں کو ۱۸ فٹ مربع جگہ میں بند کرنا جسمانی لحاظ سے ہی ناممکن ہے، نیز اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے کہ ۲۰ جون ۱۷۵۶ء یعنی اس تاریخ کو جب متذکرہ حادثہ پیش آیا ہے، کلکتہ میں مشکل سے ۲۵ یوروپین زندہ تھے۔ ۱۹۔ جون کی صبح کو ڈریک کے بھاگ جانے کے بعد صرف ۱۲۴ یوروپین قلعہ میں باقی تھے۔ جن میں سے پچاس ۱۹ جون کی رات کو نواب کی طرف چلے گئے اور تقریباً ۵۰۔ ۱۹۔ اور ۲۰ جون کی لڑائی میں مارے گئے۔ ہول ویل کے حادثہ بلیک ہول کی ایک فصیح تنقید یہ ہے کہ لفٹیننٹ بلیک جسے ہول ویل نے اسی حادثہ کا شکار ہونا ظاہر کیا ہے ایک بہادر جنگجو تھا جو اپنے برج کی حفاظت کرتا رہا، یہانتک کہ وہ اور اس کے ساتھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔

حادثہ بلیک ہول کی تاریخی حیثیت کے خلاف قوی دلائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اب وقت ہے کہ اس داستان کو خاموشی کی نیند سلا دیا جائے اور وہ یادگار جو اس کی یاد کو تازہ کرتی رہتی ہے، عوام کی نظروں سے دور کر دی جائے، ممکن ہے کسی تاریخی عجائب گھر میں یہ آثار قدیمہ کا کام دے اور یہ بتائے کہ حکومت اور قوم کی اغراض کے لئے تاریخ سے کیونکر کام لیا جاتا ہے۔ لیکن انگریزوں اور ہندوستانیوں میں نفرت پیدا کرنے اور اس بدقسمت شہزادے کے نام پر دھبہ لگانے کے لئے جس کا قصور محض یہ تھا کہ وہ بنگال کا آخری خود مختار حاکم تھا، اسے عوام کی نظروں کے سامنے بالکل نہیں رہنے دینا چاہئیے۔

....

ترکی البم

ترکی البم

ترکی کے متعلق چند بیش قیمت تصاویر

ترکی کے متعلق چند بیش قیمت تصاویر

جمہوریت اور اسلام

(از جناب پروفیسر سید حسین صاحب یونیورسٹی آف ساؤتھ کیلیفورنیا امریکہ)

اسلام کا مفہوم کیا ہے اس کا صحیح طور پر بیان کرنا کچھ آسان نہیں آپ کو عربی کا وہ محاورہ جس کا ترجمہ "خود کو ربانی رضا پر چھوڑ دینا" کیا جاتا ہے یاد ہوگا۔ میں اس تفسیر کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ اس سے آدمی اکثر ناخوشگوار حالات میں بھی "راضی برضا" کی رٹ لگا ہوا ہمتیں چھوڑ دیتا ہے:۔

یہ لفظ "اسلام" کا مفہوم نہیں، اس محاورے کا مطلب فقط "ربانی رضا پر چھوڑ دینا" ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی خوشی، پختگی ارادہ، اور بیدار مغزی کے ساتھ قبولِ وحدانیت، رہبری اور ربانی بھروسہ کو اپنے روزمرہ کے دنیاوی کاروبار میں شاملِ حال سمجھنا ہے:۔

اور جیسا کہ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے خود بھی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، جس مذہب کی آپ نے بنیاد رکھی وہ کوئی نیا مذہب نہیں اور نہ ہی یہ کوئی ایجاد یا دریافت ہے، جسے آپ نے ایک طبعی ایجاد کنندہ کی طرح پایا، بلکہ اسلام وہ حقیقی مذہب ہے جس کا وجود دنیا کی پیدائش کے روزِ اول ہی سے عالم ظہور میں تھا، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر خود سے کچھ منسوب کیا تو وہ محض یہ تھا کہ وہ اُن مجسم روحانیت پاک ہستیوں — خدائے واحد کا پیغام دنیا والوں تک پہنچانے والے سچے واحدہٗ لاشریک خدائے پاک.... فقط ایک ہی خدا کی تابعداری اور بندگی کا سبق دینے والے حضرت ابراہیم رحمتہ اللہ علیہ، حضرت موسےٰ رحمتہ اللہ علیہ، حضرت یسوع رحمتہ اللہ علیہ ایسے تمام پیغمبروں کے جو اُن سے قبل دنیا میں آ چکے ہیں، مستند اور حقیقی جانشین تھے........ اُس پاک لڑی کا ایک بیش قیمت دانہ تھے، اور اُن ہی کے مبارک مشن کی تکمیل کے لئے آئے تھے

اسلام کا ازلی وعدہ پورا ہوا۔ خدائے پاک نے ان کو الہامات سے سرشار کیا جنکو اُنھوں نے (رسول عربی نے) خود دنیا پر واضح کر دیا:۔

مسلمان عملی طور پر حضرت مسیح علیہ السلام حضرت موسےٰ علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان تمام پیغمبروں کی تعظیم کرنا اپنے مذہبی فرائض مقدسہ میں سے ایک سمجھتے ہیں۔ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل دنیا میں آئے اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی مسلمان جب تک ان کے اسم ہائے مبارک کے ساتھ "علیہ السلام" کا اضافہ نہ کر لے، لب کشائی نہیں کرتا۔ چنانچہ مسلمانوں کے نظریہ کے مطابق اسلام کا ظہور ان الہامات (وحی) مقدسہ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئے، اور ان تمام سابقہ مقدس فرمانوں کی تکمیل کے لئے ہوا جو بنی نوع انسان کی رہبری کے لئے وقتاً فوقتاً نازل ہوتے رہے۔ اسلام نجات کا حقیقی راستہ بتاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام میں کوئی ایسی خصوصیت یا خاص وصف بھی ہے، جس سے اسے دنیا کے دیگر بڑے بڑے مذاہب پر فوقیت دی جا سکتی ہے؟

اِس کا جواب اس مذہب کا لاثانی وصف ہے جسے "جمہوریت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور جس کی تعلیم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دی، جس کی مثال سوائے اسلام کے آج بھی کسی مذہب میں نظر نہیں آتی۔

یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ کسی اصول کے بنیادی خیال کا اظہار کرنے کے لئے ان تفسیروں سے کام لینے کی کوشش کی جائے جو پرانی اور بھدی ہو چکی ہیں۔

جمہوریت ایک ایسا لفظ ہے جس کا استعمال زمانہ حال میں نہایت بری طرح اور عام ہو رہا ہے، لیکن جس جمہوریت کا ذکر میں اسلام کے ساتھ وابستہ کر رہا ہوں، اُس سے میرا مطلب ایک حقیقی اور مستند جمہوریت سے ہے، محض خیالی الفاظ سے نہیں بلکہ عملی جمہوریت سے ہے جو نہ صرف طرز

حکومت ہی سے متعلق ہے بلکہ فردِ واحد کی زندگی سے بھی اتنی ہی وابستہ ہے
نہ صرف میرا بلکہ اسلام کا یہ دعوےٰ ہے کہ دنیا بھر کے مذاہب
میں یہی ایک مذہب ہے جس نے عملی طور پر حقیقی جمہوریت کو پیش کیا ہے
اسی نے حقیقی معنوں میں "انسانوں میں برادرانہ تعلقات" کے زرّیں اصول کو
قولاً نہیں، عملاً سوشل طور پر اور بین الاقوامی حیثیت سے اصلیت کا
جامہ پہنایا ہے۔ دنیا کے کسی حصہ میں بھی جہاں مسلمان بستے ہیں چلے جائیے
مراکو سے چین، جنوبی افریقہ سے سائبیریا غرضیکہ کسی جگہ بھی آپ کو نسلی
رنگت یا ذات پات کی الجھنیں مسلمان کو مسلمان سے جدا کرتے نظر نہ آئیں گی
تمام دنیا کے مسلمان خود کو ایک ہی عظیم الشان خاندان کے نونہال
سمجھتے ہیں، کسی قسم کی اجنبیت کا خیال یا ظاہرہ اونچ نیچ کی دیوار انکی
سوشل جماعت یا تعلقات کے رستہ میں حائل نہیں ہوتی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اولیں اور بنیادی بات کی
تلقین کی وہ تھی کہ "خدا ایک ہے" اور مسلمانوں میں جمہوری برادری کا
احساس بھی ان کے خدائے واحد میں یقین کی بنا پر پیدا کیا گیا۔

رسولِ کریم کے پیغام مقدس کا جائزہ لینے کے لئے یہ ضروری ہے
کہ ہم ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی ایام کی طرف متوجہ ہوں، اس
وقت خدا کے واحد ہونے کا یقین اور ایک خدا کی پرستش روئے زمین سے
مفقود ہو چکی تھی، یہودی مت توہم کا شکار ہو چکا تھا، عیسائیت
میں بھی اسقدر قباحتیں پیدا ہو چکی تھیں کہ اس کا اصلی رنگ بالکل
ناقابلِ امتیاز ہو چکا تھا، یہی حالت زرتشتیوں کی تھی جو عرب کے
ہمسایہ تھے، وہ بھی اپنی پاکیزگی کھو کر پستی کی حد تک پہنچ چکے تھے، بت
پرستی تمام دنیا پر اپنا تسلط جما چکی تھی، خود عرب بھی بت پرستی کے پھندے
میں بری طرح پھنس رہا تھا، مذہبی پستی کے ساتھ ساتھ تمام دنیا کے سیاسی
اور تمدنی حالات بھی دگرگوں ہو رہے تھے، دنیا اخلاقی تاریکی سے مجسم
اندھیر ہو رہی تھی۔

یہ تھا دنیا کی تاریخ کا وہ تاریک ترین زمانہ جب حضرت
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی وحدت کا حق پرستانہ ڈنکا بجایا
آپ نے ارشاد فرمایا "خدا۔۔۔۔۔ ابدی و ازلی، خدا۔۔۔۔۔ صرف
وہی ایک خدا ہے"۔ "نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا" وہ لاثانی
ہے، اور اس کا ثانی کوئی نہیں ہو سکتا"۔ اور یہ وہ دعوےٰ ہے جو
مالکِ کون و مکان خدائے دو جہان کے متعلق قرآن شریف میں آیا ہے
یہ اسلام کی بنیادی اور لاثانی خصوصیت ہے جس پر رسولِ کریم نے
زور دیا۔ یہ فرمان نیا نہ تھا، لیکن پرزور تائید ضروری تھی، اور یہ فرمان
دوبارہ تازہ الہام کی صورت میں اسوقت صادر ہوا، جب لوگ
حق پرستی کو بالکل بھول چکے تھے یا گمراہ کئے جا چکے تھے۔

اُسوقت اسی فرمان کی روشنی میں آقائے دوجہاں خدائے پاک کی
واحد ہستی اور اس کی مخلوق، انسانوں۔ اسی کے پیارے بچوں کی بلا
کسی تقسیم و تفریق آپس میں برابر حیثیت کا خیال، اعتقاد کی شکل میں
دلوں کی گہرائیوں میں جا بسا، یہی تھی جمہوریت نو کی ابتدا۔

بنی نوع انسان کی اصلاح کے لئے جو سرگرم کام حضرت محمدؐ
اور اسلام نے کیا یقیناً وہ اس اصول کا استعمال ہے، عین اُسوقت جب
تمام دنیا بے ہنگم توہم کے جال میں پھنسی ہوئی مطلق العنان شاہان
وقت اور نام نہاد روحانی پیشواؤں کے مظالم کا شکار ہو رہی تھی۔
حضرت محمدؐ نے یہ آوازِ حق بلند کی کہ انسان کو سوائے ایک حقیقی اور واحد
خدا کے سامنے سجدہ کرنے کے کسی دوسرے کے آگے ہرگز ہرگز سر
نہ جھکانا چاہئے۔

یہ وہ پیغام تھا جس کے متعلق صرف اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ
اس نے بنی نوع انسان کو تمام بندھنوں سے آزاد کر دیا اور آج اس
پیغام کی آمد کے تقریباً چودہ سو سال بعد بھی تمام اسلامی ممالک میں
بوقت تعظیم کسی حالت یا شکل میں بھی مسلمان کسی دوسرے کے سامنے
سر جھکاتا نظر نہیں آتا، تعظیم کا رسمی طریقہ صرف ایک ہی ہے اور وہ یہ
ہے، "السلام علیکم" (تم پر خدا کی رحمت ہو) اور جواباً بھی "وعلیکم
السلام" (تم پر بھی خدا کی رحمت ہو) ہی کہا جاتا ہے۔ مسلمان کسی انسان کے
سامنے کسی حالت میں بھی سر نہیں جھکاتا، وہ اگر سر جھکاتا ہے تو فقط خدا کے
سامنے۔

اب میں آپ کی توجہ اُن سوشل خوبیوں کی طرف مبذول
کرانا چاہتا ہوں جنکا اس اعتقاد اور اسپر عمل کرنے کی صورت میں
ظہور پذیر ہونا امر لازم ہے یعنی کہ ہر بنی نوع انسان کو ایک ہی خالق کی

مخلوق۔ اور بلا تمیز آپس میں درجہ برابری تسلیم کرتے ہوئے اپنا بھائی سمجھنا۔ اور ایک منتہائے مقصود کو پالنے کے لئے ایک ہی خدا کی پرستش کرنا اور خدائے واحد کو مالک کون ومکاں تسلیم کرنا۔ اس سادہ اصول کے روحانی تاثرات نے مسلم سوسائٹی کے ذرّے ذرّے میں گھر کرتے ہوئے اسے جمہوریت اور روحانیت کی ناممکن التسخیر شکل میں ڈھال دیا۔

آج کل یورپ اور (میں سمجھتا ہوں) امریکہ وغیرہ میں بین الاقوامیت کے قیام اور اس مقصد میں کن ذرائع سے کامیابی ہو سکتی ہے کا علم چرچا ہو رہا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے نزدیک اشتراک بین الاقوام محض تمثیلی یا الفاظی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان میں اس کا زندہ ثبوت موجود ہے۔ اسلامی دنیا کے کسی کونے میں چلے جایئے، دوسرے لفظوں میں کہیں بھی جایئے جہاں آپ کو مسلمان کا وجود مل سکے، آپ کو مسلمان اسلامی ملک میں اسطرح چلتا پھرتا نظر آئے گا، جیسے وہ اپنے ہی گھر میں ہو۔ اسلامی دنیا میں نہ کوئی پردیسی ہے اور نہ ہی کوئی "غیر" ملک ایسی چیز ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح کے انسان تھے؟ کس بلند پایہ انسانی اخلاق کے حامل تھے یہ انسان جنہوں نے نہ صرف ایک مذہب کی بنیاد رکھی بلکہ ایک قوم اور ایک جامع سلطنت بھی قائم کی؟ میں یہاں اس روشن ترین اتفاق کو پیش نظر کروں گا۔

بہت سے مذاہب کے ابتدائی حالات زمانہ سلف کی تاریک تاریخ میں پہنچ کر انتہا درجہ مشکوک صورت اختیار کر چکے ہیں۔ قدیم ترین تاریخ کے دھندلے سائے میں نہ صرف ان کی اصلیت ہی غائب ہو چکی ہے، بلکہ اُن کے بانیان کی ہستی بھی محض افسانوی یا تخیلی معلوم ہوتی ہے

لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اُن کی پیدائش سے لیکر اس لمحہ تک جب آپ نے دعوئے رسالت فرمایا اور اُس کے بعد تک کے تمام معمولی سے معمولی حالات واقعات اور حادثات جو ان سے متعلق تھے، ابھی تک بلا کم و کاست نہایت پاکیزگی کے ساتھ روز روشن کی طرح عیاں ہیں، کوئی بات ایسی نہیں جس پر ذرہ بھر شبہ کی بھی گنجائش ہو سکے، کوئی بات ایسی نہیں جسے "راز" کہا جائے، آپ جس بات کو چاہیں بطور تاریخی واقعہ کے دیکھ سکتے ہیں، اسلام کے بارے میں کوئی بات یا کوئی جزو ایسا نہیں جس کے متعلق گنجائش شبہ ہو سکے یا جسکے متعلق یقین کرنے میں تامل کیا جا سکے۔

اسلام کے تمام اصول روز اول ہی سے معقول ومسلمہ تسلیم کئے جا چکے ہیں، خود رسول کریم کی شخصیت کے متعلق کوئی ایسا عنصر موجود نہیں جو اسے "عجوبہ" ظاہر کرتے ہوئے کسی شبہ کا باعث ہو سکے۔

قرآن کریم کے اُن الفاظ سے جو رسول اللہ کی زبان مبارک سے کہلوائے گئے۔ عیاں ہے کہ وہ بھی "سوائے تم ایسے ایک انسان کے اور کچھ نہیں" تھے انہوں نے کبھی بھی کسی "عجوبہ" کو اپنی ذات سے متعلق نہیں کیا۔ اگر انہوں نے عام انسانوں پر اپنی فوقیت کا اظہار کیا ہے تو محض اتنا کہ وہ تسلیم کرتے تھے کہ خدا نے بنی نوع انسان تک پیغام توحید پہنچانے کے لئے اُن کو منتخب کیا، اور انہوں نے جس خوش اسلوبی سے اپنے فرائض کو سرانجام دیا وہ واقعی ایک عجوبہ نظر آتا ہے جو اُن کی ترجیحی شخصیت کو تسلیم کراتا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اصول پیش کیا وہ یہ تھا کہ خدائے کارساز اور اس کی مخلوق کے درمیان کوئی چیز یا کوئی شخصیت حائل نہیں اور نہ ہو سکتی ہے، اور کہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کہ انسان خدا کی اپنی صورت میں بنایا گیا، بلکہ ہر ایک آدمی میں ایک حصہ رحمانی روح بھی موجود ہے اور یہ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی اس طرح بسر کرے اپنے فرائض کو اس خوش اسلوبی سے انجام دے کہ اُس کی رحمانی روح اُسکو حدنجات تک پہنچانے کے لئے معاون ومددگار ثابت ہو سکے۔

اس طرح تمام مذاہب جو اُس وقت تک دنیا میں موجود تھے ایک ہی امتیازی چوٹ سے تمام پجاری اُنکی پُرفریب رُکاوٹیں خود ساختہ بُرائیاں وغیرہ جو انسان اور اُس کے بنانے والے کی پرستش بنی نوع انسان اور اس کے خدا کے درمیان پیدا کی جا چکی تھیں، روِآب ... کی طرح بہا کر ایک طرف کر دی گئیں اور انسان کو پیشہ ور روحانی مطلب پرستوں کے جنگل اور ناستیکتا (خدا کی ہستی سے منکر) و توہم پرستی کے تاریک ترین غار سے نکال کر اُن کو از سر نو حقیقت کی روشنی میں لا کر راہ حق پر گامزن ہونے کے لئے رہنمائی کی۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، اسلام کا لب لباب یہ ہے کہ "خدا اور

اس کے بندوں کے درمیان اور کوئی شخصیت نہیں"، ایک سچا مسلمان اپنے ایمان اور علم کی روشنی میں سیدھا اپنے خدا تک پہنچتا ہے، اس طرح اسلام دوسرے مذاہب کے طریقوں سے بالکل جداگانہ طور پر پیشہ ور پادریوں دیگر الفاظ میں پجاریوں یا ایسے ہی پیشواؤں کے چنگل سے آزاد انفرادی یا اجتماعی عبادت کا حامی ہے، آج تک اسلام میں کوئی پیشہ ور یا مستقل پجاری تسلیم نہیں کیا جاتا، ایک مسلمان ایسا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے جیسا کہ دوسرا عبادت کے وقت کوئی بھی مسلمان پیشوائی کرسکتا ہے، البتہ عالموں اور پاکیزہ صفت مسلمانوں کو ترجیح ضرور دی جاتی ہے۔

ان عقائد کی تہ میں چند اصول تھے، جن کے بانی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوئے۔ حضرت محمد پر وحی نازل ہونے کے ابتدائی ایام کے مطالعہ کرنے سے حیرت انگیز معلومات حاصل ہوتی ہیں، اس سے انسان کے تصور میں وہ رستہ آجاتا ہے جس رستے سے "ایمان" آیا اور ساتھ ہی اس شخصیت کا خیال آنے لگتا ہے جسکی طرف سے بھیجا گیا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایام تلقین کو اندازاً دو یا تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اکثر دوسرے پیغمبروں کی طرح ابتدا میں آپ کو ان سخت ترین ایذاؤں کے دور سے گزرنا پڑا جو ان دنوں میں بھی عام نہ تھیں، اپنے مشن سے کنارہ کشی کرنے پر مجبور کرنے کے لئے ہر ممکن دباؤ ڈالا گیا اور ہر وہ ایذا جو ممکنات میں ہوسکتی تھی، ان کو پہنچائی گئی، اسکی وجہ یہ تھی کہ مکہ جہاں حضرت محمد صلعم پیدا ہوئے اور جہاں انہوں نے تلقین شروع کی بت پرستوں کا قدیم ترین گڑھ تھا۔

اس کا فتح ہوجانا ان کی یقینی موت کے مترادف تھا، ان کے مفاد کا تقاضا یہی تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کو اٹھتے ہی وہاں دبایا جائے جہاں سے اس کا دوبارہ ابھرنا ناممکن ہوجائے، بلکہ یہاں تک کہ اگر ہوسکے تو ان کی شخصیت ہی کو ختم کردیا جائے۔

ایذا کا زمانہ ایک طویل زمانہ تھا اور اس کی تلخیاں اس قدر ہیں کہ بادی النظر ناقابل اعتبار معلوم ہوتی ہیں، لیکن حضرت محمد صلعم کی ناقابل تسخیر شخصیت کبھی متزلزل نہ ہوئی، ان کے نظریہ میں کوئی فرق نہ آیا، اور ان کا ایمان نہ ڈگمگایا ان کی بلاخوف حق گوئی اور بہ وقت انتہائی مظالم کے زیر ہونے کے ..... اس وقت جب چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا۔ وہ روح جو ان کو باہمت کرتی تھی اس کے متعلق ایک مثال ہی کافی ہوسکتی ہے۔

پشتہا پشت سے قریش، مکہ کے تاریخی بت خانہ کعبہ کے وارث چلے آرہے تھے، اپنے مفاد اور نواہم کے گڑھ کو جوکھم میں دیکھ کر انہوں نے اس کے بچاؤ کی سرتوڑ کوشش کی، آخر کار ان کا ایک سردار حضرت کے چچا کے پاس جو ان کا والی تھا گیا اور کہا کہ "میں آخری مرتبہ تمہیں متنبہ کرنے آیا ہوں، اگر تم نے اس آدمی کو اپنے ہاں سے نکال نہ دیا، اور اس سے ہر طرح کے تعلقات منقطع نہ کئے یا اسے اس نئے اور انوکھے ایمان کی تلقین کرنے سے باز نہ رکھا تو ہمیں مع تمہارے کنبے کے تمہیں ملک بدر کرنا پڑے گا۔

چنانچہ بوڑھے چچا نے اپنے بھتیجے سے یوں کہا۔ "پیالہ تقریباً لبریز ہوچکا ہے، تم اپنے کنبے کو کافی امتحان اور مصائب میں ڈال چکے ہو۔ اور خدا کے واسطے اب اس باب کو یہیں ختم کرو اور دوبارہ اپنے اجداد کی قدیم رسوم کی پیروی کرنا اپنا شیوہ بنالو"

اور جو جواب حضرت نے دیا وہ یہ تھا۔ "وہ مجھے میرے ایمان سے ہٹانے کے لئے میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی کیوں نہ لاکر رکھدیں، پھر بھی میں ایسا نہ کرونگا، جب تک کہ خدا اسے بام کامیابی تک نہیں پہنچادیتا، یا میں اس کے لئے جان نہیں دے دیتا"

یہ تھی وہ سپرٹ جس کے ساتھ اس نے آخر تک اپنے مشن کا آغاز کیا تھا۔

یہ تھی وہ سپرٹ جس کے ساتھ اس نے آخر تک اس کا علم بلند کیا۔

میں آپ کی دور اندیشی اور تحمل کی ایک اور مثال یہاں درج کرونگا۔

ایک دفعہ "آپ" کو آپ کے گھر ہی میں قتل کردینے کی سازش کی گئی چنانچہ مختلف قبیلوں کے سرداروں نے متحدہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہ اس فعل کو مل کر انجام دیں تاکہ بعد ازاں کوئی ایک دوسرے سے اس کا معاوضہ نہ طلب کرسکے۔

"آپ" کو اس سازش کا علم ہو گیا، اور آپ نے اسوقت حضرت ابوبکر علیہ السلام کے ساتھ مکہ کو خیرباد کہکر مدینہ کی طرف چلے جانے کی ٹھان لی۔ آپ کا نہایت تجربہ کار ریگستانی کھوجیوں کی معیت میں زبردست تعاقب کیا گیا، یہاں تک کہ آپ کو اپنے ہمراہی کے ساتھ تین دن تک ایک غار میں چھپ کر رہنا پڑا، مایوسی کی حالت میں حضرت ابوبکر بولے "افسوس۔ ہم صرف دو ہی اس غار میں ہیں"

آپ جھٹ فرمانے لگے" حوصلہ مت چھوڑو خدا غفور الرحیم ہمارے ساتھ ہے"؛

مرحبا۔ اسقدر مصیبت کی حالت کہ جان کے لالے پڑ رہے ہوں اور یہ استقلال، اسقدر قوتِ برداشت، یہ دلیری ہیں یہاں "آپ" کے بلند اخلاق کی ہلکی سی روشنی ایک دوسرے نظریہ کے ساتھ پیشِ قارئین کرونگا؛

میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی پہچان اُس کے ایام گردش کی بجائے اُس کے زمانہ خوشحالی میں بہتر ہوسکتی ہے

مدینہ آئے آٹھ سال گذر چکے تھے۔ مصائب کا زمانہ خواب ہو چکا تھا، تمام عرب قوم آپ کی آوازِ حق پر ایمان لا چکی تھی اور حضرت حقیقی معنوں میں عرب کے افضل ترین سردار، بادشاہ، بلکہ مالک تسلیم کئے جاتے تھے، آپ مکہ، جہاں سے چند سال پیشتر خونخواروں نے دے دے کر نکالے گئے تھے۔ تشریف لے گئے۔ آپ شہر کی حدود میں بحیثیت فاتح شہر کے داخل ہوئے آپ اسوقت ہر ایک کی زندگی و موت کے اختیارات کے مالک تھے، موقع ایک تماشہ کی صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ تمام وہ سردار جو آپ کے قتل کی سازش کے مرتکب تھے، سزا کے خوف سے کانپ رہے تھے۔ سب کے سب آپ کے حضور میں پیش ہوئے، اس تاریخی ملاقات میں جو گفتگو ہوئی وہ اپنی نظیر آپ ہے؛

حضرت نے دریافت فرمایا "تم مجھ سے کس چیز کی امید رکھتے ہو؟"

وہ گڑگڑانے لگے اور چلانے لگے "رحم، او شریف، اور رحم دل بھائی اور بھتیجے رحم۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ سنتے ہی رسول کریم کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے فرمانے لگے "میں اسی طرح آپ سے بولوں گا، جس طرح یوسف اپنے بھائیوں سے بولا۔۔۔۔۔۔۔ میں آج تمہیں کچھ نہیں کہونگا، خدا تمہیں بخشے گا۔ کیونکہ "وہ" رحیم ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ جاؤ تم آزاد ہو"؛

کس قدر فراخ دلی، تحمل اور رحم کا نمونہ ہے حضرت کے انصاف کا ۔۔۔۔ یہ واقع ہے آج سے چودہ سو سال پیشتر کی۔ دنیا کی تواریخ ورق گردانی کیجئے اور بتائیے اس عظیم الشان فیاضی کی مثال کہیں مل سکتی ہے آپکو؟ انصاف سے کہئے دورِ حاضر جیسے تہذیب و تمدن کو چمکتے سورج سے مشابہ کیا جاتا ہے، جسے روشنی کا مینار کہا جاتا ہے جس کے مقابلہ میں گذشتہ زمانہ کو تاریک ترین زمانہ کا نام دیا جاتا ہے، اس زمانہ کے کتنے فاتح ایسے ہیں جو مفتوح دشمنوں کے ساتھ اس ایثار، ہمدردی و فیاضی کا ثبوت دینے کی طاقت کے مالک ہیں، زمانہ حال کے انسانیت اور تہذیب و تمدن کے علمبرداروں میں سے کسی ایک ہی کے متعلق ایسی مثال پیش کیجئے؛

مندرجہ بالا واقعہ اس وقت کا ہے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک فاتح کی حیثیت سے مکہ معظمہ میں تشریف فرما ہوئے، آپ جسوقت سفر آخرت کی تیاریوں میں تھے اُسوقت کا ایک واقعہ بھی سنئے یہ واقعہ آپ کی وفات سے محض چند گھنٹے پیشتر کا ہے۔ تمام "ایمان والے" آپ کے گرد جمع تھے آپ ان کی طرف دیکھ کر فرمانے لگے:-

اگر کوئی ایسا آدمی یہاں موجود ہو جس کے ساتھ میں نے ناانصافی کی ہو، جسے بلا وجہ تادیب کیا ہو، تو اُس کے کوڑوں کی سزا بھگتنے کیلئے میری پیٹھ حاضر ہے اگر میں نے کسی کے چال چلن کو داغدار کیا ہو، موجبِ بدنامی بنا ہوں تو وہ بلا جھجک تمام لوگوں کے سامنے مجھ پر لعنت بھیجے، مجھے بے شرم کہے، اور اگر میں نے کسی کی ملکیت کو اپنے قبضے میں کیا ہو، چھینا ہو۔ غصب کیا ہو تو وہ آئے اور تمام حاضرین کے سامنے اپنی ملکیت کا دعوٰے کرے، مجھ سے طلب کرے"۔

یہ الفاظ اور یہ جذبات اس عظیم الشان ہستی کے تھے جسے تاریخ حاضر کا عظیم ترین انسان کہا جاتا ہے، جس کا تمام عرب مطیع و فرمانبردار تھا، جو دنیا میں یکتا تھا، ہاں اُسی پیغمبر اسلام کے دل کی گہرائیوں کا عکس الفاظ کی صورت میں سطح زبانِ مبارک سے گوش حاضرین ہو رہا تھا۔ جنہیں عالمِ جوانی "میں" معتبر یا دیانتدار کہا گیا اور جنہوں نے

اپنی دیانتداری، خوش اخلاقی، انکساری و فیاضی کو آخری وقت تک جدا نہ ہونے دیا۔

خود وفات پاگئے لیکن اپنے پیچھے ایک لافانی میراث چھوڑ گئے فرمان کے مطابق آج بھی مخلوقِ خدا کا خدائے واحد میں ایمان رکھنے کا پرچم پوری شان کے ساتھ لہرا رہا ہے، بڑے آدمیوں کے اقوال زریں عام انسانوں کے لئے خضرِ راہ ثابت ہوا کرتے ہیں، اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے میں ذیل میں حضرت کی عملی زندگی کا نمونہ اور ان کے چند ارشادات درج کرتا ہوں اور یہ ہے بھی حقیقت کسی بڑے آدمی کی زندگی لمبی چوڑی بحث کے بجائے اس کے اپنے اقوال ہی سے بہتر طور پر روشنی میں آجاتی ہے، چنانچہ حضرت محمد صلعم کا ایک قول ہے!

چار چیزوں پر جہان کی ثبات ہے، عقلمندوں کا علم، بلند مرتبہ اور بڑوں کا انصاف، متقیوں کی دعائیں اور بہادروں کی شجاعت"
اسی طرح انکی ایک اور کہاوت ہے جو مسلم دنیا میں ایک درجۂ امتیاز کی حامل ہے۔ فرمایا ہے۔ "ماں کے قدموں میں بہشت ہے"۔ اور ارشاد ہے:۔
شہیدوں کے خون سے عالموں کی سیاہی زیادہ پاک ہے۔
"علم کی تلاش میں چین تک بھی جاؤ، علم کی تلاش میں گھر چھوڑنیوالا خدا کی قربت کی راہ پر گامزن ہوتا ہے"
اور پھر فرمایا ہے:۔
"جو علم کی تلاش میں سفر کرتا ہے خدا اس کو بہشت کا راستہ دکھاتا ہے"
ایسے تھے اصلاح و توحید کے علمبردار محمدؐ۔ ان کی خوش خلقی ایک ایسا سورج تھی جس کی روح افزا کرنیں ہر دوست و دشمن، ہر امیر و غریب کو یکساں طور پر بلا امتیاز فیض پہنچاتی تھیں۔

انسانی ہمدردی کا مادہ اُن کی نس نس میں بھرا تھا، ستم رسیدہ اور دکھی لوگوں کی خدمت اور اُن سے دلی اظہارِ ہمدردی ان کے نزدیک اپنے معبود (خدا) کی سب سے بڑی عبادت تھی، انہوں نے فرمایا ہے۔
"انسان کا حقیقی سرمایۂ آخرت وہ ہے جو اس نے اس دنیا میں اپنے ہمجنسوں کے ساتھ نیکی و ہمدردی کرنے کی صورت میں جمع کیا ہے"
زکوٰۃ کے متعلق آپ کا ارشاد ہے۔ ہر نیک کام زکوٰۃ، اپنے بھائی سے مروت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ، بنی نوع انسان کو نیکی کی ترغیب کی ترغیب دینا وعظ کرنا، گمراہ کو راہ دکھانا، اندھے کی امداد۔ سڑک سے کنکر، روڑے، خار وغیرہ کی رکاوٹ کو دور کرنا۔ پیاسوں کو پانی پلانا سب زکوٰۃ ہی میں شامل ہیں، یہی افضل ترین دان ہیں۔

مسلم مورخوں کا بیان ہے کہ ابو جریا جو تبصرہ کے باشندہ تھے۔ مدینے آئے اور وہاں حضرت محمد کے ارشادات کے قایل ہو کر اسلام پر ایمان لائے، آپ نے حضرت سے اخلاق کے کسی بڑے قاعدے کے متعلق ارشاد فرمانے کو کہا۔ پیغمبر خدا نے جواباً فرمایا:۔
"کسی کی بدخوئی نہ کرو"

ہمیں اب یہ دیکھنا ہے کہ محمد صلعم نے کیا اور انہوں نے حاصل کیا کیا، وفات سے ایک سال قبل حضرت نے حج کیا تھا، وہاں حضور نے جو ارشادات فرمائے تھے وہ صدیوں سے محفوظ و مقبول چلے آ رہے ہیں، تہذیب و تمدن کی تاریخ سے مس رکھنے والوں کے لئے یہ دستاویز درجۂ بہتری رکھتی ہے۔ میں اس دستاویز کو مکمل صورت میں یہاں درج نہیں کرسکتا تاہم اس کے چند نکات کا بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

حضرت رسول کریم نے اپنے لوگوں کو دیگر بہت سی بینظیر باتوں کے علاوہ ارشاد فرمایا:۔
"تمہاری زندگیاں اور جائدادیں پاک ہیں اور وقت آخر تک ایک دوسرے سے غیر ممکن الفسخ رہیں گی۔
اے لوگو۔ تم کو اپنی بیویوں پر ممکن حق حاصل ہے اور ان کو تم پر ہر ممکن حق حاصل ہے"
"اور تمہارے غلام — دیکھو کہ اُن کو بھی کھانے کے لئے وہی دو۔۔۔ جو تم خود کھاتے ہو اور پہننے کو ایسے ہی کپڑے دو جو تم خود پہنو"

اے لوگو! میرے الفاظ کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو اور ان پر عمل کرو۔ یاد رکھو مسلمان ہر مسلمان کا بھائی ہے، تم میں سے ہر ایک درجۂ برابری رکھتا ہے۔

اسلام نے سیاسیات و تمدن کے لئے جس انقلاب انگیز شاہراہ کی بنیاد رکھی وہ ہے انسانوں کی باہمی برابری، مساوات، اور محض

ایک قانون یا تمثیل نہ تھی بلکہ یہ حقیقت باعمل تھی۔ ذرا جمہوریت اسلام کے زمانہ پر نظر دوڑائیے، آپ کو حقیقتاً ایک مسلمان حبشی غلام کا درجہ بلحاظ انسانیت، مذہبی تعلیم، حقوق و فرائض، شہریت کے حقوق الغرض سب کچھ برابر ہی ملے گا اور لگاتار چودہ سو سال سے آج تک اسلامی دنیا میں اس پر عمل ہو رہا ہے؛

پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد اس کے صحابہ میں سے ایک کو اسلامی سلطنت کا قائد اعظم منتخب کیا گیا۔ اور تقریباً ایکسو سال میں چین اور دور دراز ممالک پر اسلام کا پرچم لہرانے لگا؛

اسلام کی اس قلیل عرصہ میں حیرت انگیز کامیابی واقعی ایک عجوبہ نظر آتی ہے لیکن مسلمانوں کی بے غرضانہ الوالعزمیوں رگوں میں قومیت کا بے پناہ ہیجان اور بے لوث مردانہ وار قربانیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت آسانی سے اس عروج کا ہونا یقینی معلوم ہونے لگتا ہے، مثال کے طور پر حضرت ابوبکرؓ کی راسخ الایمانی و وفاداری، حضرت علیؓ کی پاکیزگی و بے لوث قربانی۔ محض اسلام کی روایتی جائداد نہیں بلکہ انسانیت کے لئے شمع ہدایت کا کام دیتی ہے

حضرت عمرؓ خلیفہ دوئم کے زمانہ میں اسلام کی حدود میں شام، فلسطین، عراق، فارس، مصر وغیرہ بھی شامل ہو چکے تھے۔

حضرت عمرؓ نہ صرف راسخ الاعتقاد مسلمان ہی تھے بلکہ بیک وقت دنیا کی عظیم ترین شخصیت بھی تھے۔ آپ کی ذات باکمال کے متعلق میں یہاں ایک تاریخی واقعہ بیان کرونگا، اس میں سے بھی آپ کو اسلام کے عروج کے راز کی حقیقت نظر آئے گی؛

جب یوروشلم نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنا منظور کر لیا تو انہوں نے ایک عہد نامہ پیش کیا کہ "شہر خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ ہی کی ذات کے حوالے کیا جائے گا"

حضرت عمرؓ اس وقت مدینہ منورہ میں قیام رکھتے تھے چنانچہ آپ اس چھ سو میل لمبے سفر کے لئے اپنے ایک خدمتگار کے ہمراہ چلدیئے آپ مع اپنے سفر کے سامان خورد و نوش، جو، جو، کھجوروں اور پانی کی ایک مشک پر مشتمل تھا ایک اونٹ پر سوار تھے؛

یوروشلم پہنچتے ہی فوجی سپہ سالاروں نے آپ کا استقبال کیا تمام سردار نہایت قیمتی ریشمی لباسوں میں ملبوس نہایت وجیہہ گھوڑوں پر سوار تھے۔ حضرت عمرؓ نے اس ٹھاٹھ باٹھ کو پسند نہ فرمایا اور ان کے ہمراہ چلنے سے انکار کر دیا۔ اور ان کو واپس ہو جانے کے لئے فرمایا۔ اسوقت آپ ارشاد فرماتے ہیں:-

"کیا یہی وہ بندگان خدا .... غلامان رب ہیں جن کو میں نے خدا کے نام پر خدا کی خدمت کے لئے یوروشلم فتح کرنے کے لئے بھیجا تھا"؛

آپ وہاں سے اکیلے ہی سیدھے اسقف یوروشلم کے پاس شہر کا قبضہ لینے کے لئے تشریف لے گئے، اسقف حضرت عمرؓ کے سامنے اطاعت قبول کرنے کا کیوں خواہاں تھا وہ بخوبی ظاہر ہے؛

حضرت نے شہر کا قبضہ لے لیا، لیکن ہوا سرکنے کی آواز پیدا کئے بغیر کسی عیسائی کی زندگی پر آنچ نہ آئی، تمام گرجے اور دیگر عیسائی مقبرے عیسائیوں ہی کے قبضے میں رہے، یہانتک صلیب پاک بھی عیسائیوں ہی کے پاس رہی۔ مسلمانوں نے نہایت فراخ دلی سے عیسائیوں کے تمام مذہبی تبرکات پر بخوشی عیسائیوں کے قبضے کی اجازت دے دی یہ واقعہ ۶۳۶ء کا ہے۔

حضرت عمرؓ کے عہد کا ایک اور واقعہ جو اسلام کی شان کو دوبالا کرتا ہے، اس طرح مرقوم ہے کہ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ ان کے ایک گورنر نے کوفہ میں محل تعمیر کروایا ہے۔ آپ نے جھٹ اُسے منہدم کروانے کا تحریری حکم بھیجا، آپ نے تحریر فرمایا کہ "انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ تم خسروانہ محل تعمیر کرا رہے ہو اور خسروی دروازوں کا بھی استعمال کرو گے؛

کیا تم ان دروازوں پر پہرہ دار اور دربان تعینات کرو گے؟ کیا تم وفاداروں کو دور رکھو گے اور غریبوں سے ملاقات کرنے سے انکار کرو گے؟ اُن کو اپنے پاس کھلے بندوں پھٹکنے نہ دو گے؟

کیا تم اپنے رہبر پیغمبر اسلام کی رسوم کو خیر باد کہتے ہوئے فارسی شہنشاہوں کی طرح شان و شکوہ کی زندگی بسر کرو گے اور ان کی طرح دوزخ سے ہم آغوش ہونے کے لئے قدم اٹھاؤ گے؟

یہ تھا حکم نامہ جو حضرت عمرؓ نے سلطنت اسلامیہ کے ایک گورنر کے نام لکھا تھا جسے پڑھ کر نہ صرف گورنر نے وہ محل ہی گروا دیا بلکہ

دل میں پشیمان بھی ہوا۔

میں سمجھتا ہوں جوں جوں دنیا ترقی پذیر ہوگی، ہمدردی، معلومات، اور باہمی رفاقت وتعظیم علمیت کی بنیادی کڑیوں سے اقوام کو قربت واتحاد کے رشتہ میں جوڑیں گی۔

انسانیت کی اس خدمت اعلےٰ کی تکمیل کے فرائض کی سرانجام دہی کے لئے اسلام اور مسلمانوں کو بہت کچھ کرنا ہے۔ اور مجھے یہ تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ مستقبل قریب میں جو دینی خدمات انکو کرنی ہیں وہ انکے ماضی کی شاندار تصویر ہوگی۔

گو میں اس امر پر کبھی روشنی ڈالنے سے معذور رہا ہوں لیکن اتنا ضرور یاد کراؤنگا کہ یہ اسلام ہی تھا جو نویں صدی سے تیرھویں صدی تک یورپ کی تہذیب کے لئے مشعل راہ کا کام دیتا رہا۔

یورپ کی جمہوری انجمنوں و دیگر حالات کی تحقیق کے بعد میں پورے زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جمہوریت کی اصلیت اور اس پر حقیقی عمل درآمد دیگر جماعتوں کی نسبت اسلام نے زیادہ بہتری کے ساتھ کیا ہے۔

یہ صرف اسلام ہی ہے جو محض لفظی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طرز پر عملاً ذات پات، رنگ ونسل، وطنیت کے تفرقہ افگن جھگڑوں سے پاک ہے، اور بلا مبالغہ یہی ایک رستہ ہے جس کے ذریعہ انسان نجات پاسکتا ہے۔ مکتی پراپت کرسکتا ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے!

"اپنے ہمجنسوں سے پیار کرو، تمام مخلوق خدا سے محبت کرو، اور ان سے ایسا ہی سلوک کرو جو تم خود چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ کیا جائے۔

(مترجمہ۔ مولراج ٹنڈن۔ لاہور)

غلام قوم

(از جناب ضیا صاحب ایم اے فتح آبادی)

وہ قوم جو صدیوں سے ہے پابندِ غلامی
اُس قوم کو اِس صفحۂ ہستی سے مٹا دو

دنیا میں بدلتی نہیں ذہنیتِ انسان
ذہنیتِ محکوم کو پیغامِ قضا دو

بالوں ہی پہ موقوف نہیں قوتِ پرواز
اچھا ہے کہ مرغانِ قفس کو بھی جلا دو

جس شخص کی صورت سے ٹپکتی ہے اسیری
اُس صورتِ منحوس کو مٹی میں ملا دو

آدم الشعراء اردو - ولی گجراتی ثم دکنی کی شاعری

(از جناب مولانا مہر محمد خاں صاحب شہاب مالیر کوٹلوی مقیم بمبئی)

برادر عزیز جناب پروفیسر سید محمد نجیب اشرف صاحب ندوی، ایم اے کے
بے پناہ، پرمحبت اصرار کا نتیجہ ہے کہ میں ہندوستان کے اس شاعر بزرگ کے
متعلق مضمون مستعد ہوا ہوں۔ . . . . جس کا دیوان
آج سے سات روز قبل میں نے پڑھا تو کیا، دیکھا بھی نہیں تھا، ولی کے
متعلق جو سرسری معلومات حاصل تھیں، وہ آب حیات اور اس کے
بعد شائع ہونے والے اردو تذکروں کے قدیم مطالعہ تک محدود تھیں
اور اب بھی جہاں تک ولی کی زندگی اور اس کے تبحر علمی اور ذاتی فضائل
کمالات کا تعلق ہے، میری معلومات وہی ہیں، لیکن اس مضمون کی تحریر کے
وقت جبکہ "دیوان ولی" مرتبہ پروفیسر سید ابراہیم صاحب سیانی۔ ایم۔اے
میرے سامنے ہے۔ میں ولی کو نظم کے لباس میں گویا اپنے سامنے پاتا ہوں
اگر کسی کے پاس وقت اور فرصت ہو تو دیوان ولی کی روشنی میں، اس
شاعر ماہر یا اردو شاعری کے باوا آدم کے متعلق بہت کچھ کہا جا سکتا ہے،
لیکن اس وقت میرا بیان بحیثیت غزل گو شاعر کے ولی کے معنوی کمالات
میں سے چند کی طرف اشارہ اور اس کے بعض معانی کی تفصیل کے
سوا کچھ نہ ہوگا، ظاہر ہے کہ میرے اس مضمون کی حیثیت کسی تحقیق و تدقیق کی
نہیں، ولی کے شاعرانہ رجحانات پر ایک سرسری تبصرہ کی ہوگی؛

ولی کے متعلق آج بڑا سوال یہ ہے کہ وہ دکنی تھے یا گجراتی
میں سمجھتا ہوں کہ وہ گجراتی بھی تھے اور دکنی بھی، اس لئے کہ خود ان کی
دیوانی شہادت یہی ہے۔ ؎

ولی ایران و توران میں ہے مشہور   وطن گو اس کا گجرات و دکن ہے

اس شعر سے یہ تو طے ہو گیا کہ ولی گجرات و دکن دونوں کو اپنا
وطن بتاتے ہیں، مگر دیوان میں گجرات کے مشہور شہر سورت کی تعریف میں
جو کبھی باب مکہ بھی کہلاتا تھا، ستر نہیں بہتر شعر کی مزیدار مثنوی موجود ہے
جس میں سورت کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے، لیکن اس کے برخلاف کوئی
مثنوی یا قصیدہ، یا قطعہ، یا رباعی وغیرہ نظم دکن یا اورنگ آباد دکن کی
تعریف میں مجھے نظر نہ آئی، اس سے ہم بھی سمجھ سکتے ہیں کہ ولی کی پیدائش
گجرات کی تھی، دکن کو . . جوانی میں اپنا وطن بنا لیا تھا۔ اور دکن ہی سے
شاعری کا یہ سورج اُترا پہنچا، اور ولی کے باکمالوں کے سامنے چمکا اور نام آور
ہوا۔ اور آخر گجرات ہی میں آکر ہمیشہ کے لئے مادی آنکھوں سے اوجھل
ہو گیا؛

کسی گجراتی کا دکنی مشہور ہو جانا۔ اچنبھے کی بات نہیں۔ اس لئے
کہ آزاد بلگرامی پیدا تو بلگرام میں ہوئے تھے، مگر ساری عمر بسر کر دی دکن میں
لوگ سید آزاد کو بلگرامی کہتے ہیں اور وہ خود بھی اپنے آپ کو بلگرامی ہی کہتے
تھے۔ تاہم اگر ان کو دکنی بھی کہا جائے تو یہ بھی غلط نہیں ہو سکتا۔

بہرحال ولی گجراتی ہوں یا دکنی، دہلوی ہوں یا اورنگ آبادی
سورتی ہوں یا احمد آبادی، وہ ایسے ہندوستانی شاعر تھے کہ جنہوں نے فارسی
بحور میں فارسی کے متاخرین شعرا کی شاعری حتیٰ کہ فارسی زبان، ہندوستان کی
اس زبان میں جو اس وقت ملک کے علمی طبقہ میں رائج تھی منتقل کی اور اس
شان سے شاعری کے جوہر دکھائے۔ کہ اسیر ہم تو ہم خود ان کو بھی ناز تھا۔
جس کا ثبوت ولی کے محولہ بالا شعر ہی میں موجود ہے کہ

ولی ایران و توران میں ہے مشہور

ولی کی شہرت جس چیز کی بنا پر تھی، وہ یہی انکی ہندوستانی
زبان کی شاعری تھی، ولی کے برخلاف ولی سے بعد کا شاعر غالب اپنی ہندوستانی
زبان کی شاعری کو اپنی ہی فارسی شاعری کے مقابلہ میں ناقابل التفات چیز

خیال کیا کرتا تھا، لیکن غالب کے اردو فارسی دیوان ہمارے سامنے موجود نہیں ہوا یہ کہ ہندوستان میں غالب کی فارسی غیر مقبول ہونے لگی، جیسے اب اقبال کی شاعری بھی مقبول عام نہیں بن سکی، کیونکہ فارسی کے حق میں وہ اسباب باقی نہ رہے، جنکی بنا پر کوئی زبان مقبول ہوا کرتی ہے۔ رہی غالب کی اردو شاعری، واقعہ یہ ہے کہ اس نے غالب کو ملک بھر میں بجوا دیا۔ ولی کے پاس فارسی شاعری نہ تھی بلکہ صرف ریختہ کی شاعری تھی، اسی کی بدولت عالم شعر میں ولی کی ولایت مسلم نہیں ہوئی، اسی میں ان کے کمالات نظر آتے اور اسی کی بدولت وہ ہماری شاعری کے باوا آدم قرار پائے ہیں۔

ولی اگرچہ صوفیا اور متصوفین کے خاندان سے تھے۔ خود بھی صاحب علم ہی نہ تھے۔ صاحب دل بھی تھے اور شاعری خود اپنی ذات میں ایسی فتنہ سامان چیز ہے کہ اس کی طرف رجوع کرنا ہی "گرمیٔ دل" "گدازشِ قلب" کا ثبوت ہوا کرتا ہے، مگر ولی شاعری کے جس دور میں تھے وہ فارسی کے زوال کا دور تھا۔

اسوقت کی فارسی شاعری کی زبان گو فارسی ہی تھی، مگر شعرا کے خیالات الجھ گئے تھے۔ مطالب معما ہو گئے تھے۔ لفظی توڑ جوڑ تناسبات و رعایات اور تراش وخراش ہی کو شاعری کا معراج سمجھا جاتا تھا، اس وقت کے فارسی اشعار کی آوازیں کانوں کو یقیناً بھلی معلوم ہوا کرتی تھیں، کہیں کہیں سننے والوں کے چہروں پر ہلکا سا تبسم بھی آجاتا تھا اور کبھی لفظی شعبدوں پر قہقہہ بھی بلند ہو جاتا تھا۔ مگر دل کی دنیا ان اشعار کو سنکر جوں کی توں بے حس و بے کیف بلکہ سونی رہا کرتی تھی، اس لئے تعجب نہ کرنا چاہئے اگر اسی قسم کی شاعری کا جلوہ جابجا ولی کے دیوان میں بھی نظر آتا ہو۔ جس میں قدم قدم پر رعایات لفظی سے بہت زیادہ کام لیا گیا ہے، مگر پھر بھی دیوان ولی میں خاص خاص مطالب اور روحانی معارف و علمی نکات بکثرت۔۔۔ خوبصورتی سے ادا ہوئے ہیں۔ ہم نے اوپر عرض کیا ہے کہ ولی کے ہاں تناسب لفظی کی بہت کثرت ہے، جس کے ثبوت میں ہر قسم کے ادنےٰ و اعلےٰ بے شمار اشعار پیش ہو سکتے ہیں، مگر اس موقع پر چند پاکیزہ مثالوں کا تذکرہ خالی از لطف نہ ہوگا۔ سے

منہ دکھاوے گا یوسف معنی دل سے گرد دیکھنے کی چاہ کرو
سفر عشق کا اگر ہے خیال ہمتِ دل کو زاد راہ کرو
عاشقو عاشقی کے دعوے پر آہ وزاری کے دو گواہ کرو

ان اشعار میں یوسف وچاہ، سفر عشق کے لئے زاد راہ اور دعوے عشق کے لئے دو گواہ وغیرہ وغیرہ الفاظ سب تناسبات لفظی کا اچھا نمونہ ہیں، اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ولی کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اس نے فارسی کی عالمگیری کے مقابلے میں ایک نوخیز و نومولود زبان کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ولی کی زبان یا اس کے پیرایہ بیان یا اس کی تراکیب نظم میں اردو کے دور ترقی کے شعراء باکمال کی تراش وخراش، گھلاوٹ اور لطافت، سلاست و نزاکت تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بنی آدم کے باوا آدم کے "ورق جنہ" سے مہیا کئے ہوئے لباس میں آج کے ایجاد شدہ پارچات اور مروجہ لباسوں کی خیاطانہ اختراعات کو ڈھونڈھا جائے، اس کے باوجود جیسا کہ آدم اور اس کے متعلقات میں وہ سب کچھ تھا جو بعد میں نسل آدم میں پھلا پھولا۔ بنا اور سنورا۔ اسی طرح اردو کے آدم شاعری کے کلام و بیان میں وہ سب کچھ ہے جو بعد میں ہماری شاعری میں پھلا پھولا۔ اس کے محاسن نے بھی ترقی پائی اور اگر یہ عرض کروں کہ اس کے معائب نے بھی ترقی اور پرورش کی تو مجھے معاف فرمایا جائے، اگر تفحص کیا جائے تو یہ باتیں بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کی جا سکتی ہیں۔

پس ولی کی اولیت کا تقاضا ہے کہ ان کے کلام کو اس نظر سے نہ جانچا جائے جو آج کل کے ماحول نے پیدا کر دی ہے، میرے خیال میں یہ بھی ناانصافی ہوگی۔ کہ ولی کے کلام کا مقابلہ بعد کے منجھے ہوئے اشعار یا ترقی یافتہ شعراء کے کلام سے کیا جائے، کیونکہ ولی نے اپنی راہ نئی زبان کی سنگلاخ زمین کاٹ کر آپ نکالی تھی۔ اور ان کے بعد والوں کو راستہ تیار ملا، خواہ ناہموار ہی تھا، انہوں نے راستہ کی ناہمواریاں دور کیں اور ادر گرد کے جھاڑ جھنکار اور ملبہ کو دور کیا، کوڑا کرکٹ اور کنکر پتھر ہٹا کر راستہ کو ایسا چمکایا کہ راستہ راستہ ہونے کی بجائے اکثر لوگوں کو منزل مقصود ہی نظر آنے لگا۔

ہم پرکھ آئے ہیں کہ ولی کو اپنی ریختہ شاعری پر ناز تھا، اور ہونا بھی چاہئے تھا، کہ ریختہ میں اپنی نظیر وہ آپ ہی تھے، اپنی اسی ریختہ کی شاعری کو ولی نے فارسی شاعری کا ہم پلہ اور فارسی کے بعض شاعروں سے

بڑھ کر قرار دیا۔ مثلاً ؎

تیرے سخن کے نغمۂ رنگیں کو سن ولیؔ   ڈوبا عرق کے بیچ عراقی عراق میں

اگر رعایات لفظی کے استعمال کا کمال دکھانے کے لئے یہ شعر کہا گیا ہو تو بہت مناسب ہے، عراقی کو عراق میں بیٹھے بٹھائے عرق خجالت میں ڈبو یا جائے، ورنہ یہ بڑا دعویٰ ہے اور ہر شاعر کو حق ہے کہ متقدمین یا معاصرین کے مقابلہ میں جس طرح چاہے اعلان کرتا رہے، ورنہ انصاف یہ ہے کہ ولیؔ کو عراقؔ کے شاعرانہ کمالات سے کوئی نسبت نہیں، میرے اس معروضہ کو سمجھنے کے لئے اتنا جاننے کی ضرورت ہے کہ عراقیؔ کون تھا اور اس کی شاعری کا رنگ کیا تھا، تفصیل کی ضرورت نہیں، مختصر یہ ہے کہ مولانا شیخ فخرالدین عراقی حضرت شہاب الدین سہروردی (حضرت سعدیؒ کے پیشوا) کے مرید تھے، جب قلیان میں حضرت مولینا خواجہ بہاؤالدین زکریا ملتانی کے روحانی فیوض و برکات کا غلغلہ بلند ہوا تو آپ ملتان تشریف لائے اور قطب وقت حضرت بہاؤالدین زکریا کے مرید ہوئے، مرشد نے مرید کے تزکیہ نفس یا صفائے باطن کے لئے ایک چلہ تجویز کیا، عراقی تنہائی میں بیٹھے، اس تنہائی میں دس بارہ دن نہیں گزرے تھے کہ قلب صافی پر وجد و کیف کی حالت طاری ہو گئی اور اسی عالم میں بے اختیار کچھ اشعار آپ کی زبان پر جاری ہو گئے، جن میں سے ایک یہ ہے کہ ؎

نخستیں بادہ کاندر جام کردند   ز چشم مست ساقی وام کردند

تفصیل کے لئے عالمگیری عہد کے امیر شیر علی خاں کی کتاب مرآۃ الخیال دیکھو۔

اب ولیؔ کے متعلق بھی اتنا جان لینا چاہئے کہ وہ بھی نہ صرف صوفی شاعر ہی تھے بلکہ سہروردی خاندان میں مولینا شاہ نورالدین سہروردی کے مرید بھی تھے، اس لئے جہانتک تصوف کا تعلق ہے، عراقی اور ولیؔ گویا دونوں ایک ہی سلسلہ میں منسلک تھے، ان دونوں سلسلوں میں "شیخ" یعنی روحانی پیشوا یا محبوب کا جو درجہ ہے۔ وہ مصطلحات صوفیا سے باخبر حضرات سے پوشیدہ نہیں، اس لئے اگر ان دونوں صوفی شعرا میں باوجود بعد زمانی کے مطالب کی یکرنگی پائی جائے، یا کسی خاص بات پر خاص طور پر زور دیا گیا ہو تو اسے ان کے سلسلۂ ارشاد کا اثر و فیض سمجھنا چاہئے۔

ان دونوں باتوں کے جان لینے کے بعد دیکھئے کہ آپ نے ولیؔ کا دعویٰ تو پڑھ لیا۔ کہ میرا کلام اتنا بلند اور اعلےٰ درجہ کا ہے کہ اسے سنکر عراقی عراق میں رہتا ہوا عرقِ انفعال میں ڈوب جائے، یعنی شاعری سے توبہ کرے میں اوپر عراقی کا شعر نقل کر آیا ہوں مگر پھر سنئے عراقی کہتے ہیں۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند   ز چشم مست ساقی وام کردند

عراقی افشردہ انگور یا کسی دیسی یا ولایتی شراب کا تذکرہ نہیں کرتا شعر میں لفظ بادہ استعمال کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ سب سے پہلا بادہ جو بنایا گیا اور بنا کر پینے کے لئے کسی پیالہ میں بھرا گیا۔ وہ بادہ انسانی ہاتھوں سے بھٹیوں میں کشیدہ نہیں کیا گیا۔ بلکہ وہ ساقی ہی کی چشم مست میں بھرا ہوا تھا۔ اور اس خمخانہ سے لے کر پیالہ میں بھرا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ چشم مست ساقی سے بنا ہوا بادہ جس پیالہ میں بھرا گیا ہوگا، وہ جام ہو یا سیم و طلا کا جام اور پیالہ نہ تھا، بلکہ وہ بھی آنکھ ہی کا پیالہ تھا، مطلب یہ ہوا کہ ساقی کی مست آنکھ کی شراب دیکھنے والے کی آنکھ کی راہ سے دل و دماغ میں گئی اور اپنا کام کر گئی ساقی کی آنکھوں سے پی جانے والی شراب نے کیا کیا۔ اس کی تصریح عراقی کے شعر میں نہیں، اور میرے نزدیک یہی اسکی خوبی ہے کہ اس میں تصریح نہیں کیونکہ تصریح کر کے کسی ایک مفہوم کا متعین کر دینا مفہوم کو محدود کرنا ہے اور اب غیر متعین حالت میں شعر آپ کے سامنے ہے اور تاریخ ماضی و حال کے دفتر آپ کے سامنے کھلے ہیں، اس عالم ہست و بود اور کون و فساد کے جس شعبہ پر بھی نظر کریں گے، اکثر اسی شعر کی کرشمہ سامانی آپ کو نظر آئے گی۔

مقدونیہ کے نوجوان اولوالعزم بادشاہ سکندر نے ایران کی قدیم دارالسلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اسے جلوا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ کہتے ہیں کہ بادہ انگور کے نشہ میں اس سے یہ حرکت سرزد ہوئی، مگر میں کہتا ہوں کہ تاریخ کی یہ بھی روایت ہے کہ بادۂ انگور سے زیادہ سکندر کے ساقی کی آنکھ سے بننے والی شراب کا نشہ تھا، جس نے سکندر کو بیخود کر دیا تھا، یہ تو دور کی بات ہے، آج بھی دنیا نے چشم مست ساقی کی سحر کاریوں کا تماشا ایک بڑے انقلاب کی صورت میں دیکھا ہے۔

دنیا کی ایک سب سے بڑی سلطنت کے تاجدار کے سامنے ایک بڑا مسئلہ درپیش ہوا۔ ایک طرف چشم مست ساقی کا خاموش اشارہ تھا اور دوسری طرف قوت و جبروت، جاہ و جلال، شان و شکوہ کا مرقع

پیش نظر تعلقات کے مدبر نے کہا کہ کیا آدمیت کے ایک فرد ضعیف کی خوش نوائی کے لئے یہ سب چیزیں جو سیکڑوں برس کی جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہیں، قربان کردی جاسکتی ہیں۔ جس وقت وہ بادشاہ دل ودماغ کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ خارج البلد نگاہوں سے دور مگر دل کے قریب بیٹھے ہوئے ساقی نے منحنی آواز میں کہا۔ اور اس کا پیغام مختصر برقی لہروں نے مشرق ومغرب میں طرفۃ العین میں دنیا کے بعید ترین گوشوں میں پہنچا دیا، انسانی احتیاط کی دیواروں نے اس پیغام کو ضرور روکنا چاہا ہوگا۔ مگر... بادشاہ نے بھی سن لیا کہ کوئی کہتا ہے کہ "اس معاملہ میں صرف بادشاہ ہی جج ہے" ادھر یہ آواز بلند ہوئی ادھر شاہی فیصلہ اس صورت میں ہوا جو ساقی کے عین منشا کے مطابق تھا۔ فیصلہ یہ تھا کہ سلطنت چھوڑ دی جاسکتی ہے، تخت وتاج ٹھکرا دیا جاسکتا ہے۔ مگر چشم مست ساقی کو آزردہ کرنے کا گناہ نہیں ہوسکتا۔ یا ساقی کے عین حکم کی نافرمانی نہیں ہوسکتی۔ جب دل ایک ہی ہے، تو اس میں دو محبوبوں کی سمائی کیسے ہو، میں محبوبہ سلطنت سے دست برداری کے مترادف ہوگا۔ اس لئے گو ؎

ع گرچہ بدنامیست نزد عاقلاں

لیکن دل کا فیصلہ یہی ہے کہ ع

مانمی خواہیم ننگ ونام را

بادشاہ نے اپنے فیصلہ سے جامی کے اس شعر کو شاعرانہ بلند پروازی سے اٹھا کر زندہ حقیقت بنا دیا کہ ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی — کاندریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

مجھ سے سوال ہوسکتا ہے کہ عراقی کے عارفانہ شعر کی یہ شرح انسان کے دور شباب کے طوفانی عہد کی تصویر تو ہوسکتی ہے، مگر صوفی صافی عراقی کے شعر کو یہ معنی پہنانا شاید اس چلہ کش، زندہ دل، روشن ضمیر، مست الست بزرگوار کی روح کے ساتھ ناانصافی ہو کیونکہ وہ کسی لیلیٰ کی آنکھ کا مخمور نہ تھا، بلکہ اس کا خم خانہ کسی اور ہی محبوب کی چشم مخمور تھی۔

میں بھی آپ سے اتفاق کرونگا، مگر بایں اضافہ کہ اوپر کے شعر میں یہ بھی نکتہ جو میں نے عرض کیا ہے، اور وہ بھی ہے جو عرفان وایمان کی جان کہا جانا چاہیئے۔

یوسف زلیخا کا قصہ اگر مدرسہ وکالج میں جامی کی زبان سے نہ پڑھا ہو تو مجھے یقین ہے کہ ہم میں سے اکثر نے بچپن میں والدین کے اصرار سے یا خود بخود خوشی سے سمجھ کر یا بے سمجھے ضرور تلاوت کیا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ مصری سوسائٹی کے حسن منتخب نے مجموعی طاقت کے ساتھ یوسف صدیق کی متاع ثبات وپاکیزگی کو آزمانا چاہا، ان میں سے ایک سرکش نے اپنی وارفتگی وشیفتگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بھری مجلس میں ماہ کنعان سے قالت اخرج علیھن، فلما رأینہ اکبرنہ وقطعن ایدیھن وقلن حاش للہ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم۔

کہنے والوں نے کہا۔ کہ آپ ذرا ہم پر ہنسی اڑانے والوں کے سامنے تو آجائیے۔ ماہ کنعان ظاہر ہوا، دیکھنے والوں نے دیکھا تو حیران رہ گئے اور بے اختیارانہ ان کی پھل کاٹنے کی چھریاں انہی کے ہاتھوں پر چل گئیں، اور کہا کہ یوسف انہی عناصر سے نہیں بنا جن سے دوسرے آدمی بنے ہیں بلکہ یہ تو کوئی فرشتہ ہے۔

حاضرین کی نگاہوں کو یوسف کی نگاہوں نے بتا دیا کہ ان کا نور اس لعل گداختہ کے سرور کا پرتو نہیں جو انسان کو بیخود کرکے بھلے چنگے انسان کو تاریکی وبے خودی کی طرف لیجایا کرتا ہے، بلکہ یوسف کی چشم پرنور سرور کا نشہ ایسا ہے کہ یوسف کو بہکانے والے بھی پکار اٹھتے کہ......

..........یوسف زمینی نہیں آسمانی ہے، کیا یہ یوسف کا نورانی خم وخمخانہ آنکھوں کا معجزہ نہ تھا، کہ جس سے گناہ کی تاریکیوں سے کالے اور مکدر دل نور ایمان وپاکیزگی کی نورانی شمعوں سے جگمگا اٹھے۔

اور دیکھئے قریشی خطاب کے بیٹے عمرؓ جب تک قریشی رسولؐ سے متنفر تھے، خوفناک دشمن تھے اور اسی دشمنی کے باعث ایکدن ننگی تلوار لے کر چلے تھے کہ آپ کا تن (نعوذ باللہ) سر سے جدا کردیں، لیکن جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ ایک کی آنکھ دوسرے کی آنکھ سے ملی، ساقی بیت الحرم کی چشم مست نے وہ معجز نمائی کی کہ ابن خطاب کی دشمنی سے سونتی ہوئی تلوار بیکار ہوگئی، ساقی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں خدا جانے کیا پلا دیا کہ کل کا بادۂ کفر سے سرشار ابن خطاب آج اسلام، رسول اسلام اور ملت اسلام کے ایسے جان نثار فرد کی صورت میں منتقل ہوگیا کہ اہل تاریخ کے فیصلہ کے مطابق اس کے بعد دنیا نے اس شان کا دوسرا فقیر امیر

اور خاکسار ناجدار جسنے عدالت ۔۔۔ میں اپنے اور غیر کا فرق اٹھادیا ہو۔ پیدا نہیں کیا۔

یہی مطلب ہے کہ جسکو اکبر الہ آبادی نے ان لفظوں میں سمجھایا ہو کہ

نہ کتابوں سے نہ کالج کے اثر سے پیدا   دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس بارے میں ولی بھی کچھ کہتے ہیں، اگر کہتے ہیں ۔۔۔۔۔ تو کیا اور کیسے، کیونکہ مقابلہ رو برو ہوا کرتا ہے، جب تک آنکھ سے آنکھ نہ ملے، میں آپ کے اور آپ میرے دل میں داخل نہیں ہو سکتے۔

اور جانبین کی قوتوں اور رسائیوں کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ عرقِ انفعال کے قطروں کا ماتھے پر جھلکنا یا کسی کا ان میں ڈوب جانا، یہ سب کچھ آنکھوں ہی کی جادوگری ہوتی ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ دو ایک شعر ولی کے بھی اس موضوع پر پیش کئے جائیں۔ تاکہ مقابلہ کا لطف اور اشعار کی بلندی و پستی یا مطالب و معانی کی وسعت و پہنائی واضح ہو جائے وہ بھی صرف اس لئے کہ ولی نے عراقی کو جو اس کا پیش رو تھا اپنے سے کمتر بتایا ہے، ورنہ مقابلہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں بے سود ہوتا۔ خیر سنئے ولی فرماتے ہیں ؎

مستی میں روزِ حشر تک کونین کو بھولا ہے وہ   جو جامِ چشمِ یار سے مے پی کے متوالا ہوا

یا

سجن نے اک نظر دیکھا نگاہِ مست سے جس کو   خراباتِ دو عالم میں سدا ہے وہ خراب اس کا

اگر عراقی کا شعر سامنے نہ ہوتا تو میں ان دونوں شعروں کو ولی کا شاہکار کہتا۔ لیکن عراقی کا شعر دیکھ کر یہ شعر نظروں میں سماتے نہیں، پہلے شعر میں چشمِ یار سے شراب پینے والے کو ایسا متوالا بنایا ہے جو حشر تک دونوں عالم سے غافل ہے، اب یہ بات کہ ایسا غافل کسی کام کا بھی ہے یا نہیں، یا ساقی کے کام کا بھی رہا یا نہیں۔ ولی کا شعر اس پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا، دوسرے شعر میں سجن کی ایک نگاہِ مست کا یہ اثر بتایا ہے کہ وہ جس پر پڑ جائے وہ دونوں عالم کے خرابات میں خراب ہو جاتا ہے، اس میں بھی مطلب وہی ہے جو پہلے شعر کا تھا، مگر آخری شعر میں دونوں عالم کو خرابات کہنا کوئی معنوی خوبی ہو تو ہو لفظی خوبی تو نہیں ہے، اسی طرح ایسے شخص کو "خراب" قرار دینا حسنِ معنی میں کسی قسم کا اضافہ نہیں کرتا، اور عالمِ روحانیات کی طرف ولی کے اس شعر سے کیسے اور کیا اشارا نکالا جائے، ذرا مشکل نظر آتا ہے، میرا خیال ہے کہ عراقی کا یہ شعر ولی ہی نہیں، خدا جانے کیسے کیسے اور کتنے باکمالوں کے دوادین پر بھاری ہے۔

اس بحث کو چھوڑیئے۔ واقعہ یہ ہے جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا کہ ولی نے اپنے دیوان میں ہر قسم کے اعلےٰ خیالات پیش کئے ہیں، جن کو بعد والوں نے ترقی دے کر کچھ سے کچھ بنا دیا۔ اب بعد والے خواہ کتنی ہی بلند پروازیاں کریں اولیت کا شرف ہمیشہ ولی کو ہی حاصل رہے گا، مثلاً ولی کا ایک شعر ہے

اس سوں جو آشنائے درد نہیں   آشنائی نہ کر خدا سوں ڈر

باہمی آشنائی یعنی دوستی کے لئے جانبین کا درد آشنا ہونا، آشنا ہو، ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کوئی بے درد ہی کرے تو کرے، لیکن بے درد دل سے محبت کرنے میں جو دردمندیاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ ان سے متنبہ کرنے کے لئے ولی کا یہ ارشاد کہ "خدا سوں ڈر" بڑے مزے کا وعظ ہے۔ اسی غزل کا دوسرا شعر ملاحظہ کیجئے۔ ؎

بے وفاؤں سے کیا وفا ہو گی   آشنائی نہ کر خدا سوں ڈر

اس شعر کا دوسرا مصرع پہلے آ چکا ہے، اور اس کے پہلے مصرع کا مفہوم بھی گویا شعر اول کے مصرع اول ہی کی تکرار ہے۔

دیکھئے غالب نے سو برس بعد آ کر اس مفہوم کو ولی سے مستعار لیکر کیا سے کیا کر دیا۔ فرماتے ہیں۔ ؎

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

غالب مصرعِ ثانی "وفا کیا ہے" اسقدر وسیع المعنی ٹکڑا ہے کہ اسکی بلاغت کی داد نہیں دی جا سکتی، لیکن بات وہی ہے جو ولی کہہ چکا ہے۔ ولی کی زبان کتنی صاف ہے، آج سے دو سو برس پہلے ولی کا ایسی زبان لکھنا اسکی شاعرانہ ولایت کی کرامت نہیں تو اور کیا ہے۔ ولی نے فرمایا تھا کہ

دلربا کو ہرگز دینا نہیں ہوں دلکو   دلبستگی کہ میری وہ بمثال بس ہے

اس شعر کے مجاز یا حقیقت میں جو بھی معنی لئے جائیں، اعلےٰ درجہ کا مضمون اور سادہ شعر ہے، لیکن یہی مضمون مومن کو کبھی ملا تو انہوں نے اس سیدھی سادی بات کو اچھی خاصی مکتب میں طالبعلموں کی الجھی ہوئی منطق بنا دیا۔ فرماتے ہیں۔

ہر غنچہ رو سے عشق کا اظہار ہے غلط   اس مبحث صحیح کی تکرار ہے غلط

مومن کے "مسجد" صحیح کی تکرار" والے ٹکڑے کی واہ واہ لوٹ لیتے جنھوں نے قدیم مکاتب و مدارس میں بیٹھ کر مسائل منطق و فلسفہ اور نحو میں باہم تکرار کی ہوگی، ورنہ جو سادگی ولی کے ہاں ہے۔ مومن کے ہاں اس کا پتہ بھی نہیں ؛

غنی کاشمیری کے یہ دو شعر ولی کا ایک شعر سمجھنے میں خاص لطف دیں گے۔ غنی فرماتے ہیں:- ؎

پیرہن گل، تن گل عارض گل لب لالہ گل — باغباں صنع بستہ دستہ زیں چار گل
پیکر ساقی سراپا گوئی از گل ساختند — دست گل پا گل بدن گل چہرہ گل رخسار گل

ولی کا شعر یہ ہے کہ ؎

باغ ہے نام اس کے جوبن کا — دل بنا بلبل اس کے گلشن کا

کسی حسین گل اندام کو "باغ" کہدینا اس کو پھول نہیں بنا دیتا، کیونکہ باغ کی دنیا میں پھولوں کے علاوہ کچھ ناگوار چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہنا کہ بلبل باغ میں رہتا ہے، زیادہ صحیح نہیں، کیونکہ بلبل تو صرف پھولوں پر چہکا کرتا ہے، اور نغمہ سرا ہوا کرتا ہے، چنانچہ خزاں کے دنوں میں باغ میں بلبل کا نہیں زاغ و زغن کا دور دورا ہوا کرتا ہے، غنی کے دونوں شعر اپنی اپنی جگہ حسن پیکر انسان کی بہترین اور شگفتہ تصویر ہیں، تماشا یہ ہے کہ وہ پیکر انسانی کو گلدستہ بناتا یا پیکر گل بناتا ہے، جس سے اس کا مقصد شباب حسن یا کمال جمال ہی دکھانا ہے، یہی وجہ ہے کہ اسکو بلبل کا نام لینے کی ضرورت نہیں رہی۔ ظاہر ہے کہ جہاں پھول ہوں گے وہاں بلبل کا نہ ہونا غیر قدرتی بات ہے؛

ولی فرماتے ہیں کہ ؎

گذر ہے اسطرف ہر بوالہوس کا — ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا

یہی خیال بعد والوں کو ملا تو انھوں نے اسے آسمان پر پہنچا دیا۔ ورنہ حسن کو مٹھائی کہنا خود مگس کو دعوت دینا، بھلا جہاں حلوائی کی دوکان ہوگی۔ وہاں مکھیاں نہ ہونگی، تو اور کیا ہوگا، ولی کا مضمون بہت اچھا تھا، لیکن جن لفظوں میں وہ ادا ہوا ہے انھوں نے شعر کا درجہ گھٹا دیا، یوں بوالہوس کو مکھی کہنا برا نہ تھا، مگر اس شعر میں مٹھائی کی دوکان اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ وغیرہ نے آکر کیسے پیارے مضمون کو مکروہ بنا ڈالا۔ یہی مضمون غالب کے ہاتھ آیا تو دیکھو اس معجز بیان نے کیا قیامت برپا کر دی، کہتا ہے:- ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

بندگان ہوس کی لغویتوں سے اہل نظر کی بے آبروئی ہونا۔ کتنا اعلےٰ صحیح شریفانہ اور بلند جذبہ ہے پھر بھی سب کچھ بجا مضمون ولی ہی کا ہے، غالب کا نہیں۔ فرق یہ ہے کہ ولی کا ہیرا کوئلوں میں لودہ پڑا تھا، غالب نے اسے لیا، تراشا، صاف کیا اور نگینہ بنا کر شعر کی انگشتری میں بٹھا دیا۔

ولی کے متعلق جسقدر معلومات حاصل ہیں ان کا خلاصہ یہی ہے کہ وہ صوفی شاعر تھے، اور اپنے عہد میں فن غزلگوئی کے استاد اور پیشوا مانے جاتے تھے، ان کی غزل میں عام مضامین کے علاوہ تصوف کے مضامین بھی بکثرت موجود ہیں، دور گزشتہ میں ایشیائی شاعری اپنی قصیدہ گوئی کی وجہ سے بہت بدنام رہی ہے، کہ اس جھوٹ کے ذریعہ اکثر شعرا نے اپنے ممدوح خاکی اور فانی بندوں کو خداوند اور خدا بنا دیا اور اس دروغ بافی کے ذریعہ اپنا جہنم بھرا، خدا کا شکر ہے کہ ولی نے جہاں اپنے خرقۂ تصوف کو خرقۂ سالوس نہیں بنایا، وہاں اس نے اپنی شاعری کو گداگری کا کشکول بھی نہیں ٹھیرایا ؛

تصوف اور شاعری جہاں دونوں مل جاتے ہیں وہاں مخلوق سے بے نیازی اور حق کے بل پر اپنی ذات پر ایک خاص اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی سچا صوفی اور اصلی شاعر محبوب کے سودا میں دین و دنیا میں اپنے آپ کو کسی سے کمتر نہیں سمجھتا، وہ اپنی بے سامانی اور ظاہری بے بسی اپنی بے دست و پائی اور افلاس کو، اپنی کس مپرسی اور تنہائی کو، اپنی گدڑی اور بے بال و پری اور شکستہ احوال کو دنیا کے کسی بھی جاہ و جلال اور ساز و سامان سے دبا ہوا نہیں دیکھتا۔ خواجہ حافظ فرماتے ہیں۔ ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں — کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

اگر حافظ کے "میکدہ" کو عرفان ہی کا میکدہ تسلیم کر لیا جائے تو اس میکدۂ عرفاں کی گداگری کا حافظ صاحب یہ معجزہ بتاتے ہیں کہ وہاں کا گدا عالم عیش و مستی میں آسمان پر چشمک زنی کرتا اور ستاروں پر حکم لگاتا چلا جاتا ہے۔ اسی کیفیت سے ظاہر ہے کہ گدائے میکدہ کی یہ کیفیت دائمی نہیں وقتی ہوتی ہے، ورنہ وقت عیش و مستی کی شرط نہ لگائی جاتی ؛

عارف شیراز حافظ ہی نے دوسری جگہ فرمایا ہے کہ ؎

اے دل تو جام جم بطلب ملک جم مخواہ　　لیکن بود قول بلبل بستان سرائے جم

جمشید کا جاہ و جلال اور ملک جمشید کی نشہ آفرینی دیکھ کر کسی کے دل میں یہ آرزو پیدا ہو جاتا کہ کاش ہمیں بھی یہ چیز مل جاتی، قدرتی بات ہے، مگر بڑی اور کام کی بات نہیں، اس لئے کہ تخت جمشید کو ویرآ اور خود جمشید کو دشت و جبل میں صورت دیوانہ مارا مارا پھرتے دیکھ کر اجڑی ہوئی بستان سرائے جمشیدی کی ماتم دار بلبل نے کہا۔ کہ میاں ہوش میں آؤ، کس چیز کے پیچھے دیوانے ہوئے ہو۔ ملک جمشیدی کی شان وشوکت فنا پذیر ہے، اور لینے کی چیز فانی چیز نہیں ہوا کرتی، اگر طلب صادق رکھتے تو ملک جم نہیں جام جم، یعنی روشن ضمیری معطی رازق سے طلب کرو، اگر یہ نعمت مل جائے تو پھر ملکِ جم جو کائنات ہستی کا ایک ذرہ ہے، کیا چیز ہے زمین و آسمان کو اپنا غلام پاؤگے۔

میرے اس بیان پر حافظ کی اسی غزل کا آخری شعر گواہ ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

بشنو ز جام بادہ کہ ایں زال نو عروس　　بسیار کشت شوہر چوں کیقباد و جم

اپنی زبان کی شاعری کی طرف دیکھئے، جس زبان میں ولی شاعری کے باوا آدم ہیں، اسی زبان میں خواجہ حیدر علی آتش لکھنوی قلندرانہ وضع کے ایک سچے شاعر ہو گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی بے سامانی اور سیر چشمی کے تذکرے میں بتایا ہے کہ دنیا والوں کی لڑائیاں اور باہمی تحاسد و تباغض، انکی زیادہ بھلی اور ملک و مال میں تکاثر اور حب جاہ تقرب شاہ کے لئے ہوا کرتا ہے، لیکن ہم فقیروں کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں، پھر کیا دنیا دیوانی ہے کہ ہم سے مخالفت کرے گی۔ اور ہم بھی دنیا سے ڈریں تو کیوں۔ ؎

طبل و علم ہے پاس ہمارے نہ ملک و جاہ　　کہ ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

اس شعر میں جہاں اہل دنیا کو بلا وجہ دشمنی کرنے پر متنبہ کیا ہے، وہاں ان چیزوں کے فقدان پر پوشیدہ حسرت بھی پائی جاتی ہے لیکن ولی نے جو کچھ اس بارے میں کہا ہے، اس سے انکی ولایت تسلیم و رضا ۔۔۔۔ تسلیم کرنا پڑتی ہے، ولی نے اصول یہ بتایا ہے کہ بادۂ انگور نہیں بلکہ بادۂ نور جب جام بلور میں نہیں، قلب مستور میں بھر دیا جائے تو پھر کسی جم و کیقباد کی کوئی رعناک فرعونی حیثیت ہماری نگاہوں میں نہیں رہا کرتی بلکہ یہ نعمت جسے میسر ہو جائے وہ خود کو جمشید وغیرہ سے بڑا سمجھتا ہے اور اگر غور کیا جائے تو ہوتا بھی ہے، فرمایا ؎

جم کے رتبہ سے "ولی" مرتبہ بالا ہو اگر　　"جام دل" میں جو میسر ہوئے ناب مجھے

یہ اصول سب کے لئے تھا، یا ولی کی خواہش صرف اپنے لئے تھی، کہ اگر ایسا ہو جائے تو میں کیا سے کیا نہ بن جاؤں، کچھ بھی ہو معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی یہ آرزو بر آئی اور اس نے اعلان کردیا کہ مجھے یہ رتبہ بھی حاصل ہے ؎

پایا ہوں ولی سلطنت ملک قناعت　　اب تخت و چتر حق ہیں سر ارض و سما ہے

اس شعر میں لفظ چتر غیر صحیح منظوم ہونے پر نہ جائیے، بلکہ دیکھئے کہ ولی نے بات کیا کہی ہے، فرمایا ہے کہ مجھے ملک قناعت کی سلطنت اور فرماں روائی حاصل ہے، اگر میرا تخت و چتر شاہی دیکھنا ہو تو دیکھو وہ لاجوردی شامیانہ یعنی آسمان میرا چتر شاہی ہے اور یہ زمین کا خاکی فرش جس پر میں جلوس فرما رہا ہوں۔ میرا شاہانہ تخت ہے، یہ تخت خاکی عاجی نہیں جس پر بیٹھ کر مصری فرعون نے خدائی کا دعویٰ کیا، لیکن دریا کی موجوں کے تھپیڑوں سے بھی اپنے آپ کو نہ بچا سکا، ولی میں نہ کسی چیز کے لئے حرص ہے نہ کسی شاہی سامان سے مرعوبیت بلکہ خود کو جو کچھ بھی لا حاصل ہے۔ حاصل ہے۔ اسپر بجا ناز و افتخار پایا جاتا ہے، یہ ولی کا قول تھا۔ عمل یہ ہے کہ اس کا دیوان قصائد سے خالی ہے اور اس کے حالات میں ہر قسم کی دربارداری یا وظیفہ یابی کے لئے دعا گوئی کا تذکرہ غائب۔

وہ کونسا عالم ہے جہاں حسن نہیں؟ شاعر کا کمال یہی ہے کہ وہ حسن عالم کی مصوری لفظوں میں اور حسن کی عالمگیری کے محاسن ذرّے ذرّے میں دکھاتا اور ہر چیز جلوۂ حسن کی جھلک پاتا اور اپنے اشعار میں اس حسن کے جلووں کو آشکارا کیا کرتا ہے۔

چڑیوں کا چہکنا۔ کبوتر کی منموہنی پرواز اور شہباز کی ہوائی ترکتاز بلبل کے نغمے، قمری کی کوکو، فاختہ کی یاہو، کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک غنچوں کا چٹکنا، شبنم کے موتیوں کا دمکنا، پھولوں کا پھولنا۔

Reference ؎۱

حافظ گر بہا عمر باشد باز بر تخت چمن　　چتر گل بر سر کشی اے مرغ خوشخواں غم مخور

درختوں کا پھلنا، کلیوں کا کھلنا اور مسکرانا، پتوں کا خوشی میں آنا اور تالیاں بجانا، شاخوں کا جوش شباب میں جھومنا، ہم آغوش ہونا، اور باہم گلے ملنا، آبشاروں میں بلندیوں سے پانی کا گرنا، اور گرتے ہی رقص کرنا، دریا سے متواتر موجوں کا اٹھنا، اور والہانہ شان سے کناروں سے سر ٹکرانا اور پائے ساحل پر جبیں سائی کرنا، صبح کے وقت سورج کا مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ اپنے شبینہ بستر راحت سے سر اٹھانا اور آنکھ کھولتے ہی غافل سونے والوں کو گدگدا کر جگانا، اور دوپہر کے وقت آپ ہی آپ بے اختیارانہ ہنسنا اور تاؤ میں آنا، آنکھیں دکھانا، اور آگ برسانا خود تپنا اور آپ ہی ہنس کر دوسروں کو جلانا، پھر دن بھر کی چھیڑ چھاڑ سے شام کو تھک تھکا کر اپنی شرارتوں پر شرماتے ہوئے مغرب کے نقاب میں منہ چھپانا، پہلی کے چاند کا آسمانی چلمن سے رکتے رکتے کچھ یونہی سی رونمائی کرنا، پھر آہستہ آہستہ بے حجاب ہو کر قرص نور بن جانا اور بھری محفل میں بے حجابانہ ماہ نیم بن کر آجانا، تاروں کا چاند کی یہ بے حجابی دیکھ کر شرمانا۔ اور فضائے بسیط میں گم ہو جانا، شب تاریک میں کھلے آسمان پر جھلملانا بلکہ کھل کھیلنا، بادلوں اور چاند کی دوڑ میں دو کھلنڈرے بے پرواؤں کی آنکھ مچولی کا منظر، آسمان کی آسمان جاہی، زمین کی خاکساری و افتادگی پہاڑوں کی سرکشی، فضاؤں کا سکوت، غاروں کی تاریکی، سمندر کی گہرائی موج زنی، بجلی کی چمک، بادل کی گرج، ہنگام رقص موروں کے پروں کی جھنکار اور مردان نبرد آزما کی للکار، حسینوں اور جامہ زیبوں کا حسن رفتار اور جامہ زیبی، اور ہنگام نقل عالم فریبی، پیکر انسانی کی شعبدہ کاری اور تکلم .... کی مسیحائی۔ ملاحت کی نمک پاشیاں اور صباحت کی گلو سوزیاں، قدرعنا کی غمازیاں اور عہد پیری میں کمر کی قوسی شان وغیرہ وغیرہ چیزوں میں سے کون سی چیز ہے، جن میں حسن نہیں، اور کونسی ادا ہے جس میں حسن نہیں یہی حقیقت ہے جسے ولی نے ذیل کے شعر میں سمجھایا ہے۔ ؎

گل و بلبل کا گرم ہے بازار — اس چمن میں جدھر نگاہ کرو

حدیث قدسی میں جو صوفیا کے ہاں مسلم ہے بتایا گیا ہے کہ حسن مطلق نے کہا کہ میں چھپا ہوا خزانہ تھا۔ نہ مجھے کوئی جانتا تھا، نہ چاہتا تھا، میں نے ظاہر ہونا چاہا۔ تو مخلوق کو پیدا کیا، کہ پردے سے باہر آؤں، اور پہچانا جاؤں، چاہا جاؤں، اس سے ثابت ہے کہ مخلوق کی پیدائش محبت کا نتیجہ ہے جن کا تقاضا ہے کہ عشق بھی ہو۔ اس لئے گویا حسن نے عشق کو پیدا کیا، کیونکہ اگر حسن کا کوئی چاہنے والا نہ ہو۔ تو حسن کا حسن نگاہ ستائش سے منور ہی رہتا ہے، اسی خیال کو ولی نے اپنے ایک شعر میں اس طرح ادا کیا ہے۔ ؎

حسن تھا پردہ تجرید میں سب سے آزاد — طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ

یہیں حسن کے ستائش گروں کی کئی جماعتیں ہو گئیں۔ ایک وہ ہیں جنہوں نے غیر محسوس کو محسوس سمجھ کر ہر پیکر محسوس کو سجدہ کر دیا، اور اسی کو حسن کا کمال سمجھا اور اسی میں اپنی عبودیت کا جمال مشاہدہ کیا، ایک وہ ہیں کہ معبود و محبوب میں فرق کرتے ہیں، ان کے نزدیک ہر محبوب معبود نہیں ہوتا برخلاف اس کے معبود محبوب بھی ہوتا ہے، اور وہ ایک ہی ہے جنہوں نے محسوس محبوب کو معبود سمجھا، وہ ادھر ہی سجدہ میں گر کر رہ گئے، اور انہوں نے ایک کی بجائے ہزاروں معبود بنا کر حقیقی یا اصلی محبوب سے بیگانگی اختیار کر لی۔ اور جنہوں نے اپنے محبوب کو مظاہر حسن میں سے کسی ایک یا بہت سی اداؤں کا مظہر سمجھ کر معبود اصلی کی ایک شان ظاہر کرنے والا خیال کیا۔ انہوں نے راستہ کی درازی یا ادھر ادھر کی دلکشیوں سے نہ ہمت ہاری نہ حیرت ظاہر کی، وہ قدم بڑھاتے چلے گئے اور ہر مرحلہ پر انکی زبان پر یہی نعرہ رہا کہ ؎

ہمتم بدرقہ راہ کن اے طائر قدس — کہ دراز است رہ مقصد من نوسفرم

اور ہر دلکش حیرتناک منظر بزبان غالب یہی کہا۔ کہ ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود — قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ولی مظاہر حسن جابجا دیکھتا ہے، لیکن اپنے معبود کو پھر بھی چمن زار عناصر میں مقید و محدود نہیں پاتا، اس لئے کہ اسے قید میں آنا گوارا نہیں۔ کیونکہ غیر محدود کا محدود ہو جانا کمال نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اپنی نارسائی اور اس کی شان رفیع و مقدس کا خیال کر کے درخواست کرتا ہے کہ ؎

ناز دیتا نہیں گر رخصت گلگشت چمن — اے چمن زار حیا دل کے گلستان میں آ

شاید حسن مطلق اور اس کی طلب، اس کی محبوبیت و معبودیت کے انہی مظاہر و مراحل سے متاثر ہو کر کسی زمانہ میں راقم نے کہا تھا کہ ؎

میں فدائے حسن مطلق میں نثار حسن خوباں — میں شکار تیر جاناں جو چھپا نہیں کماں سے

اسے ڈھونڈتا ہوں جسکو طور ڈھونڈتے تھے — اسے جستجو میں آیا ہوں مکاں لامکاں سے

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ولی کا درجہ بلحاظ اولیت کے اردو شاعری میں سب سے بلند ہے، اس کے دیوان میں ہر قسم کے مضامین موجود ہیں ان میں تصوف کے نکات ہیں، علمی مصطلحات کا جا بجا تذکرہ ہے، استعارات تشبیہات کی بہتات ہے، ولی کی اولیت کو دیکھتے ہوئے اسکی لسانی اختراعات معجزہ معلوم ہوتی ہیں، دیوان میں کثیر تعداد ایسے اشعار کی ہے کہ اگر ان کو پڑھا جائے تو کوئی شخص زبان کے لحاظ سے آج کے فصحا اور ولی کی زبان میں کوئی فرق نہ پائے گا۔ فارسی سیکھنے کے لئے بھی دل کی زبان کام آ سکتی ہے، کہ فارسی محاورات کثرت سے ولی نے ترجمہ کرکے منظوم کئے ہیں، ولی کے دیوان کا اگر انتخاب کیا جائے تو مذاق حال کے لحاظ سے اس میں ستر شعر سے اور زید و بکر کے سَو سَو شعر سے کہیں زیادہ اشعار قابل انتخاب موجود ہیں۔

گو ولی کو اپنی شاعرانہ رفعت کا احساس کیا یقین تھا، اور وہ اپنے ہر شعر نادر تحفہ خیال فرماتے تھے، لیکن شخصی اور روحانی حیثیت سے بھی وہ اپنے آپ کو عام شاعروں سے الگ اور ممتاز اور اہل کی مجلس کا رکن رکین سمجھ کر اپنے مخاطبوں سے فرمایا کرتے تھے کہ سے

نہیں بلبل وہ ہر گل کی کلی کا غنیمت بوجھ ملنے کو ولی کا

نگاہ پاکباز اں کیمیا ہے

اگر ولی سے ملوگے تو خود بھی اکسیر بن جاؤ گے۔

حضرات! ولی غزل کا شاعر تھا۔ اس لئے مجھے معذور تصور فرمائیے کہ میں نے اس کی غزل گوئی کے سلسلہ میں مطالب غزل میں سے بعض کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ مضمون دلکش تھا۔ قلم آزاد، اور صفحہ قرطاس وسیع، بہر حال اب اس سے زیادہ حاضرین کے صبر و شکیبائی کا امتحان مجھے منظور نہیں۔

....

مہر محمد خاں شہاب

کون کرے

(از جناب ضیا صاحب ایم اے۔ فتح آبادی)

عشق کو کامگار کون کرے
حسن کو شرمسار کون کرے

زندگی ہے بذاتِ خود اک موت
موت کا انتظار کون کرے

کس کو انجام کار کی ہے خبر
فکر انجام کار کون کرے

کون پامالِ روزگار نہیں
شکوۂ روزگار کون کرے

زیست کا اعتبار کوئی نہیں
زیست کا اعتبار کون کرے

باعثِ آمدِ خزاں ہے بہار
آرزوئے بہار کون کرے

میں ضیا ہوں حدود ہوش سے دور
اب مجھے ہوشیار کون کرے

افسانہ کی تشکیل

(از جناب مولینا امداد صابری صاحب)

تشکیل افسانہ تعمیر کی جزئیات متعین کرنے کا نام ہے، افسانہ کے حسن اور پختگی کا جتنا دارومدار پلاٹ کی عمدگی پہ ہے اتنا ہی تشکیل کی خوبی پر بھی ہے جس طرح پلاٹ میں معمولی سی خامی رہ جانے پر تمام افسانہ خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تشکیل میں نقص باقی رہ جائے تو افسانہ کے اجزا کے تناسب اور رآہنگ کے وقار میں فرق آجاتا ہے، خاکہ تیار کرنا اگر ایک فن ہیل ہے تو خاکے میں جزئیات کی جگہ متعین کرنے کا دوسرا نام ہے، اس میں افسانہ کی جزوی باتوں کی طرف توجہ دی جاتی ہے، موسم، کمرے کے دروازہ، کھڑکیاں وغیرہ بہت ہی معمولی چیزیں تشکیل کے وقت زیر غور آتی ہیں، تشکیل کو لمس آخر یا عمل جلا سمجھنا درست نہیں، بلکہ لکھنے سے قبل افسانے کے پلاٹ میں جن معمولی معمولی باتوں کو داخل کرنا ضروری ہوتا ہے، ان کے تعین کو تشکیل کہا جاتا ہے۔ ہر جزوی بات کے وجود کے جواز میں وجہ ڈھونڈی جاتی ہے، ہر فقرے، ہر حادثے یا وقوع، ہر کردار، ہر بیان، ہر قول، کے متعلق یہ دیکھا جاتا ہے، کہ آیا وہ وحدت تاثر سے ہم آہنگ ہے؟ اور آیا اس کو وہ مناسب جگہ مل گئی ہے یا نہیں جہاں وہ زیادہ سے زیادہ موثر ثابت ہوگا، اجزا اس طرح ملائے جاتے ہیں کہ افسانے کی عمارت میں بھدا پن پیدا نہیں ہونے پاتا۔ ہر جزو اتنا ضروری اور برمحل معلوم ہونے لگتا ہے کہ اگر اسے اس کی جگہ سے ہٹا لیا جائے تو افسانے میں کسی بات کی کمی نظر آنے لگے تشکیل میں معاون واقعات کے تاثر کا خیال رکھا جاتا ہے، کرداروں کی مناسبت افسانے کے اجزا کے تناسب واقعات کے مناسب و مدارج اور "زاویہ بیان" سب کا خیال کرنا پڑتا ہے

عمل تشکیل کے دوران میں افسانہ نگار کو یہ امر ہر وقت اپنے سامنے رکھنا پڑتا ہے، کہ افسانہ کا مقصد اعلیٰ کم سے کم ذرائع سے واحد تاثیر پیدا کرنا ہے"، اس اصول کے پیش نظر وہ ہر اس جزوی چیز کو جو پلاٹ میں شامل کی جاتی ہے، پہلے خوب اچھی طرح بنظر امتحان دیکھتا ہے کہ آیا یہ افسانے کے لئے ضروری ہے یا نہیں؟ یا اس سے افسانے میں کوئی حقیقی اضافہ ہوتا ہے یا نہیں؟ اور آیا یہ اس جگہ کے لئے بالکل مناسب رہے گا یا نہیں جو اس کے واسطے افسانے کے پلاٹ میں نکالی گئی ہے۔

ہم نے اوپر "کم سے کم ذرائع" کی ترکیب استعمال کی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ افسانہ نگار افسانے میں کم سے کم ضروری کردار رکھے، کم سے کم ضروری واقعات دکھلائے، اور کم سے کم وقت اور زیادہ سے زیادہ محدود جگہ میں افسانہ تیار کردے، اگر دو کرداروں سے کام چل سکتا ہے، تو تین کردار استعمال کرنا بے ضرورت ہے، اگر تاثر کی تخلیق کیلئے صرف ایک وقوعہ درکار ہے تو افسانہ نگار کو ایک ہی وقوعے تک رہنا چاہئے، اگر ایک ہی مقام پر افسانہ تمام ہو سکتا ہے تو اسے کئی مقامات پر پھیلانے کی کوئی ضرورت نہیں، مگر حالات کردار، واقعات وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ کفایت شعاری برتتے وقت ایک بات فراموش نہیں ہونی چاہئے، وہ بات یہ ہے کہ افسانہ کی غایت زیادہ سے زیادہ موثر طریق پر پڑھنے والے کے ذہن نشین ہو جانی چاہئے اگر تاثیر کے حصول کے لئے کفایت شعاری سے دستبردار ہونا پڑے تو افسانہ نگار کو چاہئے کہ بے تکلف اس سے دستکش ہو جائے تشکیل کے معاملے میں ایک بڑا اہم اور حل طلب مسئلہ افسانہ نگار کے سامنے یہ ہوتا ہے کہ حصول تاثیر اور کفایت ذرائع کے درمیان توازن کیونکر قایم کیا جائے

ہر افسانے میں چند کردار ایسے ضرور ہوتے ہیں، جو پلاٹ کی حرکت کیلئے ضروری نہیں ہوتے مگر تشکیل کے لئے ضروری عناصر کا حکم رکھتے ہیں انہیں معاون کردار کہتے ہیں، کیونکہ ان سے پلاٹ کو نشو ونما دے کر افسانہ کو

تکمیل تک پہنچانے میں مدد ملتی ہے، اکثر انہیں تقابل کی غرض سے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ مرکزی کردار کی بعض اچھی یا بری خصوصیات اور بھی اجاگر ہوجائیں +

اگر مرکزی کردار غیر معمولی کیرکٹر کا مالک ہوتا ہے تو امدادی کردار عام رجحانات کے حامل دکھائے جاتے ہیں تاکہ مرکزی کردار کی غیر معمولیت اور بھی زیادہ نمایاں نظر آئے، اگر مرکزی کردار کے کیرکٹر میں بدخصالی زیادہ ہوتی ہے تو اس کے مقابل نیک امدادی کردار رکھکر اس کی طینت کی خرابی کو اور بھی چمکا دیا جاتا ہے۔

بعض اوقات ایک کردار کو دوسرے کردار کی فضائے بعید یا اس کا پس منظر بناتے ہیں، کبھی یہ پس منظر اپنے مقابل کے کردار کی خصوصیات کو اگر وہ روشن ہیں تو روشن تر اور اگر تاریک ہیں تو تاریک تر کرکے دکھاتے ہیں۔ کبھی اس پس منظر کے مقابل ایک کردار کو صرف ناپا جاتا ہے، یوں بلند ترین روشنیاں اور عمیق ترین تاریکیاں پڑھنے والے کے سامنے لائی جاتی ہیں ؛

تاہم کرداروں کا تنہا مصرف تقابل ہی نہیں ہے، یہ اصول کہ زیادہ سے زیادہ کفایت ذرائع برتی جائے اس امر کا مقتضی ہوتا ہے، کہ وہ اور طریقوں سے بھی ایک دوسرے سے اس طرح پیوست کئے جائیں جیسے کپڑے کے تار ایک دوسرے سے چسپاں کردیئے جاتے ہیں، کیونکہ ان کی اس پیوستگی سے افسانے کی تشکیل کا عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے

بعض اوقات معاون کرداروں میں انفرادیت بالکل نہیں ہوتی، وہ صرف پس منظر کا کام دینے یا فضا پیدا کرنے کے واسطے پیدا کئے جاتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں ان کی تخلیق اور تعمیر پر کوئی خاص توجہ صرف نہیں ہوتی، یا تو ان کی ایک ہلکی سی جھلک دکھا دی جاتی ہے، یا صرف اوپری طور سے تذکرہ کردیا جاتا ہے یا ان کا ایک ہلکا سا عکس دکھا دیا جاتا ہے، بعض افسانوں میں اضافی کردار صرف جزئیات کی تکمیل کیلئے لائے جاتے ہیں، کبھی ایک کہانی بیان کرنے والے کی ضرورت ہوتی ہے جس کا خود کہانی کے واقعات میں کوئی حصہ نہیں ہوتا غرض صدہا طریقوں سے امدادی کرداروں سے کام لیا جاسکتا ہے، ہر افسانے کی اپنی جداگانہ ضروریات ہوتی ہیں ؛

بعض اوقات افسانے میں ایک معاون کردار کا اس لئے بھی اضافہ کردیتے ہیں، کہ اس سے نفس مضمون کو تقویت پہنچتی ہے" مثلاً "مرکزی کردار رابعہ کی خصلتوں کو واضح تر کرنے کے لئے نیاز نے "شہید آزادی" میں حیدر رضا کا کردار پیش کیا ہے، کرداروں کا واقعات سے بڑا قریبی تعلق ہوتا ہے اس لئے اب ہمیں افسانے کے وقوعات کی طرف توجہ کا رخ پھیرنا چاہئے افسانے کا یہ اصول ہے، کہ ہر جزو کسی نہ کسی طرح افسانے کے عمل اور اس کی حرکت کو آگے بڑھاتا ہے اور افسانے کو اس کے متعینہ انجام سے قریب تر کردیتا ہے اس سے ایسی جزئیات مہیا ہوتی ہیں، جن سے افسانہ مکمل ہوتا ہے، انہی جزئیات کے صحیح انتخاب اور مناسب استعمال پر بڑی حد تک افسانے کے تاثر کا دارومدار ہوتا ہے ؛

وقوعات کے تین مصرف ہیں، مثال سے کسی چیز کو واضح تر کرنا، عمل میں تیزی پیدا کرنا اور جذبات کی اکساہٹ کا سامان مہیا کرنا، یہ ضروری نہیں کہ ایک افسانے میں وقوعات کا ایک مصرف ظاہر ہو، ہر کہانی میں عمل اور جذبات ایک ساتھ نمودار ہوتے ہیں، اس لئے عمل کے وقوعات اور جذباتی وقوعات اکثر پہلو بہ پہلو یا ایک دوسرے سے وابستہ دیکھے جاتے ہیں ؛

مثالی وقوعات بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں، اور وہ افسانے کے لئے بنیادی طور پر ضروری بھی نہیں ہوتے وقوعات عمل البتہ افسانے کے لئے جان کا حکم رکھتے ہیں، جذباتی وقوعات کو اس طرح ترتیب دینے سے کہ وہ وقوعات کے درمیان آجائیں افسانے کے مضمحل کن تسلسل کو توڑا جاسکتا ہے، یہ سوال ہوسکتا ہے کہ اس طرح بار بار دلچسپی کو اکسانے اور مدھم کردینے سے آیا افسانے کی وحدت تاثر کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا ؟

ایک معمولی سی مثال سے اس سوال کا تشفی بخش جواب دیا جاسکتا ہے فرض کرو ایک شخص پہاڑ پر چڑھ رہا ہے وہ منظر جو پہاڑ کی چوٹی سے نظر آسکتا ہے اس کو اسی وقت نظر آئے گا جب وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جائے گا مگر اس دوران میں بھی تو وہ اوپر کی طرف گامزن ہے جہاں تہاں اسے ایسی چیزیں نظر آئیں گی جو اس کی نظروں کے لئے جنت نظارہ ثابت ہونگی بالکل یہی صورت افسانے کی ہے جذبات کی ہر تازہ اکساہٹ زاویہ نظر کو وسعت دیتی ہے مگر حالات کا پورا نظارہ افسانہ کے نقطہ عروج پر پہنچنے کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے، عمل کے لحاظ سے افسانہ برابر اپنی ارتقائی منازل طے کرتا

رہتا ہے اتمام منازل نقطۂ عروج ہی پر ہوتا ہے درمیانی نازک لمحات شاہراہ ارتقا پر سنگہائے راہ بن جاتے ہیں، ہر نازک لمحہ اپنے پیشرو کی برنسبت کسی قدر بلند تر سطح پر ہوتا ہے، افسانے کے ان نازک لمحات کے درمیان دلچسپی میں کوئی کمی واقع نہیں ہونی چاہئیے کیونکہ (تلازمہ قائم رکھتے ہوئے) یہ ضروری نہیں کہ ہر بار کسی بلندی پر پہنچنے سے قبل ایک شخص کسی وادی میں اترے۔

دوسرے ٹائپ کا وقوعہ یعنی مثالی وقوعہ بھی ذہن ہی سے اپیل کرتا ہے کہ تصریحی مثالوں سے افسانے کی چمک دمک بڑھ جاتی ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مثالی وقوعات سے صرف افسانے کے واقعات کی گہرائی تک پڑھنے والے کے ذہن کو لیجانا مقصود ہوتا ہے واقعات کو مجسم کرکے وہ انہیں زیادہ واضح شکل دیدیتے ہیں اکثر اس طرح کسی کردار کی تشریح کر دی جاتی ہے، کبھی کبھی افسانے کے موضوع پر بھی مثالی وقوعات سے نئی روشنی پڑ جاتی ہے، ان کے ذریعے پڑھنے والا موضوع تک بالکل ایک نئے راستے سے پہنچتا ہے اس طرح ایک اضافی واقعے کے علم میں آجانے سے تاثیر و اثر میں بے حد اضافہ ہو جاتا ہے جذباتی وقوعات بلاواسطہ افسانے کے عمل کو ترقی نہیں دیتے وہ افسانے کی فضا بناتے ہیں، اسے ایک مخصوص رنگ دیتے ہیں اور پڑھنے میں جذبۂ ہمدردی برانگیختہ کرتے ہیں ان سے کیفیات کی تخلیق بھی کی جاتی ہے کبھی کبھی ان سے کہانی میں فوری مزا کی چمک پیدا ہو جاتی ہے مگر ان وقوعات کا مصرف کچھ بھی ہو اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ جہانتک وحدت تاثر کا تعلق ہے، یہ اسے کسی کا نقصان نہ پہنچائیں ہر چند جذباتی وقوعات تنہا بھی وجود پذیر ہو سکتے ہیں مگر عموماً وہ عملی امثال کے وقوعات سے ملحق کر دیئے جاتے ہیں۔

افسانے کی تشکیل کے دوران میں یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ عمل کردار اور فضا کو مناسب اثر بخشا جائے مگر اس میں شدت نہ ہو۔ کسی وقوعے کے بیان یا کسی کردار کی تصویر کھینچنے میں بہت سے ضروری اور غیر اہم تفصیلات دی جا سکتی ہیں ان کا مصرف صرف یہی ہوتا ہے کہ تاثیر میں گہرائی پیدا ہو، نیاز نے داستان حسن و عشق کے خونین ورق میں جو کنیسو فائل گاتیر سے ماخوذ ہے، قلوپطرہ (؟) کا کردار پیش کرتے وقت ورجنوں جزوی اور غیر اہم تفصیلات پیش کی ہیں، اسی طرح قلوپطرہ کے محل کی فضا بڑی مرصع پیش کی ہے۔ شاید اس سے مصنف کی غرض قلوپطرہ کا شاہانہ پس منظر پیش کرنا ہے برخلاف اس کے رادھا میں کردار نگاری کو بہت کم گنجائش دی گئی ہے یہاں عمل پر زیادہ زور ہے، اور جس حد تک ضروری ہے کہ کردار کی تصویر بھی عمل کی جھانکیوں میں ہی سے دکھائی گئی ہے، کبھی کبھی نمایاں کردار یا عمل اور بھی زیادہ نمایاں بنانے کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے کہ افسانہ نگار صرف چند تفریحی الفاظ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے، عین اسوقت جب پڑھنے والا تفصیلات کا متوقع ہو بیانی اختصار سے پڑھنے کی توجہ فوراً کردار یا عمل پر مرکوز ہو جاتی ہے۔

تخلیق اثر کے لئے بعض اور ذرائع بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا محفل سماع میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کو کسی خاص شعر یا مصرع پر وجد آجاتا ہے تو موسیقار اسی کو بار بار دہراتے ہیں اور اس کے اثر میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، ہر بار جب پسندیدہ شعر یا مصرع دہرایا جاتا ہے، صاحب وجد کے دل و جگر میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ بعض افسانوں میں بھی یہی کھٹکا استعمال کیا جاتا ہے، امریکن افسانہ نگار ایڈگر ایلن پو جو افسانہ نگاری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے، اس ترکیب کا بڑا دلدادہ اور بہت خوگر تھا، مختلف افسانوں میں یہ ترکیب مختلف طریقوں سے استعمال کی جاتی ہے، بعض دفعہ نفس موضوع پر زور دیدیا جاتا ہے، بعض اوقات وہی اشارات آغاز افسانہ میں رکھدیئے جاتے ہیں جن پر آگے چل کر افسانے کے نقطۂ عروج کی بنا رکھی جاتی ہے یا جو افسانے کی غایت کے آئینہ داری کرتے ہیں بعض افسانوں میں ایک دو موثر فقرے بار بار دہرائے جاتے ہیں، غرض ڈھنگ کچھ بھی ہو ترکیب یہ ہوتی ہے کہ اثرات زیادہ عمیق ہوتے ہیں چلے جائیں نیاز کے افسانے ایک شاعر کا انجام (از جمالستان) میں اشارات اتنے واضح اور نمایاں نہیں ہیں مگر موجود ضرور ہیں۔

افزائش اثر کے سلسلے میں جب ان امور پر زور دیا جاتا ہے جو اس کے مستحق ہیں تو ان وقوعات کی باقاعدہ ترتیب کی طرف بھی توجہ کیجاتی ہے جو افسانے کے لئے ضروری ہیں۔ یہ کام خاصا دشوار ہے بعض لوگوں کی رائے میں کسی افسانے کے واقعات اسی ترتیب سے بیان کر دینا، جس ترتیب سے وہ وقوع پذیر ہوئے ہیں، شاذ ہی ممکن ہے وہ اس کی دلیل یہ

دیتے ہیں کہ اس صورت میں افسانہ بہت پیچھے سے شروع کرنا پڑے گا اور بہت سی غیر اہم تفصیلات کو بھی راہ دینا ہوگی اور افسانہ کی حرکت بھی بہت سست رہے گی۔

بعض دیگر حضرات کا خیال ہے کہ افسانے کے واقعات بجنسہٖ اسی طرح بیان کر دینے چاہئیں جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ افسانے میں جو ضروری مداخلتیں ممکن ہیں اس طرح ان کا دفعیہ ہو جائے گا، یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ ان دونوں آرا میں سے کون سی درست ہے اور کون سی غلط، غائر نظر ڈالنے سے البتہ اتنا پتہ چلتا ہے کہ اپنی اپنی جگہ یہ دونوں فریق صحیح ہیں، اصل میں معاملے کا بہت کچھ انحصار خود افسانے پر ہے اور بہت کچھ افسانہ نگار کے سلیقے پر یہ مسلّم ہے کہ وہ افسانہ نگار جو اپنے کام کی پوری مہارت رکھتا ہے، افسانے کو بے مطلب تفصیلات سے گرانبار نہیں کرے گا، تاہم ہر افسانے میں چند تصریحی فقرے ضرور ہوتے ہیں اور وہ ضروری بھی ہوتے ہیں، تاہم افسانے کے آغاز سے پہلے جو کچھ گذر چکا ہے، اس تمام کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس بات کی چنداں ضرورت ہے کہ افسانے کے آغاز ہی میں ان سب گذشتہ سابقہ واقعات کا انبار لگا دیا جائے، واقعات افسانے میں جا بجا بیان کئے جا سکتے ہیں کہ ترتیب کی باقاعدگی کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے، یہ طرزِ عمل یقیناً دماغی پھوہڑپن پر دلالت کرتا ہے کہ کسی ایک مرحلے تک واقعات بیان کرنے کے بعد افسانہ نگار پھر ماضی کی طرف پلٹ پڑے اور کہنے لگے، "یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اب سے چار ماہ قبل جب اسلم کالج تازہ تازہ نکلا تھا........ وغیرہ وغیرہ" اس قسم کے واقعات کسی مکالمے میں یا ایسے موقعہ پر جب کردار غرقِ فکر ہو، بآسانی ظاہر کئے جا سکتے ہیں۔

قدرتاً کام اس وقت ذرا دشوار ہو جاتا ہے، جب گذشتہ واقعات کے متعلق یا کردار کے تعارف کے طور پر کافی طول طویل بیان مرحلے سے گذرنا ہو، مظہر انصاری کے افسانے ملاپ کا فرشتہ میں مصنف کو سلیمہ اور اس کے شوہر صادق کے بگاڑ کی تفصیلات ابتدا میں بتانی ضروری تھیں اور اس سلسلہ میں سلیمہ کے لاپروا اور ضدی کیرکٹر پر بھی روشنی ڈالنی تھی تا کہ آگے چل کر جو زبردست انقلاب اس کی حالت میں پیدا ہونے والا ہے اس کا تاثر اپنی جگہ خوب گہرا ہو جائے، سیدھا سادہ راستہ یہ تھا کہ افسانہ نگار سلیمہ اور اس کے شوہر کے بگاڑ کی تفصیلات ہی سے افسانہ شروع کر دیتا۔ مگر یہ راستہ مصنف کے ذہنی پھوہڑپن پر دلالت کرتا اس نے ایک زیادہ سلیقہ مندانہ اور فن کارانہ طریق اختیار کیا، سلیمہ اور اس کی سہیلی کی گفتگو سے افسانہ کا آغاز کیا (واضح ہو کہ سہیلیوں کی سکھ جاننے کے معاملے ہی پر میاں بیوی میں ان بن ہے) سلیمہ سہیلی کے ساتھ کہیں جانے کے لئے تیاری کر رہی ہے اور پوچھتی ہے "بس یا کچھ اور بھی پہن لوں" اور اس کے بعد (یعنی ایک جھلک دکھانے کے بعد) فوراً میاں بیوی کے اس بگاڑ کی تفصیل شروع کر دی جاتی ہے جو افسانہ شروع ہونے سے پہلے وقوع پذیر ہو چکا ہے۔

افسانہ سے پہلے کے گذشتہ واقعات کو ظاہر کرنے کے اور بھی متعدد طریقے ہیں۔ اکثر مرکزی کردار اپنے آپ سے گفتگو کرنے لگتا ہے اور اپنے گذشتہ زندگی کی تمام ضروری تفصیلات پیش کر دیتا ہے، کبھی مکالموں میں گذشتہ حالات بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ ان صورتوں میں گذشتہ واقعات افسانے کی حرکت کو روکتے نہیں بلکہ اس کی رفتار میں اضافہ کرتے ہیں ایک دشواری اور ہے جو اس سلسلے میں اکثر پیش آتی ہے، وہ واقعات جو بیک وقت وقوع پذیر ہوئے ہوں، انہیں کس ترتیب سے بیان کیا جائے؟ ایسی صورتوں میں ترتیب وقوع توڑ دی جاتی ہے اور افسانہ نگار اپنے طور پر انہیں ترتیب دیتا ہے، کسی واقعہ کو جو ترتیب وقوع کے لحاظ سے آگے ہونا چاہئے تھا، پیچھے کر دیتا ہے اور کسی کو جو پیچھے رکھا جانا چاہئے تھا، آگے لے آتا ہے، تاہم اکثر و بیشتر افسانوں میں ترتیب وقوع کے مطابق ہی واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔

اکثر افسانوں کو ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، یا تو ایک طویل سطر کھینچ کر ایک حصہ کو دوسرے حصے سے جدا کر دیتے ہیں۔ نقطے یا کچھ اور نشان درمیان میں لا کر فاصلہ پیدا کر دیا جاتا ہے یا (۱)، (۲) (۳) وغیرہ سے فرق ڈال دیتے ہیں، ہر چند بعض مستند افسانہ نگاروں کے افسانوں میں اس وضع کی تقسیم نظر آتی ہے مگر فنی اعتبار سے اس تقسیم کی معقولیت کا کوئی جواز نہیں نظر

آتا۔ اس صورت میں جب منظر میں مکمل تبدیلی یا سلسلہ خیالات میں مکمل انقطاع ہو اس قسم کی تقسیم قابلِ درگذر ہے، ایسی جگہوں پر فرق ڈالنے سے افسانے کی "مجموعیت" پر بُرا اثر نہیں پڑتا، برخلاف اسکے اگر اس تقسیم سے مقصود صرف مختلف زمانوں کو جدا جدا کر کے دکھانا ہو تو ظاہر ہے کہ اس سے افسانے کی حرکت پر بُرا اثر پڑتا ہے اور اس وقت یہ تقسیم نہ صرف بیکار بلکہ خلافِ قاعدہ بھی ہوتی ہے۔

مختلف زمانوں کے وقفوں کا فرق ظاہر کرنا ضروری ہی نہیں معلوم ہوتا، اگر کوئی افسانہ ابواب پر تقسیم ہوئے بغیر ہو سکتا ہے تو اسے ابواب میں تقسیم کرنا سخت غلطی ہے، بلکہ دیکھا تو یہ گیا ہے کہ جن کہانیوں میں وقفہ ظاہر ضروری معلوم نظر آتا ہے وہ بھی ایسا کرنے سے باعتبار حرکت کمزور پڑ جاتی ہیں، کیونکہ وہ پڑھنے والے کے ذہن کو "دم لینے" پر مائل کرتی ہیں، اگر افسانہ خود "تیز رفتار" سے واقعات کا فاصلہ طے کرنے پر مصر نہیں ہے تو وہ پڑھنے میں گھبراہٹ کیوں مچائیں، یوں افسانہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور جو افسانہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پڑھا جائے وہ وحدتِ تاثر کا حامل نہیں ہو سکتا اور نہ پڑھنے والے کے ذہن پر واحد تاثر مرتسم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اکثر افسانہ نگاروں کے سامنے یہ بھی ایک حل طلب سوال ہوا کرتا ہے کہ افسانے کو کیا شکل دی جائے یعنی کس قسم کا "بیانی زاویہ" لیا جائے، فہم اور سلیقہ اس منزل میں بہترین رہنما ہوتے ہیں، عموماً ذیل کے "بیانی زاویوں" میں سے کوئی ایک زاویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔

(۱) ایک ایسا شخص جس کا افسانے سے قریب یا دور کا کوئی تعلق نہیں ہے، افسانہ بیان کرتا ہے، یہ ڈھنگ بہت قدیم سے مروج ہے، اس میں چند خامیاں ضرور ہیں یعنی بعض اوقات صفائی بیان اور اصلیت کے معاملے میں افسانے میں گنجلک آجاتی ہے مگر اس ڈھنگ سے پڑھنے والوں کو ایک بڑی آسانی یہ رہتی ہے، کہ وہ ایک ہی وقت میں وہ سب کچھ دیکھ لیتے ہیں جو مختلف مقامات پر اور مختلف اوقات میں ہو رہا ہے، اس ڈھنگ سے وہ دلوں میں چھپے ہوئے خیالات اور پوشیدہ رجحانات سے بھی باخبر ہو جاتے ہیں اور کسی صورتِ حال یا کردار کا تجزیہ بھی کر سکتے ہیں۔ اس بیانی زاویے سے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ ہر کردار کو بے لاگ اور غیر جانبدارانہ طور پر پیش کیا جا سکے پڑھنے والا اس زاویے سے بیان کئے ہوئے افسانوں میں اپنی تمام توجہ واقعات پر مرکوز کر دیتا ہے اور بیان کرنے کے وجود کو بالکل فراموش کر جاتا ہے، بعض افسانوں کے لئے یہ غیر جانبدارانہ زاویۂ بیان ناگزیر اور لابدی ہوتا ہے، وہ اس ڈھنگ کے سوا اور کسی ڈھنگ سے بیان ہی نہیں کئے جا سکتے۔

(۲) کوئی ایسا شخص افسانہ بیان کرتا ہے جو خود واقعات میں حصہ دار رہ چکا ہے یا جس نے افسانے کو وقوع پذیر ہوتے دیکھا ہے، اس ڈھنگ سے واقعات کے بیان میں بہت صفائی پیدا ہو جاتی، یہ فطرت انسانی کا خاصہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی زبان سے کسی واقعے کو سننا زیادہ پسند کرتے ہیں جو یا تو حادثے میں شریک تھے یا اس وقت جبکہ حادثہ وقوع پذیر ہوا وہاں موجود تھے، اس صورت میں افسانہ بیان کرنے والا ہمارے ایک واقف کار کی سی حیثیت حاصل کر لیتا ہے اور افسانہ اصل معلوم ہونے لگتا ہے، بالخصوص ایڈونچر (Adventure) کے افسانے مرکزی کرداروں کی زبان سے بیان کرائے جائیں تو بہت ہی زیادہ لبریز اصلیت معلوم ہونے لگتے ہیں، البتہ ان صورتوں میں جب ایڈونچر کا انجام حزنیہ ہو، ایڈونچر کا انجام ہیرو کی موت پر ہوتا ہو، یہ ڈھنگ بیکار ہو جاتا ہے۔

افسانہ عمل میں یہ ڈھنگ زیادہ کامیاب ثابت ہوتا ہے، مگر افسانۂ کردار کے لئے یہ بہت غیر موزوں اور نامناسب ثابت ہوتا ہے، چونکہ مرکزی کردار اپنی ذاتی صفات اور خصوصیات کو خود اپنی ہی زبان سے واضح کرتا ہوا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا اور جب تک ایک کردار اپنی گفتگو اور اپنے عمل سے ظاہر نہ ہو افسانہ بے لطف رہتا ہے، اس لئے اگر افسانۂ کردار بیان کا یہ ڈھنگ اختیار بھی کیا جاتا ہے تو اس طرح مرکزی کردار کی جگہ ایک معاون کردار کی زبان سے افسانہ بیان کرایا جاتا ہے اس طرح کردار نگاری کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے اور واقعات کی وضاحت بھی

(۳) بعض اوقات ان لوگوں سے جو افسانے کے واقعات میں حصہ دار رہے ہیں خطوط کے ذریعہ افسانہ بیان کرایا جاتا ہے یا ڈائری میں واقعات کے اندراج سے افسانہ تعمیر کیا جاتا ہے، یہ طریق بہت کم استعمال ہوتا دیکھا گیا ہے اور اس کا استعمال بہت دشوار بھی ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ خطوط میں عموماً جہاں تہاں کی درجنوں باتیں ہوتی ہیں اور اگر مخاطب اور صاحبِ مکتوب میں بےتکلفی ہے تو تھوڑی بہت گپ شپ بھی درج ہو جاتی ہے، مگر ان خطوط میں جن سے افسانہ بنایا جاتا ہے، یہ آزادی مفقود ہوتی ہے یا دوسرے لفظوں میں فنی احتساب ان کی اس وضع کی آزادی سلب کر لیتا ہے ان خطوط میں کوئی ایسی بات درج نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی اعتبار سے افسانے کا جز بننے کی صلاحیت نہ رکھتی ہو اور پھر اس پابندی کے ساتھ ہی خطوط میں اصلیت کی جھلک بھی ہونی چاہئے، خطوط کے ذریعے افسانہ بیان کرنے میں ایک مزید دشواری یہ ہے کہ افسانے کی تدریجی ترقی اور دلچسپی قائم رکھنی مشکل ہوتی ہے، اگر کل خطوط ایک ہی شخص نے لکھے ہیں۔ تو ہر خط میں یہ بھی ظاہر کیا جانا ضروری ہوتا ہے کہ گذشتہ خط کا مخاطب نے کیا جواب دیا ؛

ڈائری کا طریقہ بھی اسی قسم کی مشکلات کا حامل ہے۔ خطوط تو بہر حال کسی نہ کسی مخاطب کو خطاب کر کے لکھے جاتے ہیں اس لئے ان میں ضرور کچھ نہ کچھ دلچسپی ہوتی ہے، مگر ڈائری کا طریق اس لحاظ سے اور بھی زیادہ غیر دلچسپ ہوتا ہے کیونکہ تنہا ایک ہی شخص ڈائری لکھتا ہے، کسی کو خطاب کر کے نہیں لکھتا ؛

(۴) ایسی صورت میں جب افسانہ بیان کرنے والے نے افسانہ کسی دوسرے سے سنا ہو تو وہ افسانہ در افسانہ ہو جاتا ہے، پہلے دو تین پیروں میں ایک قسم کا بیانیہ تعارف ہوتا ہے اور پھر یہ دکھایا جاتا ہے کہ ایک شخص (عام طور پر بہت اصرار کے بعد) ایک کہانی شروع کرتا ہے جو اس نے اپنی اپنی جگہ کسی سے سن رکھی ہے، یا جس کے واقعات اس کی موجودگی میں وقوع پذیر ہوئے ہیں یا جن میں وہ خود بھی بطور معاون کردار یا مرکزی کردار شریک رہا ہے، یہ طریق اور بھی کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے اصل یہ ہے کہ یہ طریق بیان بہت ہی قدیم ہے، اطالوی زبان میں جو کاسیو کے درجنوں افسانے اس طریق پر ہیں انگریزی زبان میں چاسر نے اس طریق کو کئی کئی طرح استعمال کیا ہے، ہماری اردو زبان میں میر امن دہلوی نے چہار درویش اسی پیرائے میں لکھا ہے ؛

یہ کہنا ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ افسانے کا کمال یہ ہے کہ پڑھنے والا اسے اصل سمجھے تشکیل کی تمام جزئیات کو اس طرح آراستہ کرنا چاہئے کہ وہ مبنی بر اصلیت معلوم ہوں، اثر اسی وقت ہوتا ہے جب پڑھنے والا افسانے کو اسقدر اصل سمجھنے لگے کہ اسے شبہ ہو جائے کہ یا تو یہ واقعہ کہیں ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے، اگر پڑھنے والے کو افسانہ پڑھتے وقت یہ محسوس ہونے لگے کہ اسے ابلہ فریبی کا شکار بنایا جا رہا ہے، تو متنفر ہو کر افسانہ ہاتھ سے رکھدے گا، بعض اوقات اپنی دلچسپی کی بنا پر دیوی پری کے افسانے بھی اصل معلوم ہونے لگتے ہیں ان میں بعض خصوصیات ایسی ہوتی ہیں، کہ قوت متخیلہ ان پر لوٹ جاتی ہے اور بے دام غلاموں کیطرح ان کی رفتار کے ساتھ چلنے لگتی ہے پختہ عمر کے لوگ طبعاً دیو پری کے افسانوں میں اتنی دلچسپی نہیں پاتے جتنی بچے اس کی ایک صریح وجہ یہ ہے، ٹھوس حقیقتوں کی سنگینی دنیا سے تادیر تعلق رکھنے کی وجہ سے پختہ عمر کے لوگوں کی قوت متخیلہ کند ہو جاتی ہے، خیالی دنیاؤں میں پہنچ جانے کی قوت انہیں نہیں رہتی، انہیں دیوؤں کی لڑائیوں اژدہوں کے مارے جانے اور دیوزادوں کے زیر کئے جانے میں چنداں لطف نہیں آتا کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں، کہ اس حقیقی دنیا کے دیوؤں کا جن سے دن رات واسطہ پڑھتا رہتا ہے، اسی دنیا کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا جانا ہمارے لئے زیادہ مفید اور باعث دلچسپی ہے پختہ عمروں کے مرد اور عورتیں دونوں اپنی اس قابلیت پر فخر کرتے ہیں کہ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکتے ہیں اس قسم کی باتیں کہ ایک ہوائی قالین آیا اور وہ شہزادے کو اڑا کر پریوں کی حسین سرزمین کی طرف لے گیا، انہیں مجہول اور بے معنی معلوم ہوتی ہیں، جب تک انہیں یہ خیال رہے گا کہ افسانہ خیالی واقعات پر مبنی ہے اور اس کا سنگین حقائق سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے (اور یہ اسوقت جب وہ پڑھنے پر آمادہ ہوں) چنانچہ حقیقت پسند افسانہ نگار صرف انہیں واقعات پر اپنے افسانوں کی بنیادیں رکھتے ہیں جو نہ صرف حقیقی معلوم ہوں بلکہ بلا کسی بحث کے حقیقی تسلیم بھی کر لئے جائیں ؛

مگر ان کا مطلب یہ نہیں کہ افسانہ ہو بہو زندگی کا چربہ ہونا چاہئے

چابکدست سنگتراش جس طرح اپنے تخیل سے پتھر کے ایک ٹکڑے کو ایک دلکش اور حسین مورت میں تبدیل کر دیتا ہے، اسی طرح ایک ماہر فن افسانہ نگار ایک حقیقی واقعہ کو زبان اور خیال کے رنگ دے کر کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے اور وہ واقعات کو حقائق کے ہجوم میں سے جدا کر کے اپنے اپنے تخیل کا جادو کرتا ہے اور دیکھتے دیکھتے ہیں وہی بے برگ گیا اور خشک واقعات سچائی اور حسن کے ایک دلاویز مرقع کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

کبھی کسی شخص کے کیریکٹر کے کسی قابل غور پہلو کو اہمیت دے کر اتنا بلند کر دیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا ایک لمحے کے لئے گہرے سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اتنی سی غیر اہم خصوصیت کردار کو بھی اسقدر سبق آموز بنایا جا سکتا ہے، کبھی کسی ایک واقعہ کو اس کے جزوی علائق سے علیحدہ کر کے کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ جو لوگ اسپر غور کرتے ہیں انکے دلوں پر چوٹ سی لگتی ہے، غرض کسی چیز کو دبایا جاتا ہے کسی کو ابھارا اور رد کر دیا جاتا ہے اور حقیقی رکھتے ہوئے بھی ایسا بنا سنوار کر پڑھنے والوں کے آگے پیش کر دیا جاتا ہے کہ انہیں افسانہ نگار کی ژرف نگاہ اور علوے تخیل کا معترف ہونا پڑتا ہے۔

مگر یاد رہے کہ حقائق پر تخیل کا ضرورت سے زیادہ گہرا رنگ چڑھ جانے سے ان کے اثر میں کمی ہو جاتی ہے، حقائق اپنی سچائی کے اعتبار سے اول آخر حقائق ہی رہتے ہیں مگر وہ موثر نہیں ہونے پاتے انہیں تاثیر کا حامل بنانے کے لئے ضرورت ہوتی ہے کہ انکا رشتہ و پیوند کسی ایسی چیز سے کیا جائے جو عام انسانی تجربے سے ڈانڈے ملائے ہوئے ہو وہ کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جس سے عام انسانی واقفیت رکھتے ہوں،

افسانے میں اصلیت کی جھلک پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ افسانہ نگار خود کو توقعات اور طول طویل پیمانوں کا پابند کرے ایسی جزئیات بھی جو افسانے میں جابجا منتشر کر دی گئی ہوں موثر ہوتی ہیں، جائے وقوع اور وقت کے جزوی اشارات سے بھی افسانے میں اصلیت کی جھلک پیدا ہوتی ہے، کردار کے منہ میں بھی ایسے فقرے رکھے جاتے ہیں جو افسانے کو واقفیت کو رنگ دیدیں، حقیقی واقعات یا ہنگامی سانحات کی طرف کبھی کبھار ہلکا سا اشارہ کر دینے سے بھی اصلیت جھلکنے لگتی ہے۔

نشۂ بیخودی

(از جناب تقی علی یاسمی۔ ناگپور)

میرے سوامی!

تمہاری آرتی کے لئے میں نے تھال سجایا تھا

من کے مندر کو دھو پونچھ کر تمہارے بیٹھنے کے لئے سنہاسن بھی رکھا تھا

تمہاری پوجا کیلئے میں نے باغ کا سب سے خوشنما پھول چن لیا تھا۔

دئیے کو محبت کے تیل سے لبریز کر کے خوب لمبی بتی جلا دی تھی۔

تمہارے انتظار میں خبر نہیں ہے کتنی دیر تک تمہارے خیال میں مگن کھڑی رہی ۔ دن بہت چڑھ آیا لیکن ارے یہ کیا ہوا؟ مجھے چکر کیوں آنے لگے؟

یہ نشۂ بیخودی؟ یہ عالم مدہوشی مجھ پر کس طرح طاری ہو گیا؟

سب دیئے بجھ گئے ——— اُف ——— ! یہ اندھیرا اس میں تو کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا؟

شاید دیر بہت ہو گئی۔

لیکن میرے قابل احترام دیوتا تمہاری پوجا کیا اب نہیں ہو سکے گی؟

اور میری مہیا کی ہوئی چیزیں کیا یونہی رہ جائیں گی؟

(ترجمہ)

فردوسی

(از جناب سید مسعود شاہ صاحب بی۔ اے بمبئی)

دورِ غزنوی جاتا رہا لیکن دنیا فردوسی کی ناقدری کی داستان کو فراموش نہ کر سکی۔ قوموں اور حکومتوں کی شہرت و عظمت اور ان کا اقتدار و جبروت محض بڑے بڑے شہروں منظم فوجوں خوبصورت عمارتوں مضبوط جنگی بیڑوں یا آثار مستقلہ پر ہی مبنی نہیں ہے، بلکہ اُن کے مقتدر و دلیر رہنما، اہلِ خرد جوانمرد، مشہور مصنف اور بلند پایہ مقرر ہی اس عروج کے اصلی بانی ہیں جو کہ قوم و ملت کو شہرت دوام عطا کرتے ہیں اور استقلال و آزادی کی بنیادوں کو مضبوط کر کے اخوت انسانیہ کی برادری کا موجب بنتے ہیں۔

دنیا کی مہذب اقوام عرصہ دراز سے اپنی بصیرت و دانش کی مدد سے اس حقیقت کا کھوج لگا چکی ہیں کہ ترغیب و قدردانی ہی ان نوادرِ روزگار کی نشو و نما کا واحد ذریعہ ہے، اور ان جذباتِ قدرشناسی و فرائض سپاس گزاری کو ان کی زندگی میں اور ان کی موت کے بعد بھی مختلف صورتوں میں نمایاں کیا جاتا ہے، مثلاً اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کی فکر سے بے نیاز کیا جاتا ہے نہیں آسائشِ حیات سے استفادہ کرنے میں آسانیاں مہیا کی جاتی ہیں، انکی خدمت میں نذرانے پیش کئے جاتے ہیں، ان کے اعزاز میں دعوتیں دی جاتی ہیں، ان کے مجسمے میدانوں، گزرگاہوں اور پبلک مقامات پر نصب کئے جاتے ہیں، ان کی ولادت پر دھوم دھام سے خوشیاں منائی جاتی ہیں اور ان کی موت پر ماتم کیا جاتا ہے، محلوں باغوں، پارکوں، شہروں حتیٰ کہ ملکوں کو ان کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے مثلاً جرمن کے مشہور شاعر گوئٹے کے روز پیدائش کی تقریب پر ساری ملت نے دھوم دھام سے جشن منایا اور متعدد اخباروں اور رسالوں نے گوئٹے نمبر نکال کر اپنے صفحات کو مزین کیا۔ اور اسی طرح دو سال پہلے حکومت متحدہ امریکہ نے مشہور مخترع ایڈیسن کی یاد میں ایک مجلس عزا داری برپا کی اور اس میں اکثر بڑے بڑے شہروں اور ملکوں نے اپنے اپنے نمائندوں کے ذریعہ اس کی موت پر اپنے دلی رنج و ملال کا اظہار کیا، ان امور سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ جو فلاح انسانی کے لئے کوشاں ہیں اور اس ضمن میں مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں تو محض ان کی قوم ہی انکی ہستی کو اپنے لئے مایۂ مصور نہیں کرتی بلکہ سارے جہان کے لوگ انکی بارگاہ عالی میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ سب کی آنکھوں کا تارا بن چکے ہوتے ہیں۔

حیاتِ فردوسی:- کنیت ابو القاسم اور تخلص فردوسی تھا لیکن تاریخ گزیدہ تذکرۂ دولتشاہی اور دانشکدہ کی روایات کے مطابق نام حسن، احمد اور منصور تھا اور باپ کا نام علی اسحٰق دادا کا نام شرف شاہ اور باپ کا نام اور دادا کا نام فرخ فردوسی، اسکی اس کی جائے پیدائش کے متعلق بھی اختلاف ہے نظامی عروضی اُسے باژ یا باز یا ناز کے گاؤں کا رہنے والا سمجھتا ہے یہ گاؤں آج کل کے طبران یا طابران کے پاس ہے جو کہ طوس کے قرب و جوار میں ہے، دولتشاہ کہتا ہے کہ طوس کے دیہاتوں میں سے شاداب اس کا مولد ہے بروایتے دیگر یہ فخر قریۂ رزان کے حصہ میں آتا ہے، یہ گاؤں بھی طوس کے نواحی

میں سے ہے، بالآخر اُس کے نام ولدیت اور مولد کے متعلق صحیح طور پہ یوں کہہ سکتے ہیں، ابو القاسم حسن بن فرخ الدین احمد بن فرخ فردوسی باژ کا رہنے والا جو کہ طوس کا ایک دیہات ہے۔

اسی طرح اُس کی تاریخ ولادت و وفات بھی مختلف فیہ ہے بعض ان ابیات کی طرف رجوع کرتے ہیں:۔

چو سال اندر آمد بہ ہفتاد و یک	ہمے زیر شعر آمد اندر فلک
ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد و بار	کہ گفتم من این نامۂ شاہوار

سن ولادت کو ۳۲۹ ہجری متصور کرتے ہیں، بعض "ز ہجرت شدہ پنج ہشتاد و بار" کو محرف سمجھتے ہیں اور اسکو یوں پڑھتے ہیں۔ "ز ہجرت سہ صد بود وہشتاد وچار" اور اس صورت میں بیت کے اس ٹکڑے کو ملا کر کہ "چو سال اندر آمد بہ ہفتاد و یک" سن ولادت ۳۱۳ ہجری نکالتے ہیں۔ اس دلیل کی بنا پر سالِ گذشتہ استاد طوسی کا ہزارویں سن ولادت قرار پایا۔

نظامی عروضی مصنف چہار مقالہ کہتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کی تخت نشینی کے موقع پر یعنی ۳۸۷ ہجری میں فردوسی ۵۸ برس کا تھا اور اس مورخ کے خیال کے مطابق فردوسی نے ۲۵ برس شاہنامہ کی تصنیف میں لگائے، بعض کہتے ہیں کہ ۴۰۰ برس شاہنامہ ختم کیا، فردوسی کی عمر ۷۶ یا ۷۷ سال تھی، اس اندازے سے سن ولادت ۳۲۳ یا ۳۲۴ ہجری ہوا۔ خود فردوسی کے قول کے مطابق۔

"بہ سی سال اندر سرائے سپنج، بسی رنج بردم بامید گنج"، سال وفات ۴۱۶ یا ۴۱۷ ہجری ہوتا ہو، قصہ کوتاہ فردوسی کی ولادت کے بعد اُس کے باپ نے خواب دیکھا، کہ ابو القاسم کوٹھے پر قبلہ رو کھڑا ہے اور فریاد کر رہا ہے، لوگ اُس کی فریاد کو سنتے ہیں اور وہاں ایک ہجوم جمع ہو جاتا ہے، مبصرین نے کہا کہ تیرا بیٹا ابو القاسم اقلیم سخن پر اس طرح بادشاہی کرے گا، کہ لوگ جان و دل سے اسپر فدا ہوں گے، سو جب فردوسی بالغ ہوا حصولِ علم اور تکمیلِ ادب میں مشغول ہو گیا، اس مردِ عظیم کے اوقاتِ فرصت کا رفیق باژ کا ایک چھوٹا سا دریا تھا جو اس گاؤں میں سے گذرتا تھا۔

بعض اوقات برساتوں کے سبب اور دریا میں طغیانی کی وجہ سے دیوار خراب ہو جاتی تھی اور پانی جمع ہو جاتا تھا حکیم طوسی غمگین و ملول ہو جاتا تھا اور بار بار اپنے محبوب کی جدائی میں روتا تھا اور اشعارِ عاشقانہ کا وسیلہ ڈھونڈتا تھا، اسی کے بعد اُس کا دماغ علو خیال کی جولانگاہ بن جاتا تھا، اس نے سد طوسی کی تعمیر کیلئے اپنے آپ کو آمادہ کیا اور ایک بڑے کام کا بیڑا اُٹھایا چنانچہ اسنے تواریخ گذشتہ کو نظم کرنے کی ٹھان لی۔

دولت شاہ سمرقندی کہتا ہے کہ وہ ایک فقیر منش انسان تھا جس نے حاکم طوس کے مظالم سے تنگ آ کر غزنی کی طرف ہجرت کی اور وہاں شعر گوئی سے معاش پیدا کرنے لگا۔

اسوقت خراسان میں انقلابات نمودار ہوئے اُن ایام ہائے تیرہ نے فردوسی کے لئے بڑے مواقع پیش کئے، لیکن وہ تواریخ گذشتہ کی تحقیق سے تھکا نہیں، حتے کہ اُسے خبر تھی، کہ دقیقی سلطنت گرشاسپ کی تاریخ کو اور ارجاسب کے فسانہ کو نظم کر رہا ہے۔ ۳۸۰ ھ میں اس شاعر ناکام کے قتل کے بعد فردوسی نے دقیقی کی منظومات و تالیفات تاریخی کو حاصل کیا۔ چنانچہ شاہنامہ کے شروع میں کہتا ہے۔

جوانی بیامد کشادہ زبان	سخنگو و خوش طبع و روشن روان
بنظم آرم این نامہ را گفت من	ازو شادمان شد دلِ انجمن
جوانیش را خوئی بد یار بود	ابا بد ہمیشہ بہ پیکار بود
برا و تاختن کرد ناگاہ مرگ	نہادش بسر بر یکے تیرہ ترگ
بدانخوئے بد بر جان شیرین بداد	نبود از جہان دلش یکروز شاد
یکایک ازو بخت برگشتہ شد	بدستِ یکے بندہ ای کشتہ شد
ز گشتاسپ و ارجاسپ بیتی ہزار	بگفت و سر آمد بر او روزگار
برفت او و این نامہ ناگفتہ ماند	چنان بخت بیدار ار خفتہ ماند

گشتاسب اور ارجاسب کی داستان اخیر میں یہ فرماتا ہے:۔

گرفتم بگوئندہ بر آفرین	کہ پیوند را داد رہ اندرین
ہمی یافت از مہتران ارج و گنج	ز خوئی بد خویش بودی برنج

اگرچہ نہ پیوست جز اندکے | ز رزم و ز بزم از ہزاراں یکے
ستائندۂ شہریاراں بدی | بہ مدح افسر نامداراں بدی
بنقل اندروں سست گشتن سخن
ازو نو نشد روزگار کہن

علاوہ ازیں اس کی ایک بہن نے جو کہ اُس کے خیالات کو جانتی تھی داستانِ شاہنامہ کی ایک منثور جلد حکیم توسی کو دی اور اُسے شاہنامہ کو نظم کرنے کے لئے کہا۔

بشہرم یکے مہربان دوست بود | تو گفتی کہ بامن بیک پوست بود
نوشتہ من این نامۂ پہلوی | بہ پیش تو آرم مگر نغنوی
مرا گفت خوب آمد این رائے تو | بہ نیکی خرامد مگر پائے تو

۳۷۰ ہجری میں مذکورہ بالا نسخہ کو نظم کیا جو کہ شاہان پارینہ کے حالاتِ مختصرہ پر مشتمل تھا، فردوسی خود اس بارے میں اشارتاً کہتا ہے

ز ہجرت سہ صد بود ہشتاد و چار | کہ گفتم من این نامۂ شاہوار

بعد ازاں ابو محمد منصور نے تنظیم شاہنامہ میں اُسے مصروف رکھا لیکن انکا جلد انتقال ہو گیا۔ اِس کے بعد حی بن قتیبہ نے حکیم طوسی کو مراعاتِ خصوصی سے نوازا۔ وہ خود کہتا ہے۔

حی قتیبہ است از آزادگاں | کہ از من نخواہد سخن رایگاں
ازویم خور و پوشش و سیم و زر | ازو یافتم جنبش و بال و پر

تنظیم شاہنامہ کے بعد وہ عراق گیا وہاں موفق وزیر بہاء الدولہ کی خواہش پر تنظیم یوسف و زلیخا کی جانب متوجہ ہوا۔ بعد ازاں پھر وطن عزیز کو لوٹا۔ اس وقت محمود غزنوی کی علم دوستی کا شہرہ آفاق میں پھیلا ہوا تھا، فردوسی کو بھی اس کی خبر ملی تو اُس نے غزنی کا رخ کیا، اگرچہ اس وقت فردوسی اتنی زیادہ شہرت کا مالک نہیں تھا، لیکن اُس کے فضل و دانش کی داستان دربارِ غزنوی کے تمام شعرا اور بالخصوص ملک الشعرا عنصری تک پہنچ چکی تھی، عنصری کو جب معلوم ہوا کہ فردوسی غزنی کو آرہا ہے چونکہ وہ اپنے مرتبہ سے ہراساں تھا، اس نے فردوسی کو پیغام بھیجا اور اسکی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا، فردوسی نے مایوسی کی ٹھانی لیکن اس کے احباب نے اسے عنصری کے مقصد سے آگاہ کیا اور اسے غزنی جانے کی ترغیب دی، فردوسی اس امداد غیر کی رہبری میں چلتا گیا حتیٰ کہ وہ غزنی پہونچا اتفاق سے وہ باغ میں گیا جہاں دربارِ محمودی کے چند شاعر جمع تھے، اور یہاں چار شاعروں کی مشہور رباعی کا قصہ پیش آیا جو کہ اب افسانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ عنصری، فرخی اور عسجدی ملے تاکہ فردوسی کو منزلِ اول میں ہی رگید دیں اور کہہ سکیں کہ غزنی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں اپنے خیال میں (ش) کے ایک مشکل قافیہ کو باندھا اور کہا کہ ہم سب ایک ایک مصرع کہیں گے جب فردوس ان شعرائے ثلاثہ کی محفل میں پہونچا، عنصری نے کہا کہ چونکہ ہم شاعر ہیں ہماری مجلس میں کوئی غیر شاعر جگہ نہیں پا سکتا اور فیصلہ یہ ہوا کہ ہر شخص ایک مصرعہ کہے تاکہ شاعر و غیر شاعر میں تمیز ہو سکے

عنصری نے کہا:- چوں عارضِ تو ماہ نباشد روشن
فرخی نے کہا:- مانندِ رخت گل نبود در گلشن
عسجدی نے کہا:- مژگانت ہمے گذر کند از جوشن

اِس موقع پر استاد توسی کی عظمت کا اظہار ہوا۔

فردوسی نے کہا:- مانندِ سنانِ گیو در جنگِ پشن

اور اسی موقع پر اُسے معلوم ہوا کہ محمود کی یہ بڑی خواہش ہے کہ کسیطرح تاریخ گذشتہ کو منظوم کیا جائے؛

چنانچہ سات شاعروں نے اس کے سات ابواب کو بانٹ لیا کہ وہ اُسے منظوم کریں گے، رستم و اسفندیار کی داستان کو عنصری کے سپرد کیا گیا۔ اس منظوم میں سلطان کو فقط یہ دو بیت پسند آئے۔

ہر آنگہ کہ تشنہ شدی تو بخوں | بیاسودی این خنجر آبگوں
زمانہ بخونِ تو تشنہ شود | باندام تو موئی دشنہ شود

فردوسی نے جب ادھر ادھر سے ان چیزوں کو سنا، وہ دربار محمودی میں رسائی پانے کے لئے بڑا مشتاق نظر آتا تھا اور کسی وسیلہ کی تلاش میں تھا، اس بارے میں بھی مختلف روایات ہیں ایک روایت یہ ہے کہ جب اس نے سنا کہ عنصری نے رستم و اسفندیار کی داستان کو منظوم کیا ہے، اُس نے اسی داستان کو جو کہ وہ پہلے ہی منظوم کر چکا تھا معمولی ترمیم کے بعد اپنے میزبان ماھک کے ذریعہ جو کہ محمود کے مصاحب

میں سے تھا، خدمتِ سلطانی میں پیش کیا، جب محمود نے اسے پڑھا
وہ بہت خوش ہوا، خود فردوسی کہتا ہے۔

چوں در گوش سلطاں سخن جا گرفت　　الف وار در جانش ما وا گرفت

دوسری روایت یہ ہے کہ ایاز جو کہ محمود کا مقرب تھا اور مالک کا
دیرینہ دوست، اس کے ذریعہ سے فردوسی نے دربار محمودی میں رسائی
حاصل کی۔

ایک اور روایت ہے جو کہ خود شاہنامہ میں ملتی ہے کہ اس زمانہ میں
ابو العباس اسفراینی محمود کا وزیر تھا اور جب اس نے وزارت کا
چارج لیا تو حکومت کے عربی مسودات کو فارسی میں ترجمہ کرنے کا حکم صادر
کیا، چونکہ فردوسی کو فارسی زبان کے ساتھ دلبستگی تھی، وہ اس کی خدمت
میں پہونچا اور اس کے زیر حکم شاہنامہ کی تنظیم و تالیف میں مشغول ہو گیا
اور اس خدمت کو سرانجام دینے کے بعد ابو العباس کے واسطہ سے دربار
محمودی میں پہونچا۔ استاد طوسی نے اسفراینی کی مدح میں چند اشارات
ہیں جو کہ اس خیال کی تائید کرتے ہیں۔

کجا فضل را مسند و مسند است　　نشستنگہ فضل بن احمد است
نبد خسرواں چنیں کدخدائے　　بپرہیز و داد و بدیں و برائے
کہ آرام ایں پادشاہی بدوست　　کہ او بر سر نامداراں نکوست
کشادہ زبان و دل و پاک دست　　پرستندہ شاہ یزداں پرست
ز دستور فرزانۂ دادگر　　پراگندہ رنج من آمد بسر
بپیوستم ایں نامۂ باستاں　　پسندیدہ از دفتر راستاں

انجام کار فردوسی کو تقرب سلطانی نصیب ہوا اور محمود نے
حکم دیا کہ وہ شاہنامہ کو پورا کرے لیکن جب حسن بن میمندی کی
وزارت کا زمانہ آیا تو اس نے فردوسی سے ہزار بیت کے
صلہ میں ہزار مثقال طلائی کا وعدہ کیا، فردوسی جس نے
کہ شہر باژ کی تعمیر کو ابتک فراموش نہیں کیا تھا اور وہ چاہتا
تھا کہ شاہی انعام کو تھوڑا تھوڑا خرچ کر کے اپنے وطن کی
نہر کو تعمیر کرے جو کہ اسے ایام طفلی میں محبوب تھی۔

رفتہ رفتہ فردوسی سلطان محمود اور امرائے سلطنت کی توجہ کا مرکز
بن گیا اور اسی وجہ سے اس کے ہمعصر ادیب اس سے خوش نہ تھے اور
اس سے جلتے تھے، اسوقت اس کا سب سے بڑا دشمن احمد بن حسن
میمندی تھا جو کہ سلطان محمود کا وزیر تھا، حاسدوں نے سلطان کے
پاس کبھی چغلی کھائی کہ فردوسی معتزلی ہے اور کبھی کہتے تھے کہ وہ قرمطی ہے
حسن میمندی ان دو بیتوں کا بھی حوالہ دے کر

اگر چشم داری بدیگر سرائے　　بنزد نبی و علی گیر جائے
گرت زیں بد آید گناہ من است　　چنیں است و ایں رسم و راہ من است

اسے سلطان کے پاس شیعہ گردانتے تھے اور سلطان کے کان
اس کے خلاف بھرتے تھے، تا آنکہ یہ بات محمود کے کانوں تک پہنچائی
کہ یہ اشعار فردوسی خود نہیں کہتا، سو محمود نے ایکدن فردوسی سے کہا۔
کہ آج سر دربار کسی داستان گذشتہ کو نظم کر دو، استاد طوسی نے اسی روز
رستم و اشکبوس کی جنگ کا تذکرہ شیریں اشعار کی شکل میں پیش کیا۔

حکیم طوسی باوجود ان دشمنانِ قوی کے دربار محمودی سے انعام کا
متوقع تھا، لیکن صلۂ محمودی میمندی کو لوٹا دینا چاہتا تھا، کیونکہ اگر
ایک بار بھی وہ میمندی کے ہاتھ سے اپنا نقصان کرنے کا موجب ہو سکتا
تھا، اگر ایک بار بھی وہ میمندی کے ہاتھ سے یہ رقم لے لیتا تو وہ اپنے
ہاتھ سے اپنا نقصان کرنے کا موجب ہو سکتا تھا، لہذا اسنے دوسری روش
اختیار کی چنانچہ اسنے رستم و اسفندیار کی داستان کو فخر الدولہ دیلمی کی
بارگاہ میں پیش کیا، جہاں سے اسے ایک ہزار دینار بطور انعام ملا، اور
دربار میں آنے کی دعوت مزید انعام کے وعدہ کے ساتھ ملی۔

دشمنوں کو جب یہ اطلاع ملی کہ فردوسی نے داستانِ رستم و اسفندیار
فخر الدولہ دیلمی کے حضور میں پیش کیا ہے اور وہاں سے اسے ایک ہزار
دینار صلہ بھی عطا ہوا ہے۔ انہوں نے محمود کے کان بھرے اور اسے
فردوسی سے بالکل ناراض کر دیا، جب شاہنامہ تمام ہوا اور ادائیگی صلہ کا
موقع آیا، تو میمندی نے یہ دلیل پیش کی کہ فردوسی ایک دیہاتی ہے
اور اس قابل نہیں کہ اسے ۶۰ ہزار مثقال طلائی انعام میں دیا جائے
علاوہ ازیں وہ فخر الدولہ دیلمی سے بھی رابطہ رکھتا ہے۔ یہ امور ایفائے
عہد میں مانع ثابت ہوئے اور محمود ۶۰ ہزار مثقال طلائی اسے نہ بھیج سکا

روایت ہے کہ اُسنے ۶۰ ہزار مثقال طلائی اپنے محبوب غلام ایاز نامی کے ہاتھ جو کہ فردوسی کا بھی دوست تھا، حکیم توسی کی خدمت میں روانہ کئے، جب ایاز فردوسی کے یہاں پہونچا تو وہ اس وقت حمام میں تھا، جب حکیم توسی نے دیکھا کہ سلطان نے چاندی بھیجی ہے تو اُس نے ۴۰ ہزار مثقال وہاں حمام میں ہی تقسیم کردیئے اور باقی ۲۰ ہزار ایاز کو بخشدیئے اور سلطان کو پیام بھیجا کہ یہ شاہکار اپنے مال و دولت کی طمع کی بنا پر تیار نہیں کیا ہے، جب یہ پیام سلطان کو ملا تو اُس نے میمندی کو موردِ عتاب قرار دیا، میمندی نے جواباً عرض کیا کہ انعام سلطانی ایک درم سے لاکھ درم تک برابر ہے، اگر مٹھی بھر مٹی بھی بارگہ سلطانی سے اس کے پاس بھیجی جاتی، تو وہ اُس کے اعزاز میں اسے سرمہ کے بدلے آنکھوں میں لگاتا، سلطان اس جواب سے خوش ہوا، اور کہا کہ صبح اُس قرطی کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے پھنکوا دونگا تاکہ یہ سزا سب لوگوں کیلئے سرمایۂ عبرت ہو۔ جب یہ خبر فردوسی کو ملی، تو وہ صبح ہی رہگذر سلطانی کھڑا ہوگیا اور سلطان جبکہ جامع مسجد کو جارہا تھا تو وہ اُسکے قدموں پر گر پڑا، اور بدیہتہً کہا :-

چو در ملکِ سلطاں کہ خرّش ستود ‏ — ‏ بسے ہست ترسا و گبر و یہود
کہ ایشاں بجز بہ کفایت کنند ‏ — ‏ زر و مالِ خویشاں حمایت کنند
گرفتند در ظلِّ عدلش قرار ‏ — ‏ شدہ ایمن از گردشِ روزگار
چہ باشد کہ سلطاں گردوں شکوہ ‏ — ‏ رہی راشناسد یکے زاں گروہ

لیکن نظامی عروضی کا خیال اس سے بالکل مختلف ہے، وہ کہتا ہے جب فردوسی نے دربار غزنی کا رخ کیا اور امیر الامرا احمد حسن کے ذریعہ شاہنامہ پیش کیا تو اسے شرفِ قبولیت حاصل ہوا، لیکن خواجہ فردوسی کا مخالف تھا اور اُس کی علوِ مرتبت اُسے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی"

دوسرے مقام پر کہتا ہے، ایک دفعہ محمود ہندوستان سے غزنی کو لوٹ رہا تھا مگر راستے میں ایک دشمن سے مقابلہ تھا۔ اور اگلے روز محمود کو اُس کے قلعہ پر پہونچنا تھا، فردوسی کو پیغام بھیجا کہ بارگاہِ سلطانی میں حاضر ہو کر واپس جائیے، دوسرے روز محمود نے دربار منعقد کیا۔ اور خواجہ کی نشست اُس کے دائیں جانب تھی، اُس وقت ایلچی واپس حاضر خدمت ہوا، سلطان نے خواجہ سے دریافت کیا کہ کیا جواب آیا ہے، خواجہ نے فردوسی کی یہ بیت پڑھی :-

اگر جز بکامِ من آید جواب ‏ — ‏ من و گرز و میدانِ افراسیاب

محمود نے پوچھا کہ یہ بیت کس کی ہے کہ اس سے بہادری ظاہر ہوتی ہے، وزیر نے جواب دیا کہ یہ بیت غریب فردوسی کی ہے جس نے کہ پچیس برس ایسی کتاب کو نظم کرنے میں صرف کردیئے اور کسی اجر کا خواستگار نہ ہوا۔ اور بعد میں لکھتا ہے کہ سلطان پر اس کا اثر ہوا اور اُس نے خواجہ کو فردوسی کی طلبی کے حکم کے ساتھ انعام بھیجنے کو کہا اور خواجہ نے غزنی پہونچکر محمود کو یہ بات یاد دلانے پر حکیم توسی کی خدمت میں تحائف روانہ کئے، لیکن حسن میمندی کی چغلخوری کی حکایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، قبل ازیں یہ قول قلمبند کیا جاچکا ہے کہ فردوسی کو شاہنامہ کی تنظیم پر ابوالعباس اسفراینی نے اُبھارا تھا، احمد حسن میمندی نے ابوالعباس کی حکمت عملی کو یکسر تبدیل کردیا تھا اور قدرتی طور پر وہ ابوالعباس کے حمایتوں اور احباب سے خوش نہ تھا، بالخصوص اس لئے کہ یہ وزیر سیاستمدار متعصب سُنی تھا اور ایرانیوں کی قومی زبان کی ترقی اس کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھی۔

فردوسی خود شیعہ تھا اور آثارِ ملّی کے تحفظ کا جاں نثار، فردوسی نے شاہنامہ میں حسن میمندی کی مدحت میں کچھ نہیں لکھا، بلکہ کئی جگہ اُس کے ہجو یہ اشعار ملتے ہیں چند نمونے ملاحظہ ہوں :-

ز میمندی آئین مردی مجوئے ‏ — ‏ ز نام و نشانش مکن جستجوئے
قلم بر سر او بزن ہجو من ‏ — ‏ کہ گم باد نامش ز ہر انجمن

آخرکار جب فردوسی نے اپنی جان خطرہ میں دیکھی، تو ایک روز ایک کاغذ پر محمود کی ہجو لکھ کر ایاز کو دی اور کہا۔ کہ میں میمندی کی دشمنی کی وجہ سے اب زیادہ دن غزنی میں قیام نہیں کرسکتا، اُسی کی دوستی کی بنا پر تم سے مطالبہ کرتا ہوں کہ مجھے محمود سے تنہائی میں ملنے کا انتظام کر اور بعد ازیں جامع مسجد کے دروازے پر مندرجہ ذیل بیت لکھدیئے۔

خجستہ درگہِ محمود زابلی دریاست ‏ — ‏ چگونہ دریا کاں را کرانہ پیدا نیست
شدم بہ دریا غوطہ زدم ندیدم در ‏ — ‏ گناہ بخت من است ایں گناہ دریا نیست

ایک شب اس شعر و ادب کے مجسمہ نے جو کہ زبان ایرانی کو زندہ کرنیوالا تھا، تن تنہا بے سرو سامان لاٹھی ٹیکے غزنی سے کوچ کیا۔

بغزنی مرا گرچہ خوں شد جگر　　　ز بیداد آں شاہ بیداد گر
کزاں ہیچ شہ رنج سی سالہ ام　　　شنید از زمیں آسماں نالہ ام
ہمی خواستم تا فغاں نہاں کنم　　　بگیتی ازو داستانہا کنم

اعیان و اکابر سلطنت محمودی اس امر کے متمنی تھے کہ فردوسی کی معیت میں وہ اس پادشاہ ناقدرشناس کی خدمت میں حاضر ہو کر عواطف ایرانی کے اس مظہر اور رشادت ایرانی کے اس رہنما کی خدمت کر سکیں لیکن خوف سلطانی تکمیل کار میں سدراہ بنا رہا، لیکن ایاز نے جو کہ اس مرد مظلوم کے ساتھ نسبت پسرانہ رکھتا تھا، پیر توسی کے لئے زاد راہ مہیا کر دیا۔

یہ شاعر اعظم غزنی سے قہستان پہونچا، اور وہاں کے حاکم ناصر سے ملا اور چاہتا تھا کہ ہجو نامۂ محمودی میں کچھ ایزاد کرے لیکن ناصر نے اُسے دس ہزار درم عطا کئے اور اُس کی دلجوئی کی اور کہا کہ بدگوئی اہل کمال کا کام نہیں ہے، فردوسی نے بھی اُس کی باتوں پر کان دھرا اور اس بیت پر ان ابیات کا اضافہ کیا کہ

گذشتم ایا سرور نیک رائے　　　ازیں داورے تا بدیگر سرائے
رسد لطف یزداں بہ فریاد من　　　ستاند بمحشر ازو داد من

اور ناصر کو دکھائیں۔

ناصر جو کہ محمود کا مقرب تھا، نیز احمد حسن کی بداندیشی کی داستان کو بھی جانتا تھا، ان دو بیتوں کو بھی نامۂ محمودی کے اخیر میں ثبت کر دیا جب یہ خط غزنی پہونچا، اور سلطان جامع مسجد سے باہر آرہا تھا تو اُس نے ابیات فردوسی کو دیوار مسجد پر دیکھا، تو متاثر ہوا اور جب ناصر کے خط کو مطالعہ کیا:-

چو فردوسی آں سرو والا گہر　　　غمیں شد ز میمندی بے ہنر
ضررہا بسے زاں فرومایہ دید　　　وزو بے سبب رنج و حرماں کشید
طبیعت مکافات آغاز کرد　　　سرش بادم تیغ انباز کرد

میمندی پر عتاب سلطانی نازل ہوا اور آسے وزارت سے برطرف کردیا گیا، لیکن پھر بھی فردوسی پر خوف سلطانی طاری تھا، وہ قہستان چھوڑ کر منوچہر بن شمس المعالی کے پاس طبرستان چلا گیا اور ایک مدت تک اس کے پاس قیام کیا، لیکن منوچہر نے محمود کے خوف کے مارے اسے سفر خرچ دے کر طبرستان سے روانہ کر دیا، اُس نے وہاں سے ہرات کا رخ کیا، وہاں چھ مہینے تک اسمٰعیل وراق ہروی کے پاس رہا اور آخر کار وہ اپنے اصلی وطن توس میں پہونچ گیا، اور وہاں ہی تھوڑے عرصہ کے بعد اس عالم فانی سے رخصت ہو گیا۔

اس کی موت پر گاؤں کے مولوی ابوالقاسم گرگانی کو خبر کی گئی تاکہ وہ نماز جنازہ پڑھا دے اس نے جواب میں کہا۔ کہ فردوسی شیعہ تھا اور میں نماز جنازہ نہیں پڑھا سکتا۔ رات کو اُس نے خواب دیکھا کہ حکیم توسی بہشت بریں میں لباس فاخرہ پہنے خوش و خرم بیٹھا ہے اس نے دریافت کیا کہ اُسے یہ مرتبہ کیسے نصیب ہوا، فردوسی نے جواب دیا کہ ایک بیت کہنے سے اس مقام پر پہونچا ہوں اور وہ بیت یہ ہے:
فردوسی نے فرمایا:-

جہاں را بلندی و پستی توئی　　　ندانم چہ ای ہر چہ ہستی توئی

اس موقع پر شیخ الخطیر حسن بن محمد المیکال عرف حسنک سلطان محمود کے دربار میں وزارت کے عہدہ پر متعین ہوا، یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس نیشاپوری امیر کی وساطت سے سلطان نے موعودہ انعام فردوسی کی خدمت میں بھیجا، لیکن بیکار، جبکہ ایلچی توس میں پہونچا، حکیم توسی کا جنازہ بازار میں سے گزر رہا تھا،

ناصر خسرو علوی مشہور سیاح لکھتا ہے:-

ایکبار جبکہ توس سے گزر ہوا میں نے سد توسی کو دیکھا اور پوچھا کہ یہ کس نے بنائی تھی، توس کے بوڑھے آدمیوں نے کہا، حکیم توسی کی بہن نے صلۂ سلطانی کو اپنے مرحوم بھائی کی تمنا کے مطابق اسی دیوار کی تعمیر پر خرچ کر دیا تھا۔

فردوسی کے متعلق شعرا کا خیال

فردوسی ایران کا شاعر اعظم ہے، اسکی عظمت اور شہرت صرف اشعار رزمیہ سے ہی نمایاں نہیں ہوتی، بلکہ جملہ فنون ادبی و سخنی میں اسے

کمال حاصل تھا۔ اور تقریباً کہا جاسکتا ہے کہ ایران میں کوئی بھی اس مقام پر نہیں پہونچا، محمد عوفی کہتا ہے، علما اور ادبا مسلمہ طور پر فردوسی کو استاد سخن مانتے ہیں اور اس کے متعلق کہتے ہیں:۔

سکۂ کاندر سخن فردوسی طوسی نشاند　　کافرم گر ہیچ کس از مردم فرسی نشاند
اول از بالائے کرسی بر زمین آمد سخن　　او سخن را باز بُرد و برسر کرسی نشاند

عزیزی کہتا ہے:۔

در شعر سہ تن پیمبرانند　　ہر چند کہ لانبی بعدی
اوصاف و قصیدہ و غزل را　　فردوسی و انوری و سعدی

سعدی باوجود اپنے علو مرتبت کے فرماتا ہے:۔

چہ خوش گفت فردوسیٔ پاک زاد　　کہ رحمت برآں تربت پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است　　کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

اگرچہ مندرجہ بالا اشعار میں اس نے فردوسی کی تعریف نہیں کی اور نہ ہی اس کی عظمت کا اظہار کیا ہے، لیکن سعدی بھی حسب خواہ اس مضمون کو فردوسی کی طرح نہ باندھ سکا۔

عنصری نے جو کہ دربار محمودی میں ملک الشعرا شمار کیا جاتا تھا، اس نے باوجود اپنی علو مرتبت اور کبر و نخوت کے ایک مجلس میں فردوسی کے متعلق فی البدیہہ کہا:۔

چہ نظم است کز شعر برتر بود　　چہ شعر است کز شعر خوش تر بود
رواں بر زباں ہمچو جاں در بدن　　کہ گوید در ایں عصر چوں او سخن

ایک بار محمود نے ایاز کی آنکھ کی تعریف میں دو بیت بدیہتہ کہنے کے لئے کہا، تمام شاعر عنصری سمیت فردوسی کے پاس پہونچے اور کہا کہ بدیہہ گوئی فردوسی کے ہی شایان ہے، سو فردوسی نے یہ دو بیت کہے

مست است بتا چشم تو تیر بدست　　بس کس کہ ز تیر چشم تو بخست
گر پوشد عارضت زرہ عذرش ہست　　کز تیر بترسد ہمہ کس خاصہ ز مست

انوری سا مشہور تغزل گو اور قصیدہ سرا جو کہ فنونِ ادبی میں دسترس رکھتا تھا، جب اس شاعرِ ذی شان کے مرتبہ پر نگاہ دوڑاتا ہے تو بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

سخنگوئے پیشینہ دانائے طوس　　کہ آراست روئے سخن چوں عروس

اخلاقِ فردوسی

حکیم طوسی روح و عواطفِ ایران کا مظہر تھا، وہ شجاع و دلیر تھا اور پاکیزگیٔ اخلاق و عفتِ نفس کی وجہ سے بہت سے دوسرے شعرا سے ممتاز تھا۔

رودکی کے بعد وہ پہلا شاعر ہے، جس نے کہ عربوں کی عربی زبان کو ترک کیا اور اس طرح اپنے متاخرین کو بتایا کہ فارسی زبان کا دامن وسیع ہے اور ہر قسم کے مطالب کو اس زبان کے الفاظِ شیریں سے مزین کیا جا سکتا ہے

فردوسی نے اپنے اقوال کو کبھی بھی ناشائستہ عبارات یا ناپسندیدہ الفاظ سے آلودہ نہیں کیا، اور اگر کبھی اس قسم کے مطالب کو بیان کرنے کی ضرورت ہوئی تو اس نے مبہم طریق کو اختیار کیا۔

فردوسی کم آزار اور عدل دوست انسان تھا، اور مردم آزاری زیادتی کا دشمن، فردوسی آدم کشی اور خونریزی کا شدید مخالف تھا، اگرچہ شاہنامہ داستانِ رزمیہ سے بھرا پڑا ہے اور اس میں قتل و غارت اور مار دھاڑ کے سوا اور کچھ نہیں ہے، لیکن وہ شعر گوئی کے فرائض کو احسن طریق پر سرانجام دیتا ہے اور میدانِ کارزار کے پیروز کی داستانِ فیروزی کو اس وضاحت سے بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ ایرانیوں کی امن پسند روح میں حرکت پیدا ہوتی ہے، اور وہ دوسروں کے سامنے دنیا کی ناپائیداری کو اور سنگدلوں اور موذیوں کے پرخطر و نامبارک انجام کو پورے سوز و گداز کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ وہ پایاں کار اپنی ہی اولاد اور نسل کے سر پر آرہ کشی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

فردوسی وطن پرست تھا اور اپنی آبائی سرزمین یعنی ایران کا عاشق صادق بعض مقامات پر وہ خود اپنی ان حسیات کو نمایاں کرتا ہے کہانی کے ہر اس مرحلہ پر جو کہ ایرانیوں کی فتح پر منتج ہوتا ہے، ایکدم خوشی کے مارے اس کی روح بلندیوں کی فضا میں پرواز کرتی ہے اور وہ پھولا نہیں سماتا اور پوری بشاشت کے ساتھ بہادر ایرانی کو فتح و فیروزمندی کی راہ دکھاتا ہے اور جب کبھی ایرانیوں کی شکست کا تذکرہ ہوتا ہے۔ تو نالہائے جانسوز اور فغاں ہائے جگر خراش کے ساتھ، اور وہ اس طرح زار و قطار روتا ہے، گویا کہ اس کی عزیز ترین متاع لٹ گئی ہو۔

شاہنامہ میں شکستِ ایران کا منظر دیکھئے، اور اس مردِ عظیم کا اپنے بیٹے کی موت پر مرثیہ بھی دیکھ لیجئے، اب خود بتائیے آیا یہ امرِ واقعہ ہے یا نہیں؟

جبکہ اس کا چھتیس سالہ بیٹا دنیا سے کوچ کرتا ہے اور اس عظیم المرتبت انسان پر دنیا تنگ ہو جاتی ہے، تو وہ بیٹے کے سرہانے کھڑا ہو کر کہتا ہے۔

مگر بہرہ گیرم از بہرِ خویش برانديشم از مرگ فرزندِ خویش
مرا بود نوبت برفت این جوان کہ دردش منم چوں تن بے روان
شتابم مگر تا ہمے یابمش چو یابم بہ بیغارہ بشتابمش
کہ نوبت مرا بد تو ئی کام من چرا رفتی و بردی آرام من
زبدہا تو بودی مرا دستگیر چرا راہ جستی زہمراہ پیر
مگر ہمرہاں جواں یافتی کہ از پیشِ من نیز بشتافتی

اور رستم ہاماوران وشکستِ ایران کے بارے میں کہتا ہے:۔

دریغ ایران کہ ویراں شود کنامِ پلنگاں و شیراں شود
ہمہ جائے جنگاں سواراں بدی نشستگہِ شہریاراں بدی
کنوں جائے سختی و جائے بلاست نشستگہِ شیر و نر اژدہا است

رستم فرخ زاد اپنے بھائی سے کہتا ہے:۔

بایرانیاں زار گریاں شدم زساسانیاں نیز بریاں شدم
دریغ آں سر و تاج و اورنگ و تخت دریغ آں بزرگی و آں فر و بخت
کزیں پس شکست آید از تازیاں ستارہ نہ گردد مگر بر زیاں

شاعر کے مذہبی عقائد پر ان خیالات کو ہر مقام پر فوقیت حاصل رہی ہے، وہ مدام اپنی وطن پرستی و ایران دوستی کو آشکارا کرتا رہا، مثلاً رستم کے خط میں سعد ابی وقاص سے کہتا ہے:۔

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار عرب را بجائے رسیدست کار
کہ تاجِ کیاں را کند آرزو تفو بر تو اے چرخِ گردوں تفو

اور یہی خیالات اور ایران پرستی کے جذبات تھے کہ دشمنوں نے گاؤں کی نہر کو نہ بننے دیا جو کہ اس مردِ بزرگ کے اوقاتِ فرصت میں اس کی انیس ہوا کرتی تھی اور یہی وطن پرستی کے جذبات اس امر کا موجب تھے، کہ خود غرضوں کی بارگاہ سے کبھی اُسے معتزلی کا خطاب ملتا تھا تو کبھی قرملی کا۔ اور اپنی افکارِ حب الوطنی کی بنا پر متعصب اور نادان مولوی نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔

فردوسی شاہنامہ کی تنظیم کے معاملہ میں صرف تواریخ گذشتہ اور سیر الملوک پائے قدیم میں ہی اعتقاد نہیں رکھتا تھا اور چونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے اشعار ایک دنیا کے وردِ زبان ہوں گے سو اُس نے بتانا چاہا کہ ایرانی شجاع ہے، ایرانی عالی حوصلہ ہے اور وہ شاہ دوست ہے، گو رستم کو شاہنامۂ قدیم میں دکھایا گیا ہے لیکن اِس مقصد کے پیش نظر وہ اس مظہرِ ایرانی کے دامنِ زندگی کو طویل کر کے اس میں موقع بموقع ایرانی عادات و خصائل کو جمع کر کے نمایاں کرتا ہے، نہیں تو محض رستم کے وجود کے متعلق تو صاف کہتا ہے۔

کہ رستم یلے بود در سیستاں منش کردہ ام رستمِ داستاں

اور دوسری جگہ فرماتا ہے:۔

کہ من میمن از عمرِ خود کم کنم ——— جہانے پر از نامِ رستم کنم

ایکبار رستم کو موحد قرار دیتا ہے اور دوسرے موقع پر عواطفِ ایرانی کو دنیا کے سامنے یوں نمایاں کرتا ہے۔

چنیں گفت رستم کہ کشتن بس است زماں ہر زماں بہرہ ہر کس است
زمانہ ہمے بار زہر آورد زمانے زتریاک بہر آورد
ہمہ جامۂ رزم بیروں کنید ہمہ خوب کارے با فزوں کنید
چو بیند بد دل و رسرائے سپنج کہ دارد گہے شاد و گاہے برنج
زمانے چو اہرمن آید بجنگ زمانے عروسے پر از بوی و رنگ
بے آزاری و خامشی برگزیں کہ گوید کہ نفریں بہ از آفریں

اب ہم بتاتے ہیں کہ حکیم طوسی امراء وقت تو کجا اپنے زمانے کے بادشاہ کا بھی خوشامدی اور چاپلوسی نہیں بنا، چنانچہ وہ خود کہتا ہے

من بندہ کز مبادیِ فطرت نبودہ ام مائل بجال ہرگز و طامع بجاہ نیز
سوے درِ وزیر چرا ملتفت شوم چوں فارغم زبارگہِ بادشاہ نیز

شاہنامہ میں مدحتِ محمودی کے علاوہ دیگر مدائح میں وہ زمانہ کی شکایت کرتا ہے، اور شکایتِ روزگار کے بعد وہ سلطان محمود کی مدح طرازی کرتا ہے۔

چنانچہ قارئین کرام کی نظر سے گزر چکا ہے کہ فردوسی کی عادت خصوصی ہے وہ ایرانیوں پر ترک زادوں کی سلطنت کو بہت ناپسند کرتا تھا اور چونکہ وہ اپنے جذبات کا اظہار علانیہ طور پر نہیں کرسکتا تھا اسلئے اُس نے اپنے مطلب کو پیچیدہ طور پر بیان کیا ہے۔

آثار و خدمات فردوسی

حکیم طوسی مثنوی گوئی و رزمیہ شاعری کے علاوہ دوسری انواع نظم میں بھی دستگاہ رکھتا تھا، اُس کے کئی قطعات اور غزلیں ہیں، مثلاً تذکرۂ دولتشاہ میں اُس کا ایک قطعہ نقل کیا گیا ہے، کہ اُس میں ابوطیب طاہر بن محمد خسروانی کی ایک بیت پر تضمین کی گئی ہے۔

بسے رنج دیدم بسے نامہ خواندم — ز گفتار تازی و از پہلوانی
بچندیں ہنر شست و دو سال بودم — چہ توشہ برم ز آشکار و نہانی
بجز حسرت و جز وبالِ گناہاں — ندارم کنوں از جوانی نشانی
بیاد جوانی کنوں مویہ آرم — بدیں بیت بوطاہر خسروانی
جوانی من از کودکے یاد دارم — دریغ از جوانی دریغ از جوانی

حکیم طوسی بزمیہ شاعری اور اشعار عاشقانہ کہنے میں بھی ید طولےٰ رکھتا تھا اور کردار نگاری میں بھی اُسے کمال حاصل تھا، بزمہائے خسرو پرویز رستم و سہراب کی ماں تہمینہ کا معاشقہ اور ابتدائے کتاب میں رستم کی کردار نگاری چند ایک مثالیں ہیں اور شاہنامہ کے آخر میں حکیم طوسی[1] کے محاسن ادبی اور ظرافت نگاری اور بھی آشکار ہوتے ہیں، دوسری بات جس کا شاہنامہ سے پتہ چلتا ہے، یہ ہے کہ استاد توسی کی بیوی کو بھی فردوسی کے ساتھ موافقت کرتے ہی بنی مثال کے طور پر اس ضمن میں صاف کہتا ہے

شبے چوں شبہ روئی شستہ بقیر — نہ بہرام پیدا نہ زہرہ نہ تیر

کہ میرا مہربان بت عربی اور پہلوی دونوں زبانوں کو جانتا ہے اور مجھ سے مساعدت کرتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں، کہ فردوسی شاہنامہ کی تکمیل کے بعد یوسف زلیخا کی مثنوی کو نظم کرنے میں مصروف ہوگیا۔

لیکن چونکہ اس داستان کو وطن پرستی کے جذبات سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا، اگرچہ یہ جذبات ہی فردوسی کے اخلاق حسنہ کی مشہور خصوصیت ہے، سو نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ اس مثنوی کے اشعار بہت سادہ ہیں، اور اس کو شاہنامہ کے مقابلہ میں کسی طرح بھی نہیں لایا جا سکتا

چنانچہ فردوسی خود اس بارے میں یوں اظہار خیال کرتا ہے۔

ز ابیات غرّا دو رہ سی ہزار — مر آنجملہ در شیوۂ کارزار

اُس نے ۶۰ ہزار بیت کہے ہیں، لیکن اب شاہنامہ میں ۵۲ ہزار اشعار ملتے ہیں اور کسی جلد میں بھی ۵۸ ہزار بیت سے زیادہ نہیں ملتے، لیکن ضخیم ترین جلد ۵۲ ہزار بیت والی ہے، کیونکہ شاہنامہ کی دوسری جلدوں میں دوسروں کے شاہناموں کی ابیات اور اسدی کے گرشاسپ نامہ کے اشعار بھی داخل ہوگئے ہیں، اور شاہنامۂ فردوسی کے بعض اشعار حوادث زمانہ کی نذر ہوگئے، اور ہر کسی نے اپنے مذاق کے مطابق شاہنامہ میں بے موقع تصرف کیا ہے۔

ایک بار میں نے پروفیسر تولد کو اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہوئے سنا کہ فردوسی بارگاہ محمودی میں پہونچنے سے پہلے ہی شاہنامہ کو مکمل کر چکا تھا اور جب وہ سلطان محمود کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُس نے دوبارہ شروع سے شاہنامہ لکھنے کا عزم کیا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ فردوسی نے ۴۰۳ ہجری میں سیر الملوک کی تنظیم کی اور جب دربار سلطانی میں پہونچا تو اس شاہنامہ کو مکمل کیا، اسی بنا پر ہم پروفیسر تولد کی رائے سے اتفاق نہیں کرتے۔

یہ معاملہ دو برس سے میرے پیش نظر تھا، ایک شب سفر نامۂ ناصر خسرو مولفہ شعر کا مطالعہ کر رہا تھا تو میں نے پڑھا وہ کہتا ہے، اصفہان میں لنجان کے بوڑھے کھوسٹوں سے میں نے سنا کہ فردوسی نے ایک دوسرے شاہنامہ کی لنجان میں تکمیل کی ہے تو میں نے اس شاہنامہ کی تلاش شروع کردی بعض مثنویات مجھے وہاں کے شیوخ سے ملیں، چونکہ میں اس قابل نہ تھا اور نہ ہوں کہ فردوسی کے اشعار کے بارے میں فیصلہ دوں سو اس مسئلہ کا حل میرے لئے ایک معمہ بن گیا، میں نے اُس وقت کے ایک ادیب بزرگ سے پوچھا، تو اُس نے اس خیال کی تردید کی، ناصر خسرو اس بارے میں دوسروں کا قول نقل کرتا ہے لیکن اپنی ذاتی رائے کو ظاہر نہیں کرتا، سو اگر فردوسی نے یہ ابیات کہی بھی ہوں، تو اس نے بچپن یا

۱؎ طوسی کو توسی بھی لکھا جاتا ہے۔

کبھی ہوں گی، کیونکہ یہ شاہنامہ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں اور بالکل مثنوی یوسف و زلیخا کی مانند ہیں۔

اب ہم ان موضوعات کو نظر انداز کرتے ہیں، اور فردوسی کی خدمات جلیلہ پر نگاہ دوڑاتے ہیں، اور اس کی عظیم الشان شخصیت پر غور کرتے ہیں

فردوسی نے اگر کوئی ایسی تکالیف اپنی خدمات کے سلسلہ میں نہ اٹھائی ہوتیں تو ملت ایران بھی یکدل و یکجان ہو کر اس کی وفات کے سینکڑوں سال بعد اس کے ہزارویں سالِ تولد پر جشن نہ مناتی۔

فردوسی زبانِ فارسی کا باپ تھا، فردوسی عظمتِ ایران کا شیدائی تھا، فردوسی اقتدارِ ایران کا فدائی تھا، فردوسی وہ شخصیت تھی کہ آج دنیا کے حق شناسوں کی بارگاہ میں ہمیں یہ فخر حاصل ہوا ہے، کہ ہم اس کی ہزارویں سالِ ولادت پر جشن منعقد کر سکے ہیں ؛

فردوسی نے اپنے شاہنامہ کی کمان سے ایک تیر چلایا اور دو چیزوں کو نشانہ بنایا، اول یہ کہ ہمارے مشہور بادشاہوں کو اس نے ہم سے متعارف کرایا، دویم یہ کہ ہماری زبان سے ہم کو آگاہ کیا، ممکن ہے کہ بعض لوگ دعوے کریں کہ فردوسی نے تاریخ کی کوئی خدمت نہیں کی ہے ؛

لیکن اس کا مقصد شعر کہنا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ ہمیں وہ زبانِ فارسی کی عظمت سے آشنا کرائے۔

وہ لوگ جو کہ اس امر کے قایل ہیں کہتے ہیں کہ ہماری پرانی کتب اور عہدِ ساسانی کی یادگاروں کو کیا ہو گیا، آخر کیوں انکا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے ؛

یقیناً ہر زمانہ کے ادبا اور مصنفین نے حسبِ استطاعت اپنے آثار ملی کی حفاظت کا کام کیا ہے ؛

مثال کے طور پر ابن مقفع کو لیجئے، اگر وہ کلیلہ و دمنہ کا عربی میں ترجمہ نہ کرتا تو آج یہ کلیلہ و دمنہ جو کہ پند و عبرت کا خزانہ ہے آج ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوتی ؛

سو اب ہمارا فرض ہے کہ ہم فردوسی کی مزید قدر کریں، کیونکہ اس خوش گو شاعر پر بیک کرشمہ دو کار یا ایک پنتھ اور دو کاج کی مثال صادق آتی ہے ؛

اب میں چاہتا ہوں کہ فردوسی کا اردشیر بابک اور شاہ اسماعیل صفوی سے مقابلہ کروں ؛

بعد ازیں ہمارا وطن عزیز یونانیوں اور وحشی پارتھین کے ہاتھوں لگا، بعد ازیں تاج کیانی ایک مقدونیہ زادہ کو میسر آیا، بعد ازیں سکندر کی معشوقہ نے مستی کے عالم میں مشعل کو اٹھایا اور اعلان کیا کہ اے یونانیو! میں آج رات ایرانیوں کے خرمن زندگی کو انتقام کی آگ سے جلا کر خاک کر ڈالوں گی اور میں آج تختِ جمشیدی کو یونان کی انتقام جوئی کی نذر کر دونگی، بعد ازیں اخلاق و آداب ایرانی مٹ گئے دستِ غیب نمودار ہوا اور خوش فکری، نیک گوئی اور حسنِ کردار کے مظہر یعنی بابک کے بیٹے نے ایران کو زندہ کیا ؛

اس کے بعد ایران لٹیرے مغلوں کے ہتھے چڑھا اور ایران کے اکثر شہر ویران ہو گئے، اور بعد ازیں اس بخاری نے کہا کہ وہ آئے۔ انہوں نے لوٹا اور مار دھاڑ کر کے چلے گئے ؛

بعد ازیں ایران کے فرزند رشید سلطان جلال الدین نے غصہ سے پہاڑوں کا رخ کیا، تب کہیں یہ حق بیس سالہ جوان صفوی کے ہاتھ حقدار کو پہنچا۔

بعد ازیں ایرانیوں نے اپنے اخلاق کو ترک کر دیا تھا، آدابِ ایرانی نابود ہو چکے تھے، انکا مذہب اور انکی زبان یکسر تبدیل ہو چکی تھی اور ایران کا نام مٹ چکا تھا حکیم توسی نے نہر باتر کے کنارے ایران کی شوکتِ پارینہ کی یاد تازہ کی، اپنے دیرینہ اخلاق اور پرانی زبان کو زندہ کیا۔ ایرانی مدتِ دراز سے اپنے اس محسن کے قدرشناس تھے، لیکن حوادثِ زمانہ ان جذبات کو آشکار کرنے میں مانع ثابت ہوئے حتےٰ کہ ایک ایرانی نژاد طاقتور اور دلیر سپوت کی خاص توجہ سے اور اس کی رہنمائی میں فردوسی کا ہزارواں سالِ ولادت بڑی دھوم دھام سے منایا گیا ؛

اے حکیم طوسی! اے شاعر فرزانہ! تیرے لئے ایک پیام ہے اگر محمود کے زمانہ کے لوگوں نے تیری قدر نہیں کی اور کل تک تیرے شاہنامہ کی عظمت کو نہیں پہچانا اور تجھے اذیت دینے کی کوشش کرتے

رہے، تو آج ملتِ ایرانی نے خوشی خوشی تیرے ہزارویں سال ولادت پر ایک جشن برپا کیا ہے :

اے حکیم توسی! تیرے لئے ہاں تیرے لئے جو کہ تاریخ پارینہ کا زندہ کرنے والا تھا، ایک پیام ہے، اگر حسن تیمندی نے سلطان محمود کو تیرے خلاف بھڑکایا، تو اس کے بدلہ میں ہاں اے محی لسان ایرانی! اعلیحضرت ہمایوں شاہنشاہ ایران نے ہزار سال کے بعد تیری قدردانی کر کے اس کی تلافی کر دی ہے، اگر محمود ناراض ہو گیا اور کہہ بیٹھا کہ میں اس قرمطی کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلوا دونگا، تاکہ یہ سزا تمام بے دینوں کیلئے عبرت کا موجب ہو تو اب بھی فخر تیرے لئے کافی ہے کہ ہز مجسٹی شاہ ایران طہران سے خراسان تشریف لائے محض اس لئے کہ وہ تیری آخری آرامگاہ کی زیارت کر سکیں اور انہوں نے تیرے ہزارویں سالِ ولادت کے جشنِ پرشکوہ کو منعقد کر کے دنیا کے ایران پرستوں کو سربلند کیا۔

تیری روح خوش ہے اور تیرا نام نیک مدام زندہ رہے :

(ترجمہ از پارسی)

حشرِ جذبات

(از شاعر سحر طراز حضرت ثاقب کانپوری)

نظارہ تیرے حسن کا کیا کام کر گیا — جذبات حسن و عشق سے پیمانہ بھر گیا
انداز جلوہ تیرا سمجھنا محال ہے — محفل سے تیری جو گیا وہ بے خبر گیا
اب منزلِ حیات کی دشواریاں نہ پوچھ — یعنی نشانِ راہرو رہ گزر گیا
اُس کے حریم ناز میں پہونچا ہے لیکے جذب — اب سجدۂ شبانۂ دیوار و در گیا
اُس طائرِ غریب کی ہمت پہ آفریں — اُڑ کر جو صحن باغ میں بے بال و پر گیا
تھیں بجلیاں وجودِ نشیمن کے ساتھ ساتھ — مٹتے ہی آشیاں کے وہ رقصِ شرر گیا
اب یاد کر رہا ہوں کہ کتنا حسین تھا — وہ ایک لمحہ جو مجھے برباد کر گیا
نالوں سے جس کے بزم طرب تھی اُداس سی — وہ غم کشِ فراق ترا آج مر گیا
وابستہ تھی شباب کے دامن سے زندگی — لیکن وہ لطفِ منظرِ شام و سحر گیا

وہ نشۂ خودی کہ جو ثاقب کو تھا کبھی
حسرت کے شعر دیکھ کے سر سے اُتر گیا

دربارِ شاہانِ اودھ

(از جناب خواجہ محمد عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

ہندوستان کی سرزمین سوادِ اعظم کے نام سے مشہور رہے، اور ملکوں پر اس کو اس لئے ترجیح ہے کہ حضرت آدمؑ بہشت چھوڑ کر ہندوستان کی زمین پہ آئے جہاں سردی گرمی برسات ہر فصل اعتدال سے ہوتی ہے، ہندوستان میں بھی اودھ ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کو گلشنِ ہند کے لقب سے یاد کرتے ہیں، اس مضمون میں ہم دربار اودھ کی جھلک دکھانا چاہتے ہیں، شاہان اودھ کے دربار کی کیفیت کا بیان دلچسپی سے خالی نہو گا :

(۱) شاہی محل کی عالیشان عمارت کے وسط میں صدر مقام پر ایک نفیس بارہ دری بنی ہوئی اور شیشہ آلات سے سجی ہوئی ہے نفیس نفیس جھاڑ، نازک نازک دیوارگیریاں قلمی تصویریں، خوشخط قطعے لگے ہیں، کمروں میں تمام کا فرش بچھا ہے، سنہری، روپہلی چلمنیں زربفت کے پردے پڑے ہیں، بارہ دری کے سامنے پر فضا چمن لگا ہے، سنگ مرمر کی نہریں جن میں فوارے چھوٹ رہے ہیں، شہ نشین میں صدر مقام پر کارچوبی گاؤ تکئے لگائے ہوئے حضرت شاہ نصیر الدین حیدر بادشاہ غازی جلوہ افروز ہیں، ان کے پہلو میں بڑے تزک و احتشام سے نواب ملکہ زمانیہ بیٹھی ہیں، گرداگرد خواصیں ماہتاب کے ہالے کی طرح، اردلی کی خواص چنور اور مورچھل جھل رہی ہے، ڈومنیاں مع سازندہ عورتوں کے بھاؤ بتا بتا کر سریلے سروں میں گا رہی ہیں، کوئی چیخ کر بات نہیں کر سکتا نظر سے نظر ملانے کا حکم نہیں ہے، کسی کو کھنکھارنے کا حکم نہیں ہے، جو شخص جو کچھ کہتا ہے، آتوجی سر جھکا کر با ادب عرض کرتے ہیں، اتنے میں داروغہ ڈیوڑھی نے خبر بھجوائی، کوئی بی حسینی خانم ہیں جن کو آتوجی نے محل کی ملازمت کیلئے طلب فرمایا تھا، وہ ڈولی میں آئی ہیں، کیا حکم ہوتا ہے، ڈولی ترو ابجائے یا نہیں؟

آتوجی نے کہا، ہاں ہاں مجھ سے بیگم صاحبہ نے فرمایا تھا، ایک چٹھی نویسنی کے لئے۔

آنے دو۔ باہر سے ایک خواجہ سرا ہمراہ آیا، بی حسینی خانم کی سٹی بھول گئی، یا الٰہی کس طرف جاؤں چاروں طرف اچھی پوشاک والی بیبیاں بڑے ٹھسّے سے بیٹھی ہیں، پہلے تو اتا کہ دیکھ کر سمجھیں، شاید یہی بادشاہ بیگم ہیں، جھک کر سلام کیا، خواجہ سرا نے کہا آگے چلو، اب یہ قدم قدم پر فرشی سلام کرتی ہیں، اتنے میں دور سے آتوجی آتے ہوئے دکھائی دیں، ان کی جان میں آئی، انہوں نے کہا چلو ہم تو تمہارا راستہ دیکھ رہے تھے، بیگم صاحبہ سے تمہارا ذکر کر چکے ہیں، غرض سارے محل کے صدقے ہوتی ہوئی بارہ دری کے زینہ سے تہ خانہ کے اندر آ تریں محلدار ساتھ ساتھ ہوئی، محلدار نے کہا، سامنے بادشاہ اور بیگم بیٹھے ہیں، ذرا ادب قاعدہ سے پھر آگے بڑھ کر عرض کیا، سرکار عالیہ کے فرمان سے بی حسینی خانم حاضر ہیں نگہ رو برو حسینی خانم نے نہایت ادب قاعدہ سے سلام کیا اور بادشاہ کی خدمت میں اپنا لکھا ہوا خوشخط قطعہ نذر میں پیش کیا اور بیگم صاحبہ کو پانچ اشرفیاں نذر میں دکھائیں، بیگم صاحبہ کے اشارے سے قطعہ اور اشرفیاں آتوجی نے قبول کرلیں، بیگم صاحبہ نے بیٹھنے کا حکم دیا، اور سرفرازی کا خلعت منگوایا، لونڈیاں دوڑتی ہوئی بھاری خلعت کی کشتیاں لے کر حاضر ہوئیں، ایک دوشالہ بھاری، ایک رومال

سنہری جالدار، ایک تھان کمخواب، ایک تھان سرخ اطلس کا، ڈھاکہ کی جامدانی بنارسی دوپٹے، مشروع کے دو تھان اور سونے کے کڑے مرحمت ہوئے، بادشاہ نے ایک ہزار روپیہ کا توڑہ منگوا کر انعام دیا، اور پچاس روپیہ ماہوار پرچٹھی نویسوں میں اسم ہو گیا، دو گھنٹہ یہاں دل بہلا کر بادشاہ سلامت نے بوجہ طلب فرمایا، کہاریاں سواری لے کر حاضر ہوئیں، حضور سوار ہوئے، ڈیوڑھی کے باہر کہاروں نے کاندھا دیا، حضور دربار میں تشریف لائے، دربار کی کوٹھی رمنہ میں فرح بخش کے نام سے مشہور تھی، تخت شاہی یہیں رہتا تھا، جب سواری مع ماہی مراتب اور جلوس کے کوٹھی تک پہنچی، سارے عملہ نے سرو قد ہو کر سلامی دی، معتمد الدولہ، آغا میر وزیر، ظفر الدولہ کپتان، فتح علی خاں بہادر، اقبال الدولہ، مکرم الدولہ، مجاہد الدولہ، میر محمد سررشتہ دار عدالت، نواب روشن الدولہ، افتخار الدولہ، مہاراجہ میوہ رام، راجہ امرت لال عرض بیگی، مرزا کیوان جاہ نے باری باری سے مجرا کیا اور اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، بادشاہ نے تخت شاہی پر جلوس فرمایا خدام داہنے بائیں چنور لئے کھڑے ہیں، پشت پر ایک خواص چھتر لگائے ہوئے ہے، درباری لوگ بہت ادب قاعدے سے بیٹھے ہوئے نگاہیں نیچی کئے ہوئے، خاموشی کا عالم پہلے معتمد الدولہ، آغا میر نے ضروری کاغذات پیش کئے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئے، حضور نے بعد ملاحظہ دریافت طلب باتیں پوچھ کر دستخط فرمائے، پھر مقدمات عدالت پیش ہوئے روبکاری سماعت فرما کر حکم احکام جاری کئے، اتنے میں مردھے نے عرض کیا، شاہ عالم، عالمیاں نگاہ روبرو، نواب عاشق علی حاضر ہوا آپ نے اشارہ فرمایا، داروغہ ڈیوڑھی نے کہا۔ آنے دو، بادشاہ نے طلب فرمایا ہے، چوبدار نے آواز دی، نواب عاشق حاضر ہے، نگاہ روبرو، پہلی ڈیوڑھی کے چوبدار نے کہا کہ سب چوبداری کے بعد دیگرے آواز دینے لگے، اس کے بعد رستم علی مردھے نے بھی آواز دی، نواب عاشق علی پھاٹک سے دو طرفہ سلام کرتے ہوئے جھکے چلے آتے ہیں، دربار کے رعب سے کانپ رہے ہیں، راجہ امرت لال عرض بیگی نے ان کو سامنے لے جا کر عرض کیا، ملاحظہ ہو، نواب عاشق حاضر ہے، نواب نے زمیں دوز ہو کر مجرا کیا، دس اشرفیاں نذر میں پیش کیں، حضور نے اشارے سے قبول کریں۔

۲۴- جنوری ۱۸۲۸ء کو پیش ہوئے، نذر قبول ہوئی اسی روز خلعتِ سرفرازی ہوا، پانچسو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی اور عہدہ سفارت مرحمت ہوا، اسی روز کلکتہ جانے کا حکم ملا، تین لاکھ نقد روپیہ سرکار سے واسطے ضروریات کے مرحمت ہوا، اسی طرح نجم الدولہ جعفر علی خاں ابن مظفر علی خاں گوالیار سے آئے بادشاہ نے بہت مرحمت فرمائی اور عہدہ توپخانہ سلطانی عنایت ہوا، پانچسو روپیہ مہینہ مقرر ہوا، نواب سعادت علی خاں قبل طلوع آفتاب کے دربار سواری کا فرماتے تھے، عرب اور جنگل کے تال میل سے خانہ زاد گھوڑے تھے، محل سے بوجہ پر سوار ہو کر برآمد ہوئے اور گھوڑے پر سوار ہوئے، اسوقت آپ لباس انگریزی ولایتی ڈاب زیر کمر کئے ہوئے اور سیاہ مغلی ٹوپی دیئے ہوئے تھے، پہلے سلام مرشدزادوں کا ہوتا تھا، اس کے بعد امراء خاص کا دو گھڑی میں ہوا خوری سے فراغت کرکے ہاتھی پر مع جلوس سوار ہوتے تھے، سواری مع جلوس مع ڈنکا نشان ہوتی، امرائے دولت ہاتھیوں پر سوار ہمراہ ہوتے تھے، خاص بردار چنور لئے ہوئے چوبدار سواری کے دائیں بائیں ساتھ ہوتے تھے، مرزا کریم بیگ محمد غلامی سوار انگریزی پوشاک میں آگے آگے ہوتے تھے، بیس سوار اور اور بیس پیدل روزانہ اہتمام سواری کرتے تھے، اور کل اہتمام نواب انتظام الدولہ مظفر علی خاں کے سپرد تھا، نواب اشرف الدولہ، رمضان علی خاں، مرزا اشرف علی بھی ہمراہ ہوتے تھے، روزانہ پہرہ چوکی پر بائیس سوار آدمی مختلف فرقے کے ملازم تھے۔ ان میں دو سوار بھی تھے، دربار سواری کی بھی شان تھی، امرا در دولت سے رخصت ہو جاتے تھے۔ نو بجے صبح کو چار پانی ہوتا تھا، کرسی نشین امراء مقربانِ خاص صمصام الدولہ، مرزا انجو، مرزا محمد تقی خاں ہوس پہلو میں مکلوٹ صاحب ڈاکٹر لا صاحب خاص کرسی کی پشت پر بیٹھتے تھے، میر انشاء اللہ خاں، میر ابو القاسم خاں بہاج الدولہ معززین خواجہ سرا باریاب سلام ہوتے تھے، سلام کا قاعدہ یہ تھا کہ مردھا پہلے عرض خدمت کرتا تھا، پھر عرض بیگی اپنے سامنے پیش کرکے ادب قاعدے سے سلام کراتا تھا، اس میں بہت دیر موقع محل دیکھنے میں ہو جاتی تھی، ایک

دربار وقت خاصے کے ہوتا تھا جس میں مقربان خاص اردلی و نواب جلال الدولہ، مہدی علی خاں، رکن الدولہ، نواب محمد حسن خاں شریک خاصہ ہوتے تھے، اس کے بعد حضور محل میں تشریف لے جاتے تھے، بارہ بجے برآمد ہوتے، کچہری فرماتے تھے، کاغذات ملاحظہ ہوتے تھے، نواب نصیر الدولہ تمام رپورٹیں ایک بند لفافہ میں رکھ کر پیش کرتے تھے، نواب شمس الدولہ بھی کاغذات بند لفافہ میں پیش کرتے تھے، اور آپ علیحدہ کمرہ میں حاضر رہتے تھے، اسی طرح نواب منتظم الدولہ، مہدی علیخاں وزیر راجہ دیاکرشن رائے رتن چند صاحب اخبار رائے رام، اخبار نویس، خفیہ منشی رونق علی، منشی دانش علی اپنے اپنے لفافے میز پر رکھ کر علیحدہ بیٹھتے تھے، استفسار کے لئے بلائے جاتے تھے، جناب عالی لفافے ملاحظہ فرما کر ضروری کاغذات پر دستخط فرماتے تھے، اور جو قابل داخل دفتر ہوتے تھے وہ طشت آب میں ڈالدیئے جاتے تھے، انکا ایک ایک حرف دھو ڈالا جاتا تھا، جس کاغذ پر مہر خاص کرنا ہوتی تھی، ظفر الدولہ سامنے حضور کے مہر کرتے تھے جو کاغذ باقی رہ جاتے تھے، رات کو ملاحظہ فرماتے تھے، پرچہ اخبار ہر وقت گذر سکتا تھا، بعد دستخط تمام کاغذ ہر دفتر میں بھجوا دیئے جاتے تھے، اور اسی روز تمام حکم احکام جاری ہوتے تھے، وقت شام دو اسپہ گاڑی پر سوار ہو کر ہوا خوری کو نکلتے تھے، جلوس سواری میں راجہ بختاور سنگھ کا رسالہ ترک سواران ہمراہ ہوتا تھا، کبھی تامدان پر تشریف فرما ہوتے تھے، اکثر گنج میں جاکر نرخ غلہ کا دریافت کرتے تھے کہ رعایا کو گرانی غلہ سے تکلیف نہ ہو۔ بقال اس خوف سے اناج مہنگا نہیں کر سکتے تھے، اس وقت دو پیسہ سیر آٹا بکتا تھا۔

(۳) نواب غازی الدین حیدر، ایک بسنتی دربار بسنت کے موسم میں کرتے تھے، یہ دربار موتی محل اور شاہ منزل خاص میں ہوتا تھا، جس میں ہر فرقہ کے لوگ جمع ہوتے تھے، آپ کے دربار کا طریقہ یہ تھا کہ صبح نو بجے در دولت سے کوٹھی فرح بخش میں جلوس فرماتے تھے، کنارہ نہر بینڈ باجے سے سلامی ہوتی تھی، جب تخت شاہی پر متمکن ہوتے دو چنور بردار مورچھل ہلاتے تھے، پہلے صاحبزادے سلام کو آتے تھے، پھر بھائی نواب نصیر الدولہ کاظم علی خاں، جعفر علی خاں، حسین علی خاں، مہدی علی خاں، کلب علی خاں، نہایت ادب سے اپنی اپنی کرسی کے پاس کھڑے رہتے تھے، جب بادشاہ بہ اشارہ ابرو سلام قبول کرتے تو اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے بائیں طرف ڈاکٹر مکلوڈ صاحب بیٹھتے جن سے فارسی میں بات چیت ہوتی، کمرے کے ایک گوشہ میں ایک انگریز مشک بجاتا تھا جو بہت سریلی ہوتی تھی، رجب علی، افضل علی خیال گاتے تھے، سہرو بائی دکن کی رہنے والی نے غضب کی آواز پائی تھی، جب صبح کے وقت گاتی تھی

اے نسیم سحر آرام گہہ یار کجاست

سب کو وجد ہو جاتا تھا اور جھومنے لگتے تھے، حضور مکلوڈ صاحب کی کیفیت کچھ نہ پوچھئے، جناب عالی کے سامنے ایک قد آدم آئینہ وسط میز پر رکھا جاتا تھا، آئینہ کے سامنے ایک بلوریں جھاڑ تھا، جس کے ہر پیالے میں دھنیا، الائچی، مسالہ وغیرہ خوشنمائی سے چنا جاتا تھا، میز پر انگریزی اور ہندوستانی عمدہ عمدہ کھانے چنے جاتے تھے، اور گلدستے لگائے جاتے تھے، اہل دربار وہاں بیٹھ کر کھاتے پیتے اور آپس میں مذاق کرتے تھے تمام مجرائی لال پردے کے باہر بیٹھے رہتے تھے، جب حکم ہوتا تھا، سلام کو حاضر ہوتے تھے، نجم الدولہ، رائے امرت لال، شیخ فتح علی سلام کر آتے تھے، اس کے بعد یہ دربار برخاست ہوتا اور جناب محل سرا میں تشریف لے جاتے تھے

(۴) ابو الفتح معین الدین سلطان الزماں محمد علی شاہ جن کا مزار امام باڑہ حسین آباد مبارک میں ہے، بوجہ کبرسنی کے ان کے ہاتھ پاؤں رہ گئے تھے، دربار کی صورت یہ تھی کہ آٹھ بجے برآمد ہوتے سونے کی پلنگڑی پر اجلاس فرمایا، شہزادے امراء، اہل دربار باریاب سلام ہوئے، نو بجے دربار برخاست ہوا، کچہری کے کاغذات عملہ نے پیش کئے، دوپہر تک دستخط ہوا کئے، دوپہر کو خاصہ چنا گیا (خود معذور تھے) رفیق الدولہ نے خاصہ کھلایا ایک گھنٹہ قیلولہ فرمایا، پھر خفیہ رپورٹیں سماعت کیں، قریب شام تامدان میں سوار ہو کر نواب ملکہ جہاں کے محل میں تشریف لے گئے۔

ثریا جاہ حضرت سلطان زماں امجد علی شاہ کا طریق دربار یہ تھا کہ صبح کو بوجہ خاص پر محل سے برآمد ہوتے، مع مختصر جلوس کے ہوا خوری کو

تشریف لے گئے آٹھ بجے دربار میں آئے، سب امراء دولت نے حاضر ہو کر سلام کیا، اپنے اپنے قاعدے سے بیٹھ گئے، مقربین خاص نے اپنی اپنی تقریر خوش محظوظ فرمایا، انعام و اکرام ہوئے، درباری لوگ رخصت ہوئے، عدالت کے کاغذات ملکی و مالی پیش ہوئے، بارہ بجے کے بعد محلسرا تشریف لے جاتے تھے، سہ پہر کو مدیرالدولہ محل سرائے میں حاضر ہو کر کاغذات پیش کرتے تھے شام کو پھر سوار ہو کر شہر کی حالت معائنہ فرماتے تھے، کبھی مدرسہ سلطانیہ میں تشریف لے جاتے تھے، جسے خود قائم کیا تھا، اس مدرسہ میں کئی ہزار لڑکا پڑھتا تھا، فی کس پانچ روپیہ ماہوار سرکار سے ملتا تھا، ایک ایک مدرس بیس بیس لڑکوں کو تعلیم دیتا تھا، آٹھ بجے سے چار بجے تک مدرسہ کھلا رہتا تھا ؛

(۵) حضرت سلطان عالم محمد واجد علی شاہ نے کوٹھی فرح بخش قدیم بیت السلطنت شاہی کو چھوڑ دیا، اور اپنا دربار شہنشاہ منزل میں قائم کیا، کوٹھی فرح بخش میں محض اتوار کو دربار ہوتا تھا، تمام شہزادے امراء دولت، رفقاء حاضر رہتے تھے، بادشاہ تشریف لا کر دس بجے تک قیام فرماتے تھے، عدالت کا دربار روزانہ ہوتا تھا، نو بجے نواب امین الدولہ مہاراجہ مدیرالدولہ اور تدبیرالدولہ اہل دفتر خاص دولت خانہ قدیم (در دولت) پر تشریف لاتے تھے، دوپہر تک ملاحظہ کاغذات میں مصروف رہتے تھے، دوپہر کے بعد تخلیہ ہو جاتا، جب بادشاہ کی سواری شہر میں نکلتی تھی، چاندی کے مکلف صندوقچے سواری خاص کے داہنے بائیں دو ترک سوار لئے ہوتے تھے، ان صندوقچوں کا نام مشغلہ نوشیروانی تھا، عام لوگوں کو حکم تھا جس کسی کو کوئی خاص استغاثہ کرنا ہو (جس کی سماعت سرکاری عملے نے خلاف انصاف کی ہو) اپنی درخواست اس صندوقچہ میں ڈال دے، حضور خود ملاحظہ کر کے بلا ؤ رعایت احکام صادر فرماتے تھے، اس سے عملے کو مجبور ہو کر رعایا کے حقوق کی حفاظت کرنا پڑتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کر بادشاہ تک استغاثہ جائے ؛

چشمۂ زندگی

جتنا زیادہ عرصہ تک ہم زندہ رہتے ہیں، اتنی ہی
زندگی کی آئندہ منزلیں مختصر معلوم ہوتی ہیں
بچپن میں ایک دن ایک سال کے برابر معلوم ہوتا ہے
اور ایک سال ایک مدتِ دراز معلوم ہوتی ہے
ہمارے عہدِ شباب کی پُرخروش و فرحت افزا روانی
ابتدائی جذبات جو ابھی غیر منتظم و منتشر ہوتے ہیں۔
خراماں خراماں زندگی کے سرسبز دامنوں کو مس کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں
لیکن جب "غم روزگار" سے سرخ و دمکتے ہوئے رخسارے ماند پڑ جاتے
ہیں، اور رنج و مصائب کے تیروں کی بارش زیادہ ہونے لگتی ہے
تو اے وہ ستارے جس پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔
تیری منزلوں کی راہ مختصر کیوں معلوم ہوتی ہے؟

جب خوشی و شادمانی میں کیف و سرور باقی نہیں رہتا
اور زندگی خود بے مزہ ہو جاتی ہے۔
اور جب ہم موت کے غار کے نزدیک پہونچتے ہیں تو ہم اس کی
لہروں (روانی) کو زیادہ زور دار محسوس کرتے ہیں؟
چاہے یہ انوکھی ہی کیوں نہ ہو، لیکن اسکو بدل کون سکتا ہے؟
وقت کی سبک روانی کو کون دھیما اور سست کر سکتا ہے؟ جب یک ایک کر کے
ہمارے سارے رفیق و غمگسار رخصت ہو گئے، اور ہمارے دلوں کو داغ دے گئے۔
قدرت ہماری ضعیف و ناتواں عمر کے آخری سالوں میں سبک سیری پیدا کر دیتی ہے
اور عہد شباب میں جو خواب سے زیادہ نہیں ہوتا، اسی مناسبت سے شیرینی و
حلاوت پیدا کر دیتی ہے ؛ (کیمپبل)

اثر - فتحپوری - بی - اے (علیگ)

ڈرامہ:-

ایک لطیف طربیہ

از جناب الیاس صاحب۔ بی اے، سوجانپوری

[اردو دان طبقہ انگریزی، فرانسیسی اور روسی ڈرامہ نویسوں سے واقف ہو چکا ہے مگر پھر بھی بہت سے ذیل کے ڈرامہ کے مصنف سے ناآشنا ہوں گے یہ ڈرامہ دورِ حاضر کے مشہور ڈرامہ نویس مسٹر جان برین ڈین کی قوتِ فکر کا نتیجہ ہے، موصوف اسکاٹلینڈ کے باشندہ ہیں اور گلاسگو میں رہتے ہیں۔ آپ کی تاریخ ولادت ۱۸۶۹ء ہے۔ آپ متعدد ناولوں اور ڈراموں کے مصنف ہیں ۱۹۱۹ء میں جب آپ کا ناول مائی لیڈی آف اراس (My Lady of Arros) شائع ہوا تو آپ کی شہرت ساحلِ انگلینڈ سے نکل کر دوسرے ممالک میں بھی پہنچی۔ (The Glen is Mine) آپ کا طربیہ ڈرامہ ہے جو کہ مسٹر جان برین ڈین کا شاہکار خیال کیا جاتا ہے۔ "متذکرہ بالا روری" ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا، جو کہ بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اس کا شمار بہترین لطیف طربیہ میں ہوتا ہے۔

قبل اس کے کہ ڈرامہ شروع کیا جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے کہ چند سطور میں لطیف طربیہ (Lighter Comedy) پر روشنی ڈالی جائے لطیف طربیہ، مزاحیہ طربیہ (Farce) سے بہت زیادہ مشابہ ہے دونوں میں بہت کم فرق ہے۔ دونوں کا مقصد خوش کرنا اور ہنسانا ہے مگر لطیف طربیہ میں مصنف بہ نسبت مزاحیہ طربیہ کے زیادہ سنجیدہ ہوتا ہے، مزاحیہ طربیہ میں قہقہہ اور ہنسی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ مگر لطیف طربیہ میں ڈرامہ نویس اکثر سنجیدہ اور متین ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں لطیف طربیہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی قدر حقیقت نگاری ہوتی ہے مصنف انسان کی معمولی غلطیوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور ان میں مبالغہ کی رنگ آمیزی کر کے ایک لطف پیدا کر دیتا ہے، برخلاف اس کے مزاحیہ طربیہ کو حقیقت نگاری سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے :

ذیل کا ڈرامہ "متذکرہ بالا روری" لطیف طربیہ ہے جس میں مصنف نے انسان کی معمولی لغزشوں سے فائدہ اٹھا کر نہایت لطیف چیز تصنیف کی ہے:-

الیاس سوجانپوری]

کردار ڈرامہ

میکاپچی .... کورٹ آفیسر

ڈگلن میک کالم .... تاجر اور کاشتکار

روری میک کال ..... میک کالم کا گڈریہ

مسٹر میکن ٹاش .... اوین کا وکیل

.... منصف

مسز میک لین .... ایک بیوہ عورت

سین

ٹارلوکین کی کچہری ایک وسیع کمرہ جس کی دیواریں نئی قلعی کردہ ہیں اور جس کے نچلے حصہ میں چوبی تختے جڑے ہوئے ہیں، پس پشت دیوار میں دو کھڑکیاں ہیں جن کے درمیان میں ایک دروازہ ہے بائیں جانب ایک مرتفع چبوترے پر منصف کی میز ہے اور برابر میں پیشکار کی میز بھی پڑی ہے، دائیں جانب عوام کیلئے تپائیاں رکھی ہوئی ہیں، وسط کمرہ میں مقدمہ دائر کرنیوالوں کے لئے بگ بنی ہوتی ہے جہاں کرسیاں پڑی ہیں

مصنف کے اور راست جانب پڑی ہوئی میز کے درمیان
گواہان کے لئے جگہ ہے، ڈنکن میک کالم تاجر وکاشتکار ہے
وہ آرڈ تیس سے آیا ہے اور خالی کمرہ میں ٹہل رہا ہے تاکہ کوبر کی
سرد ہوا سے محفوظ رہ کر کچھ گرما جائے وہ گو ساٹھ سالہ ہے اس کے.
بال کھچڑی ہیں مگر پھر بھی وہ مضبوط آدمی ہے وہ ٹوپ پہنے ہوئے
ہے اور گلوبند اس کے موٹے کوٹ کے کالر کے چاروں طرف
لپٹا ہے، میکانچی نامی کورٹ افیسر اندر داخل ہوتا ہے -
میکانچی پچاس سالہ بوڑھا آدمی ہے اس کے چندے سر پر جو کچھ
تھوڑے بال رہ گئے تھے، شانہ کردہ تھے، مانگ نکلی ہوئی تھی
وہ سیاہ ٹائی باندھے ہوئے تھا اس کے شاندار کوٹ سے ظاہر
تھا کہ وہ کوئی افیسر ہے ؞

کورٹ افیسر - مسٹر میک کالم یہاں تو بہت سردی ہے انگیٹھی کے پاس ویٹنگ
روم میں چلئے -

میک کالم - نہیں نہیں، میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں میں یہاں کی فضا کا
عادی ہونا چاہتا ہوں، میں پریشان ہوں وطن سے چالیس میل کے
فاصلہ پر ہوں میں تو ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے ماہئی بے آب -

کورٹ آفیسر - اونہ - پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے -

میک کالم - (کورٹ افیسر کے ہاتھ میں پیلے رنگ کا کاغذ دیکھتا ہے) کتنے بہت سے
الفاظ "مذکور" اور "متذکرہ بالا" یہ لوگ سمن میں ٹھونس دیتے ہیں -

کورٹ آفیسر - ہاں - یہ ایک اصول وقاعدہ ہے سمجھے نہ آپ جبکہ کوئی وکیل
تقریر کرتا ہوتا ہے تو اسے بڑی مسرت ہوتی ہے جب وہ لفظ "متذکرہ بالا"
بار بار کہتا ہے :-

میک کالم - آپ نے اب بتایا میں نے تو اس سے قبل کبھی خیال ہی نہیں کیا (وہ پڑھتا
ہے) "متذکرہ بالا بھیڑ" ہاں ہاں ٹھیک تو ہے اگر اس طریقہ سے کہا گیا تو
آپ خیال کرینگے کہ کوئی خاص بھیڑ ہے، مجھے تو حیرت ہے کہ آیا میں بھی
بوقت پیشی الفاظ کا استعمال کرسکونگا" ۔ روری میک کالی متذکرہ بالا"
بس بس ٹھیک ہے -

کورٹ آفیسر - اجی کہیں کچھ اور بیہودہ مت بک دینا -

میک کالم - جو کچھ کہ مجھے منصف کے سامنے کہنا ہے ابھی اپنے دماغ میں دہرا
لیتا ہوں اور پھر جب منصف صاحب تشریف لائیں گے تو مجھے کوئی
دقت نہ ہوگی ہاں یہ تو بتایئے شہادت کا کٹھرہ یہی ہے نہ
[وہ گواہان کے کٹھرہ میں جاتا ہے]

کورٹ آفیسر - ہاں یہی ہے -

میک کالم - کچھ حرج تو نہ ہوگا اگر میں چند ثانیہ کے لئے اس میں کھڑا ہو جاؤں
تاکہ اندازہ کرلوں کہ وقت ضرورت میں کیا محسوس کرونگا -

کورٹ آفیسر - کوئی حرج نہیں مسٹر میک کالم آپ شوق سے اندر جایئے

میک کالم - آپ نہایت ہی مہربان ہیں - بہت ہی زیادہ نیک ہیں -
[وہ گواہان کے کٹھرہ میں جاتا ہے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھاتا ہے، حلف کے
الفاظ ادا کرتا ہے مسکراتا ہے جھکتا ہے اور نیچے اتر آتا ہے] بس بس ٹھیک
ہے میں خوب بولوں گا اگر میرا وکیل میرے ساتھ ہوتا تو میں طمانیت
قلب اور بھی زیادہ محسوس کرتا -

کورٹ آفیسر - ائیں تو کیا مقدمہ کی پیروی کے لئے آپ کا کوئی وکیل نہیں ہے

میک کالم - میں مسٹر تھامسن کو اوبن سے لانے والا تھا وہ تھامسن جو جوان ہے
ہیں بہت ہی نیک ہیں لیکن دس بجے کا اسٹیمر بوجہ تیز ہوا کے بندرگاہ پہ
نہیں آیا اور راستہ سے دور جا ہٹا، غالب گمان ہے وہ بیچارے میلیگ
پہنچے ہوں گے - یہ تو اچھا ہوا کہ میں شب ہی میں آگیا -

کورٹ آفیسر - بہت برا ہوا مسٹر تھامسن راستے سے ہٹ دور جا پہنچے -

میک کالم - اوہ یہ تو اچھا ہوا کہ وکیل کی فیس بچی - موقعہ آنے دیجئے میں اپنی
خوش اسلوبی سے کام کرونگا جیسے کہ وکیل -

کورٹ آفیسر - ہاں تاہم میں چاہتا ہوں کہ بوقت عدالت ہر شخص کا کیل بھی ہو،

میک کالم۔ لیکن ابھی حضرت وکیل کی ضرورت ہی کیا ہے جبکہ میں نے چشم خود ہے روری کو بھیڑ مارتے دیکھا کتنی اچھی بھیڑ تھی، نوخیز بھیڑ ایسی خوبصورت کہ مسٹر میکاٹچی آپ نے شاید وہ ہی دیکھی ہو، سنتے ہیں آپ.....

کورٹ آفیسر۔ میں سن رہا ہوں بقول آپ کے آپ وطن سے چالیس میل کے فاصلہ پر ہیں۔ میں نے تو اس حصہ میں اس قسم کی کوئی واردات سنی نہیں۔

[پس پشت دروازہ کھلتا ہے اور روری میک کال داخل ہوتا ہے وہ بہاڑی گڈریا ہے، اس کی عمر کوئی ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی، اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی ہے اس کے ایک سرے پر خمیدہ آہنی کانٹا لگا ہوا ہے اس کے داڑھی سے بھرے چہرہ پر آثار کہولت ونقاہت نمایاں ہیں اس کا ملبوس بھی پرانا وخراب ہے اس کی آنکھیں نہایت تیز ہیں اور ہمہ وقت متحرک رہتی ہیں اسے دیکھ کر میک کالم فوراً سے ایک طرف ہٹ جاتا ہے]

روری۔ مسٹر میک کالم آج کا دن نہایت خوشگوار ہے

[میک کالم خاموش رہتا ہے، روری کمرہ کے چاروں طرف اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، جیسے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہے، کورٹ افیسر اس کے پاس جاتا ہے]

کورٹ آفیسر۔ آداب عرض ہے، کہئے کیا آپ بھی مقدمہ میں ماخوذ ہیں

روری۔ ہاں میں ہی وہ شخص ہوں، یہ عمارت نہایت وسیع ہے ہاں یہ تو بتائیے آپ مجھے کب طلب کریں گے۔

[وہ پیلے رنگ کا کاغذ کورٹ افیسر کو دیتا ہے]

کورٹ آفیسر۔ [پڑھتے ہوئے] روری میک کال آوہو یہ آپ ہی ہیں کوئی گیارہ بجے آپ کو نصف گھنٹہ اور انتظار کرنا ہوگا۔

روری۔ نصف گھنٹہ، یہاں کوئی رستوران بھی ہے۔

کورٹ آفیسر۔ وہ کیا سامنے ہے لیکن اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو وہاں نجاتا جبتک کہ میرا مقدمہ طے نہ ہو جاتا۔ ویٹنگ روم چلئے وہاں انگیٹھی بھی ہے۔

روری۔ لیکن رستوران میں بھی تو انگیٹھی ہوگی۔

کورٹ آفیسر۔ میرا خیال ہے کہ آپ جیسے آدمی کے لئے ویٹنگ روم کی انگیٹھی زیادہ مناسب و بہتر ہے۔

روری۔ [سردی سے دانت کٹکٹاتا ہے باہر چلا جاتا ہے] اچھا میں دونوں انگیٹھیوں کو دیکھتا ہوں۔

میک کالم۔ [برہم ہوتے ہوئے] آپ نے کچھ سنا اسکی بدتمیزی کو دیکھا۔ ایک تو میری بھیڑ کو مار ڈالا اور پھر سلام کرتا ہے۔

کورٹ آفیسر۔ وہ ایسا ہی آدمی ہے آپ نے اسپر فوجداری کا مقدمہ کیوں نہیں چلایا۔

میک کالم۔ بیشک مقدمہ فوجداری کے قابل ہے، لیکن میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ پولیس نے فوجداری میں مقدمہ چلانے سے کیوں انکار کیا۔ حالانکہ میں نے پولیس والوں سے بہت کہا مگر پولیس نے یہ جواب دیا کہ شہادت کمزور ہے اور مشورہ دیا کہ میں نقصان کا دعویٰ کروں۔

کورٹ آفیسر۔ ہاں اب تو معمولی مقدمہ ہے۔

میک کالم۔ اور کیا۔ لیکن ذرا دیکھئے کہیں جھوٹا حلف نہ اٹھالیا جائے انتظار کیجئے کہ روری قسم کھاتا ہے یا نہیں وہ بہت لسان واقع ہوا ہے خواہ انگلش ہو یا گیلک وہ جب جھوٹ بولنے پر آتا ہے تو اس کی زبان پھر رکتی نہیں۔

کورٹ آفیسر۔ ہیں۔ تو کیا وہ ایسا ہے۔

میک کالم۔ جی ہاں وہ ایسا ہی ہے آپ دیکھئے تو جیسے ہی روری بولنے کیلئے زبان کو حرکت دے گا، یہاں فوراً بجلی گرے گی۔ اگر ایسا نہ ہو

تو مجھے میک کالم نہ کہے گا۔

کورٹ آفیسر۔ اوہ۔ اگر کذب و دروغ سے بجلیاں گرا کرتیں تو یہ مقام کبھی کا چونے وا ینٹ کا ڈھیر ہو گیا ہوتا۔

میک کالم۔ آپ دیکھ ہی جو لیں گے۔

[مسٹر میکن ٹاش وکیل آ وبن سے آتے ہیں۔ ان کے کندھے پر سیاہ گاؤن پڑا ہوا ہے وہ پنجاہ سالہ ہیں ریش و مونچھیں صاف اور سر بھی بالکل چکنا انکی آنکھیں چھوٹی ہیں جو دوسروں پر استہزا کرتی معلوم ہوتی ہیں]

کورٹ آفیسر۔ خوش آمدید مسٹر میکن ٹاش۔

میکن ٹاش۔ خوش آمدید مسٹر میکانچی ادھر دیکھئے کیا یہ وہی گاؤن ہے جو کوئی ہفتہ ہوا میں یہاں چھوڑ گیا تھا۔

کورٹ آفیسر۔ مجھے افسوس ہے مسٹر میکن ٹاش کوئی دوسرا وکیل آپ کی گاؤن گذشتہ دوشنبہ کو لے گیا ہوگا، یہ وہی ہے نہ۔

میکن ٹاش۔ یہ تو بہت ہی بیہودہ بات ہے۔

[وہ جانے کے لئے پلٹتا ہے]

میک کالم۔ [آگے بڑھتے ہوئے] آداب عرض جناب۔

میکن ٹاش۔ آداب عرض ہے، میرا خیال ہے۔ مجھے جناب سے شرف نیاز مندی حاصل نہیں۔

کورٹ آفیسر۔ آپ مدعی ہیں، آرڈینس کے رہنے والے ہیں اور آپ کا اسم گرامی میک کالم ہے۔

میک کالم۔ درست فرمایا لیکن یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ مجھے بھول گئے آپ نے سال گذشتہ اگست میں میری دوکان سے جو کہ آرڈینس میں ہے۔ اونی گرم کپڑا جسے ہیرس ٹوئیڈ کہتے ہیں۔ لیا تھا۔

میکن ٹاش۔ آرڈینس۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی عمر میں کبھی بھی آرڈینس میں نہیں رہا لیکن ہاں سنتا ہوں کہ جگہ اچھی ہے۔

میک کالم۔ اچھی جگہ ہے، لیکن آپ آرڈینس میں رہے ہیں ہاں ہاں پچھلے سال ہی تو اگست کے مہینے میں مجھے غلط فہمی بھی ہوتی تھی، میں آپ کو میک فارلین ماہی گیر سمجھا تھا جو کہ آرڈینس کے ہوٹل میں رہتا تھا۔

میکن ٹاش۔ ہاں میں ماہی گیر نہیں ہوں مسٹر میک کالم اور میں آرڈینس بھی کبھی نہیں گیا آپ کو غلط فہمی ہوئی۔

میک کالم۔ یہ میں کب کہتا ہوں کہ آپ ماہی گیر ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جس دن آپ نے ٹوئیڈ لی تھی اس دن اوبن سے ایک اسٹیمر آیا ہوا تھا اسوجہ سے اس روز وہاں بہت سے اجنبی آدمی تھے اور آپ بھی انہی میں تھے۔ اس وقت آپ کا نام میکن ٹاش نہ تھا بلکہ میک فارلین اور اسی نام کی وجہ سے میں سمجھا تھا کہ آپ ہوٹل کے ماہی گیر ہیں۔

میکن ٹاش۔ لیکن جناب کیا آپ کو میرے الفاظ پر اعتبار نہیں میں پھر عرض کرتا ہوں کہ میں کبھی آرڈینس نہیں گیا۔

میک کالم۔ ہاں ہاں آپ تھے ایک سال ہوا اگست کے مہینہ میں دس گز ٹوئیڈ لے کر گاڑی میں بیٹھ اسٹیمر میں سوار ہونے کو چل دیئے اور مجھے یہ بعد میں معلوم ہوا کہ ٹوئیڈ کی قیمت تاہنوز ادا نہیں کی گئی ہے، اس دن سے میں نے آپ کو دیکھا بھی نہیں۔

میکن ٹاش۔ کیا آپ مذاق کر رہے ہیں۔

میک کالم۔ مذاق کیسا، کون مذاق کر رہا ہے، خدا کا غضب دس گز ٹوئیڈ اور ایک پیسہ نہیں دیا۔

میکن ٹاش۔ میں آپ سے کہتا ہوں وہ کوئی اور صاحب ہوں گے جنھوں نے آپ سے کپڑا خریدا ہوگا۔

میک کالم۔ میں آپ سے کہتا ہوں کہ کسی کی صورت کو آواز کو میں کبھی نہیں بھولتا، میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ آپ ٹوئیڈ کی

قیمت ادا کر دیجئے جسے آپ سال گذشتہ اگست میں چرالائے تھے

میکن ٹاش - چرالایا چرالایا، مسٹر میکانچی آپ سن رہے ہیں یہ شخص کیا کر رہا ہے - [جیب سے وہ کاغذ پنسل نکالتا ہے کچھ لکھتا ہے] مجھ چوری کا الزام لگاتا ہے میں آپ کو شاہد بناتا ہوں -

کورٹ آفیسر - اور ہیں ہیں مجھے معاف رکھئے میرے لئے یہی کیا کم ہے، کہ دوسرے اشخاص کو گواہان کے کٹھرہ میں کھڑا کرتا ہوں، میری وجہ اپنی شرافت کی خاطر برائے مہربانی آپس ہی میں طے کر لیجئے -

میکن ٹاش - لیکن یہ ایسا معاملہ ہے جسے چھوڑا نہیں جاسکتا، مسٹر میکانچی مجھے ایک منٹ کی اجازت دیجئے [وہ پیچھے کی طرف دروازہ میں جاتا ہے اور پکارتا ہے] مسٹر میک کال [روری داخل ہوتا ہے] مسٹر میک کال ابھی آپ کا مقدمہ نہیں ہے - دوسرا قصہ ہے ویسا ہی اہم [میک کالم چلنے لگتا ہے لیکن میکن ٹاش اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے] ایک لحہ ٹھیرئے جناب عین نوازش ہوگی اگر آپ پھر وہی الفاظ اس شریف شخص کے سامنے دہرادیں وہی الفاظ جو آپ نے میرے متعلق استعمال کئے تھے -

میک کالم - شریف شخص آپ کسے شریف بتارہے ہیں، کیا کہنے - شرافت صورت سے ٹپک رہی ہے -

روری - آپ کس کے منہ لگتے ہیں، ان کی حرکات پر تو گدھوں کو بھی ہنسی آتی ہے -

میکن ٹاش - مسٹر میک کال کچھ پروا نہیں - انہیں وہی الفاظ جو مسٹر میکانچی کی موجودگی میں کہے تھے، کہنے دو -

میک کال - میں کوئی ایسی احمقانہ حرکت نہ کرونگا - کل مرا وکیل آئے گا تو ہیرس ٹوئیڈ اور تمہارے متعلق دیکھ لونگا -

میکن ٹاش - کیسی ہیرس ٹوئیڈ -

میک کال - وہی ہیرس ٹوئیڈ جو پچھلے سال تم میرے یہاں سے چرالائے تھے

میکن ٹاش - جادو چل گیا نا - روری کچھ سنا اس نے کہا "چرالائے"

روری - میں نے سنا اس نے کہا "چرالائے"

میک کالم - میں ایک لحہ بھی ایسے چوروں کے قریب میں ٹھیر سکتا -

روری - ہاں یہ معمولی چور نہیں ہیں، یہ آپ کے مقابلے کے نہیں ہیں

[میک کالم غصہ میں ناراض ہوتا ہوا باہر چلا جاتا ہے]

میک کالم - میں نے چور کہا ہے میں اپنے الفاظ پر قائم رہونگا -

میکن ٹاش - روری دیکھتے ہو اس نے کہا "چور" مسٹر میکانچی آپ نے بھی سنا مہربانی کرکے آپ دونوں صاحبان نوٹ کر لیجئے -

[وہ خود لکھتا ہے]

کورٹ آفیسر - نہیں میں لکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں مجھے اپنا ہی بہت کام کرنا ہے -

میکن ٹاش - [جو ابھی تک لکھ ہی رہا تھا] بہت خوب روری لکھو کہ مسٹر میکانچی لکھنے سے انکار کیا -

روری - اجی لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے، مجھے تو یہ سب یاد رہے گا دوسرے تحریری کام مجھے آتا بھی نہیں ہے -

میکن ٹاش - [نوٹ بک کو غصہ میں بند کرتے ہوئے] یہ بات ہے آخر کیوں میں نے تو آرڈیننس کبھی دیکھا ہی نہیں اچھا اب اسے چنے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا - یہ دیکھ لے گا کس سے مقابلہ ہے،

روری - ہاں ہاں کیوں نہیں لیکن وہ........ میرا مقدمہ - ہاں آپ نے کہا تھا کہ عدالت کے شروع ہونے سے پہلے اچھا مشورہ دیں گے -

میکن ٹاش - یہاں اس کے متعلق گفتگو کرنا کچھ مناسب نہیں ممکن ہے کوئی آجائے ہمارا بہت وقت اس گدھے اور ہیرس ٹوئیڈ میں خراب ہوگیا - [وہ دروازہ کی طرف جاتا ہے پھر واپس ہوتا ہے] ابھی ہم

گواہوں کے کٹہرہ میں نہیں جاسکتے۔ ہاں میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا
اپنا پیر دروازہ میں رکھو۔ [روری ایسا ہی کرتا ہے] شکریہ۔ اب
میں تمہیں چند باتیں بتاتا ہوں [وہ ادھر اُدھر ٹہلتا ہے بڑبڑاتا ہے]
بڈھے بدمعاش نے مجھے چور کہا اچھا دیکھ لونگا اس سے اور اس کی
ہیرس ٹوئیڈ سے نپٹ لونگا۔

روری۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ ہیرس ٹوئیڈ کو چھوڑیئے اور بتایئے کہ اس
بھیڑ کے متعلق جسے میں نے مار ڈالا ہے کیا کہوں۔

میکن ٹاش۔ اچھا تو آپ نے بھیڑ مار ڈالی۔ آپ کہتے تھے کہ گذشتہ شنبہ کو
آپ نے بھیڑ ماری ہے۔

روری۔ ہاں ہاں میں نے کہا تو تھا۔

میکن ٹاش۔ اچھا تو آپ کٹہرہ میں جاکر حلف اٹھالیں گے کہ میں نے
بھیڑ ماری ہے۔

روری۔ ادھر دیکھئے کچھ بھیڑیں بیمار تھیں سخت بیمار۔ انہیں مار ڈالنا
ہی بہتر تھا۔

میکن ٹاش۔ یہ سب میں جانتا ہوں مگر آپ حلف اٹھالیں گے۔
کہ آپ نے میک کالم کی بھیڑ نہیں ماری ہے۔

روری۔ حلف اٹھاؤں۔

میکن ٹاش۔ ہاں۔

روری۔ نہیں۔ میرا بھی مذہب ہے۔ میں حلف نہیں اٹھاؤنگا۔

میکن ٹاش۔ آپ تو کہتے تھے کہ میں نے کوئی بھیڑ نہیں ماری۔

روری۔ [ہچکچاتے ہوئے] نہیں۔

میکن ٹاش۔ تو پھر خدا کو حاضر و ناظر جان کر کیوں نہیں قسم کھالیتے کہ میں نے
کوئی بھیڑ نہیں ماری ہے۔

روری۔ نہیں ایسا نہ ہوگا میں بھی مذہب رکھتا ہوں، آپ سمجھ جایئے
میں حلف اٹھانا بالکل پسند نہیں کرتا۔

میکن ٹاش۔ اچھا تو پھر منصف سے کیا کہو گے

روری۔ میں یہی کہونگا کہ میک کالم نے مجھے بھیڑ مارتے نہیں دیکھا۔

میکن ٹاش۔ لیکن میک کالم تو حلف اٹھالے گا کہ اس نے بچشم خود
بھیڑ مارتے دیکھا۔

روری۔ نہیں وہ رات نہایت تاریک تھی وہ مجھے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا

میکن ٹاش۔ بھلے آدمی اگر کہیں یہ کہدیا تو حضرت مقدمہ ہاتھ سے گیا
روری ادھر دیکھو اگر قسم کھانے کا وعدہ نہ کروگے تو میں اس
مقدمہ سے دست بردار ہوتا ہوں۔

روری۔ مسٹر میکن ٹاش آپ تو بڑے ہوشیار و نیک آدمی ہیں، غریب
روری سے ناراض مت ہوجیئے ادھر دیکھئے [وہ جیب سے ایک
میلا بٹوہ نکالتا ہے] اس نوٹ کو دیکھئے یہ میں نے آپ کے لئے
ہی رکھا ہے لیکن اس وقت جب میں مقدمہ جیت جاؤں۔

میکن ٹاش۔ قبلہ آپ کو فیس ہر حال میں دینا ہوگی خواہ آپ جیتیں یا
ہاریں۔

روری۔ ہارنے پر بھی فیس دینا ہوگی۔ نہیں نہیں۔

میکن ٹاش۔ ادھر دیکھو بوڑھے خرانٹ۔ میں نے تمہاری طرح بہت
دیکھے ہیں۔ ابھی وعدہ کرو کہ مقدمہ ختم ہوتے ہی میں فیس ادا کردونگا
ورنہ ایک بجے کے اسٹیمر سے میں گھر جاتا ہوں۔ بولو۔

روری۔ بہت اچھا جناب وہ شخص جو حصہ کی تقسیم کرتا ہے ہمیشہ نقصان
میں رہتا ہے، میں وعدہ تو کرتا ہوں مگر اس صورت میں کہ مجھے
قسم نہ کھانا پڑے۔

میکن ٹاش۔ تم تو ضدی آدمی ہو منصف اس وقت تک کچھ نہ سنے گا
جب تک کہ تم حلف نہ اٹھاؤ گے۔

روری۔ اگر میں کہوں کہ گلے میں شدت کا درد ہے جس کی وجہ سے بولنے سے
قاصر ہوں۔

میکن ٹاش۔ بالکل ٹھیک، لیکن نہیں اس سے کچھ نہ ہوگا وہ خود قسم کھا کر آپ سے سر کا اشارہ کرنے کو کہے گا۔ آپ یہ کیجئے کہ جب منصف یا کوئی اور کچھ پوچھے تو کوئی احمقانہ جواب جیسے بیجئے سمجھے (طوطے کی طرح) احمقانہ جواب دو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں نہیں ہر مرتبہ نئی بات کہو

روری۔ [طوطے کی طرح] "ہر مرتبہ نئی بات کہو" یہ ٹھیک ہے نہ۔

میکن ٹاش۔ تم تو گدھے ہو مجسم گدھے۔ نہیں نہیں بھولا ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھیڑ ہو بھیڑ۔

روری۔ ہیں! کیا میں بھیڑ ہوں۔

میکن ٹاش۔ ہاں بھیڑ ہو جب کوئی سوال کیا جائے تو ہمیشہ بھیڑ کی طرح جواب دو۔ اس طرح سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ با ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سمجھے۔

روری۔ با۔

میکن ٹاش۔ بہت خوب منصف خیال کرے گا تمہارا دماغ خراب ہے دوئم میک کالم کا کوئی وکیل نہیں اس لئے وہ ضرور گڑبڑا جائیگا آہا ہم خوش قسمت ہیں، آہاہاہا۔

روری۔ آپ ہنستے ہیں یہاں اپنی پڑی ہے اگر کہیں منصف ناراض ہوگیا آپ پھر بھی ہنستے رہیں گے آپ کے قہقہے تو اس وقت بھی جاری رہیں گے جبکہ میرے پھوڑا نکلا ہو اور جسے دبایا جا رہا ہو۔

میکن ٹاش۔ روری مجھے بہت افسوس ہے ناراض مت ہو۔ ہاں یہ بتاؤ میک کالم کا وکیل کون ہے۔ یہ سچ ہے نہ کہ اس کا وکیل دس بجے کے اسٹیمر سے بندر گاہ سے آگے نکل گیا۔

روری۔ یہ صحیح ہے مسٹر ٹھامسن اوبن سے آرہے تھے۔

میکن ٹاش۔ آج تو وہ کسی صورت سے آنہیں سکتے اچھا ہوا میں آٹھ بجے کی کشتی سے آگیا ورنہ جانے کہاں ہوتا۔

روری۔ با۔

میکن ٹاش۔ بہت اچھے تم سچ مچ کے پاگل معلوم ہوگے، میک کالم کے تو ہوش جاتے رہیں گے جب اس سے جرح کرنا شروع کرونگا میں تمہیں یہ تو اور بتا دوں کہ منصف بہت جلدی میں ہوگا وہ سہ شنبہ کو دوپہر کے کھانے سے پہلے ایک جرعہ ضرور نوش کرتا ہے وہ دیکھو کس تیزی سے منصف چلا آرہا ہے۔ [وہ اپنا ہاتھ ملتا ہے باہر دروازہ میں سے کچھ آواز آتی ہے" منصف صاحب آرہے ہیں جلدی کرو" اس دروازہ سے فوراً ہٹ جاؤ"]

[وہ دونوں عدالت کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں]

کورٹ آفیسر۔ [میک کالم کے ساتھ آتا ہے] مسٹر میک کالم کیا آپ براہِ مہربانی یہاں تشریف رکھیں گے۔ [وہ میز کی طرف اشارہ کرتا ہے]

میک کالم۔ شکریہ مسٹر میکانچی۔

[وہ میز پر بیٹھ جاتا ہے، نوٹوں کی گڈی نکالتا ہے اور گنتا ہے میکن ٹاش اس کے سامنے بیٹھتا ہے اور اپنے کاغذات کو دیکھتا ہے]

کورٹ آفیسر۔ [روری سے مخاطب ہو کر] آپ یہاں بیٹھئے۔

[وہ سامنے پڑی ہوئی میز کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کہ منصف کے بالمقابل تھی]

روری۔ با۔

کورٹ آفیسر۔ آپ نے کیا کہا۔

[میک کالم حیرت سے دیکھتا ہے چند تماشہ بین و مقدمہ باز جو قصبہ سے آئے ہوئے تھے اور پیچھے پڑی ہوئی بنچوں پر بیٹھ رہے تھے۔ کورٹ آفیسر باہر جاتا ہے۔ منصف چوغہ (گون)، و ٹوپی پہنے ہوئے داخل ہوتا ہے۔

کورٹ آفیسر۔ عدالت شروع ہوتی ہے۔

[سب استادہ ہو جاتے ہیں منصف کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں کورٹ آفیسر میک کالم کی طرف

اشارہ کرکے منصف سے کچھ کہتا ہے منصف اپنا ہاتھ کان پر لیجاتا ہے

پھر گویا ہوتا ہے۔" اینہہ" کورٹ آفیسر قدرے زور سے بولتا ہے

یہ ظاہر ہے کہ منصف ثقل سماعت رکھتا ہے اوران کا کاغذات کو

گھور گھور کر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضعف بصر بھی ہے اس کی

قسم کی مختلف نقل و حرکت سے ظاہر تھا کہ بینائی کی کمی کے ساتھ

ساتھ آپ سنتے بھی کم ہیں اکثر اوقات منصف کو پتہ تک نہیں لگتا

کون کس سے مخاطب ہو کر گفتگو کر رہا ہے]

منصف۔ آپ بہت ہی بدقسمت ہیں مسٹر میک کالم مجھے یہ معلوم کرکے

بہت افسوس ہوا کہ آپ کا وکیل آج صبح کے طوفان میں بندرگاہ سے

آگے نکل گئے ہیں کیوں صاحب یہ صحیح ہے نہ۔

میک کالم۔ جی حضور، وہ بندرگاہ سے آگے بڑھ گئے۔

منصف۔ میرا خیال ہے کہ آپ خود ہی اپنے مقدمہ کی پیروی کریں گے

میک کالم۔ اگر حضور اجازت دیں۔

[وہ کورٹ آفیسر سے مخاطب ہو کر سر ہلاتا ہے کورٹ آفیسر پچھلے

دروازہ سے باہر جاتا ہے]

کورٹ آفیسر۔ [بلند آواز سے] مسز میک لین۔

[مسز میک لین پہاڑی علاقہ کی مضبوط عورت تھی اس کے بال

سنہری تھے وہ گھبرائی ہوئی تھی اس کا رویہ جنگ جویانہ تھا وہ

گواہوں کے کٹہرے میں داخل ہوتی ہے]

منصف۔ آپ مسز میک لیں اڑدینیس کی رہنے والی ہیں۔

مسز میک لین۔ جی حضور۔

منصف۔ [اپنا داہنا ہاتھ اٹھا کر بتاتے ہوئے] کہو میں خدا کو حاضر و

ناظر کر کے حلف اٹھاتی ہوں۔

مسز میک لین۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلف اٹھاتی ہوں۔

منصف۔ میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گی۔

مسز میک لین۔ میں خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گی۔

منصف۔ قیامت کے روز۔

مسز میک لین۔ قیامت کے روز۔

منصف۔ کہ میں سچ سچ کہونگی۔

مسز میک لین۔ کہ میں سچ سچ کہونگی۔

منصف۔ بالکل سچ۔

مسز میک لین۔ بالکل سچ۔

منصف۔ سوائے سچ کے اور کچھ نہ کہونگی۔

مسز میک لین۔ سوائے سچ کے اور کچھ نہ کہونگی۔

میک کالم۔ [کھڑے ہوتے ہوئے اور اپنے کاغذات کو عالم اضطراب میں

الٹتے پلٹتے] مسز میک لین کیا بھیڑ کے شوربہ کو بہت دل چاہتا تھا

مسز میک لین۔ ہاں۔

منصف۔ براہ مہربانی زور سے بولئے میں سن نہیں سکتا۔

مسز میک لین۔ ہاں۔

منصف۔ شکریہ۔

میک کالم۔ کیا مدعا علیہ یعنی مذکورہ بالا روری میک کال کو یہ بات معلوم

تھی کہ بھیڑ کے شوربہ کو آپ کا دل چاہتا ہے۔

مسز میک لین۔ ہاں معلوم تھا۔

میک کالم۔ کیا اس نے آپ کو اور وڈ میک ایور کو اس دن یعنی گذشتہ

۲۰ مارچ کو مدعو کیا تھا۔

مسز میک لین۔ کیا اسدن جمعرات تھی۔

میک کالم۔ ہاں جمعرات تھی۔

منصف۔ ذرا اور زور سے بولئے مسٹر میک کالم آپ نے کیا کہا۔

میک کالم۔ میں نے یہ کہا "ہاں جمعرات تھی" حضور۔

منصف۔ شکریہ مسز میک لین ہاں تو آپ یہ بتائیے کہ جمعرات کے روز

۲۸ - مارچ کی تھی -

مسز میک لین - میں یہ کیسے بتا سکتی ہوں - ہاں یہ جانتی ہوں کہ جمعرات کو روری نے بھیڑ ماری تھی -

منصف - ٹھیرئیے، ٹھیرئیے آپ کو ایسی بات نہ کہنا چاہئیے - ابھی تک یہ ثابت نہیں ہوا کہ کسی نے بھیڑ ماری بھی ہے - صرف سوال کا جواب دیجئے اس سے زیادہ کچھ نہیں - آپ کو یوں کہنا چاہئیے کہ فلاں دن تھا جس روز مسٹر میک کال کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ ماری گئی ہے یہ کیسے بغیر بھیڑ کے مارے ہوئے ہمیں اس کا شوربہ کیسے مل گیا -

منصف - لیکن آپ کو ایسا نہیں کہنا چاہئیے صرف میرے سوال کا جواب دیجئے -

مسز میک لین - اگر روری نے ماری نہیں تو پھر شوربہ کہاں سے آگیا -

منصف - پھر وہی - مجھے افسوس ہے مسٹر میک کالم میں عادت کے خلاف کام کر رہا ہوں، اجازت دیجئے کہ میں اس گواہ سے خود سوال کروں [میک کالم تعظیماً جھکتا ہے اور پھر بیٹھ جاتا ہے]

میک کالم - جیسی حضور کی مرضی -

منصف - ہاں مسز میک لین آپ نے روری کے ساتھ ۲۸ - مارچ کو بروز جمعرات بھیڑ کا گوشت کھایا تھا کیوں یہ صحیح ہے -

مسز میک لین - جیسے بھی سہی جمعرات کا دن تھا -

منصف - کیا کوئی ایسا واقعہ اس روز ہوا تھا جس سے آپ صحیح تاریخ بتا سکتی ہوں -

مسز میک لین - جس روز ہم نے گوشت کھایا تھا اسدن صبح کو میں نے روری کو سری بھونتے دیکھا تھا -

منصف - ہاں کون سی صبح تھی -

مسز میک لین - اس رات کی صبح تھی جس میں روری نے بھیڑ ماری تھی

منصف - [بہ نسبت غصہ کے افسوس زیادہ کرتا ہے] بس بس مسز میک لین

مسٹر میکن ٹاش آپ کوئی سوال کریں گے -

میکن ٹاش - نہیں حضور -

منصف - مسٹر میک کالم آپ اپنا قصہ بتائیے -

میک کالم - حضور میرا قصہ یہ ہے کہ میری قریباً نصف کوڑی بھیڑوں کے مرگئیں اور متذکرۂ بالا روری نے کوئی ایسا مرض نہیں بتایا جس سے ان کی موت کے متعلق اطمینان ہو جاتا -

منصف - کیا کہا مرض -

میک کالم - جیسے بھی حضور سمجھیں - حاصل یہ کہ وہ سب مرگئیں اگر مریں نہیں تو میرے لئے تو مرنے کے برابر ہیں کیونکہ میں نے پہلی تیز رنگنے کے بعد کبھی نہیں دیکھا -

منصف - ہاں ہاں کہے جائیے مسٹر میک کالم - وقت بہت قلیل ہے رنگنے کے قصہ کو چھوڑئیے -

میک کالم - میں نے طے کر لیا کہ میں متذکرہ بالا مدعا علیہ کو خفیہ دیکھونگا روری متذکرہ بالا روری پر مجھے شبہ ہوا کہ وہ متذکرہ بالا بھیڑ کو مرض میں مبتلا کرنا چاہتا ہے - [میکن ٹاش منہ پر ہاتھ رکھ کر گردن جھکائے ہوئے ہنستا ہے - میک کالم سن لیتا ہے اور خشمناک لہجہ میں کہتا ہے] میکن ٹاش ہنستے ہو لیکن یاد رکھو مجھے ہیرس ٹوئیڈ یاد ہے

منصف - [دخل در معقولات کا سبب نہ سمجھتے ہوئے] یہ ٹوئیڈ کا کیا قصہ چھیڑ دیا میں کوئی بات بے محل و بے موقع سننا نہیں چاہتا - بس بھیڑ کا ہی ذکر کیجئے - رنگنے اور ٹوئیڈ کو چھوڑئیے -

میک کالم - بہت خوب حضور - یہ بھیڑ بہت خوبصورت تھی میں نے روری کو ۲۷ - مارچ کی رات میں سوراخ میں سے جو کہ گھر کی دیوار میں تھا دیکھا یہ وہ رات تھی جس کی صبح کو بھیڑ کا شوربہ تیار کیا گیا - سری بھونی گئی - یہ سب متذکرہ بالا روری نے کیا [میکن ٹاش ہنسی کو ضبط نہ کر سکا] ہنستے ہو میکن ٹاش میں تمہیں

ابھی سمجھ لونگا۔

منصف۔ یہ کیا ہے، آپ کا ہے کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔

میک کالم۔ میں ہیرس ٹوئیڈ کے متعلق کہہ رہا ہوں۔ حضور یہ میرے پاس سے چرائی گئی اور مجھے ایک پیسہ بھی نہ ملا۔

منصف۔ میں بالکل نہیں سمجھتا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں، بھیڑ کے موضوع پر بات چیت کیجئے۔

میک کالم۔ بہت خوب حضور۔ میں نے روّری متذکرہ بالا کو اپنی آنکھوں سے بھیڑ کا سر کاٹتے دیکھا۔ میرا مطلب متذکرہ سر سے ہے اور پھر متذکرہ ۲۸۔ مارچ کو اس کا شوربہ میرے شبہ کے مطابق تیار رہوا۔ [میکن ٹاش پھر ہنستا ہے] ہاں خوب ہنسے جاؤ۔ میں تم سے دس گز ٹوئیڈ جو گاڑی میں لے بھاگے تھے کی قیمت وصول کر لونگا۔

منصف۔ دس گز گاڑی میں، مسٹر میک کالم آپ کیا کہہ رہے ہیں کسی نے بھی سنا ہے کہ دس گز بھیڑ۔

میک کالم۔ نہیں حضور دس گز عمدہ ہیرس ٹوئیڈ اس کا رنگ ارغوانی تھا۔ اگست میں ایک سال ہو گیا، مجھے ایک کوڑی نہیں ملی

منصف۔ میں آپ کی باتوں کو قطعاً نہیں سمجھتا وہ بھیڑ کیا ہوئی اس کا ذکر کیجئے۔ میری آرزو تھی کہ آپ کا وکیل ہوتا۔ اچھا ہاں پھر کیا ہوا

میک کالم۔ حضور سب سے پہلے میں نے اُسے سر کاٹتے دیکھا میرا خیال ہے کہ وہ شوربہ متذکرۂ بالا بھیڑ کا ہوگا اس نے متذکرہ بالا شوربہ تیار کرنے کے لئے بھیڑ ماری [میکن ٹاش پھر ہنستا ہے] ادھر یہ ہنس رہے ہیں لیکن جب تم گاڑی میں بیٹھ کر ہیرس ٹوئیڈ لے کر چلتے بنے تو ہنسی نہ آئی۔

منصف۔ کیا آپ کا مطلب ہے کہ مدعا علیہ نے بھیڑ کو جال میں پھانس لیا تھا کیا بھیڑ کی کوئی قسم ہیرس بھی ہوتی ہے اور کیا یہ اسی نسل میں سے تھی۔ میرا تو خیال ہے کہ یہ نسل اب بالکل ختم ہو گئی۔ ہاں تو معلوم ہوا کہ ہیرس ٹوئیڈ کی نسل باقی ہے میرے بچپنے میں یہ سینٹ کلیڈا بھیڑ کہلاتی تھی اس کے تین یا چار سینگ ہوتے تھے کیوں ٹھیک ہے نا

میک کالم۔ حضور یہ بھیڑ نہیں ہے یہ اونی کپڑا ہے اس کا رنگ ارغوانی تھا

منصف۔ اچھا۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اون جو کہ بھیڑ کے مارنے سے ضائع ہو گئی ہے اتنی ہیرس ٹوئیڈ کے برابر تھی اگر ایسا ہی ہے تو فی الحال ٹوئیڈ کا بالکل خیال مت کیجئے۔ ہمیں اس سے کوئی تعلق نہیں کہ بھیڑ میں کتنی اون نکل سکتی ہے ہم بھیڑ ہی کے مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں ٹوئیڈ سے کوئی واسطہ نہیں۔

میک کالم۔ اگر حضور اجازت دیں تو میں عرض کروں کہ مجھے ہیرس ٹوئیڈ بھیڑ سے زیادہ عزیز ہے۔

منصف۔ ہاں ہاں میں جانتا ہوں لیکن اول بھیڑ بعدہٗ ٹوئیڈ ہے۔ پھر اون کا کاتنا یا رنگنا آتا ہے لیکن ہر حال میں بھیڑ ٹوئیڈ سے پہلے آتی ہے

میک کالم۔ درست ہے حضور مگر اس معاملہ میں ایسا نہیں ہے ٹوئیڈ بھیڑ کے مارے جانے سے بہت زمانہ قبل چوری ہوئی تھی، اسے ایک سال ہوا۔ پچھلے اگست ہی میں تو۔

منصف۔ اونہہ۔ میرے خیال میں آپ اس ذکر کو چھوڑ دیجئے وقت بہت قلیل ہے اور میں آپ کی بے محل گفتگو کو نہیں سمجھ سکتا اب آپ مسٹر میکن ٹاش کوئی سوال کیجئے۔

میکن ٹاش۔ مسٹر میک کالم آپ کا بیان ہے کہ آپ نے مدعا علیہ کو ۲۸ مارچ کی شب میں بھیڑ مارتے دیکھا۔

میک کالم۔ ہاں ہاں۔

میکن ٹاش۔ اسوقت کیا بجا تھا۔

میک کالم۔ کوئی نو بجے تھے۔

میکن ٹاش۔ اُسدن چاندنی تھی۔

میک کالم۔ نہیں۔
میکن ٹاش۔ مدعا علیہ کے پاس روشنی تھی۔
میک کالم۔ نہیں۔
میکن ٹاش۔ اس کے پاس کسی قسم کا چاقو تھا۔
میک کالم۔ میں نے چاقو نہیں دیکھا۔
میکن ٹاش۔ آپ نے چاقو نہیں دیکھا۔ کیوں۔
میک کالم۔ رات بہت زیادہ تاریک تھی۔
میکن ٹاش۔ ہاں تو آپ چاقو نہیں دیکھ سکے مگر بھیڑ مارتے ہوئے دیکھ لیا
میک کالم۔ میں نے اسے قسم کھاتے ہوئے سنا کہ وہ بھیڑ کو ضرور مار ڈالے گا اور پھر میں نے غریب جانور کو جدوجہد و شور مچاتے سنا اور پھر ایک دم خاموشی طاری ہوگئی۔
میکن ٹاش۔ تو پھر آپ نے ملزم کو بھیڑ مارتے نہیں دیکھا آپ نے صرف یہ سنا کہ وہ جان سے مار رہا ہے۔
میک کالم۔ میں نے یہی سنا کہ وہ بھیڑ کو جان سے مار رہا ہے۔
میکن ٹاش۔ آپ نے چند آوازیں سنیں اور قیاس کر لیا کہ یہ آواز اسوقت پیدا ہوتی ہیں جب بھیڑ ماری جا رہی ہو۔
میک کالم۔ میں نے یہی سنا کہ وہ بھیڑ کو جان سے مار رہا ہے۔
میکن ٹاش۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اقرار کر رہے ہیں کہ آپنے بھیڑ کو مارتے نہیں دیکھا۔
میک کالم۔ میں نے یہی سنا کہ وہ بھیڑ کو جان سے مار رہا ہے۔
میکن ٹاش۔ بہت خوب مسٹر میک کالم میری طرف متوجہ ہوجئے آپ منصف صاحب کو بتلائیے کہ جب بھیڑ کو کوئی دوا دی جا رہی ہو تو چھوٹنے کی جدوجہد کرتی ہے اور شور مچاتی ہے یا نہیں۔
میک کالم۔ شور مچاتی ہے۔
میکن ٹاش۔ تو پھر یہ ہوسکتا ہے کہ وہ آوازیں جو آپ نے سنی تھیں بھیڑ کے مارنے کی وجہ سے پیدا نہ ہوتی ہوں بلکہ دوا دینے کی وجہ سے۔
میک کالم۔ میں نے یہی سنا کہ وہ بھیڑ کو جان سے مار رہا ہے۔
میکن ٹاش۔ بہت خوب کیا آپ جناب منصف صاحب کو بتلائینگے کہ آپ کا اس سے کیا مطلب ہے جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آپنے مدعا علیہ کو ہیرس ٹوئیڈ ڈنسل کی بھیڑ مارتے دیکھا جس کی لمبائی دس گز تھی۔
میک کالم۔ مسٹر میکن ٹاش یا مسٹر میک فارلین خواہ آپ کا نام کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کو اس سے کیا میں کچھ ہی کیوں نہ کہوں.. ...... لیکن میں آپ سے پھر کہتا ہوں کہ آپ نے ہیرس ٹوئیڈ سال گذشتہ اگست میں چرائی تھی جس کی قیمت تاہنوز نہیں دی۔
میکن ٹاش۔ [بیٹھ جاتا ہے] شکریہ۔
منصف۔ بس بس زیادہ بحث کی ضرورت نہیں یہ کافی ہے۔
[میک کالم بڑبڑاتا ہوا اپنی جگہ پر چلا جاتا ہے میکن ٹاش روزی کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ گواہان کے کٹہرے میں داخل ہوتا ہے]
کورٹ آفیسر۔ روری اب تمہاری باری ہے۔
میکن ٹاش۔ حضور مدعا علیہ کا نام روری میک کال ہے ان کی عمر باسٹھ سال ہے یہ انگریزی بہت کم جانتے ہیں۔
منصف۔ [لکھتے ہوئے] بہت خوب [پھر اپنا داہنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہو میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر حلف اٹھاتا ہوں۔
[روری خاموش رہتا ہے] کہو جیسے میں کہہ رہا ہوں میں خدا کو حاضر .... مسٹر میکن ٹاش میرا خیال ہے کہ روری کو کچھ نہ کچھ انگریزی ضرور آتی ہے۔

میکن ٹاش ۔ بیشک حضور ۔

منصف ۔ جو میں کہہ رہا ہوں تم سمجھتے ہو ۔

روری ۔ ہاّ ۔

منصف ۔ کیا کہا ۔

روری ۔ ہاّ ۔

منصف ۔ سمجھا نہیں ۔

روری ۔ ہاّ ۔

منصف ۔ کیا یہ آدمی پاگل ہے مسٹر میکن ٹاش ۔

میکن ٹاش ۔ تھوڑی دیر سے یہ بہت زیادہ حواس باختہ ہو رہا ہے جب سے یہ خوفناک جرم اس غریب پر لگایا گیا ہے اس کے حرکات و سکنات میں بہت تغیر پیدا ہو گیا ہے ۔ ویسے جناب عالی وہ نہایت شریف الطبع ہے اب جبکہ وہ ہر چیز کو جس کا اسے گمان بھی نہ تھا اپنے خلاف دیکھتا ہے یہ قدرتی امر ہے کہ ایسی صورت میں اس کے دماغ کا توازن قائم نہیں رہ سکتا ۔

منصف ۔ میرے عزیز دوست اگر ایسے ہی آدمی اس مقدمہ میں کچھ اور ہوں ۔ جیسے کہ روری اور روری سے قبل کے تو میرے اپنے دماغ کا توازن قائم نہ رہ سکے گا ۔ کوشش کیجئے شاید آپ کچھ سمجھ سکیں پھر میں فیصلہ سنا دوں گا ۔

میکن ٹاش ۔ حضور کا بہت بہت شکریہ ۔ مسٹر روری اس طرف متوجہ ہوجئے ۔

میکن ٹاش ۔ آپ نے کبھی مسٹر میک کالم کی بھیڑ کو مارا ہے ۔

روری ۔ ہاّ ۔

میکن ٹاش ۔ آپ نے وہ بھیڑ کا شوربہ تیار کیا تھا کہاں سے حاصل کی تھی

روری ۔ ہاّ ۔

میکن ٹاش ۔ کیا تم بالکل نہیں سمجھتے ہیں کیا کہہ رہا ہوں ۔

روری ۔ ہاّ ۔

میکن ٹاش ۔ [منصف کی طرف مخاطب ہو کر جو کہ کان پر ہاتھ رکھے ہوئے بغور تقریر کو سن رہا تھا] حضور میرا خیال ہے کہ سوالات بے سود ہیں اس سخت مصیبت کی وجہ سے بیچارہ پاگل ہو گیا ہے

منصف ۔ [افسوس کرتے ہوئے] بیشک ایسا ہی ہے مسٹر میکن ٹاش میرا خیال ہے کہ آپ شریف الطبع اور قابل اعتبار انسان ہیں ممکن ہے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں ایسا ہی ہو مگر اس کے اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں ۔ مگر اس بحث کے لئے وقت نہیں ہے مدعا علیہ سے ہمیں مقدمہ میں کچھ مدد نہ مل سکی مقدمہ بس مسٹر میک لین کی گواہی پر رہا ۔ یہ بات کہ مسز میک لین نے شوربہ مدعا علیہ کے ساتھ اس تاریخ کو کھایا جو معلوم نہیں اس لئے یہ بات قابل توجہ بھی نہیں بلکہ بے موقع سی بات ہے میک کال نے جو ثبوت بہم پہنچایا ہے وہ بھی قابل اطمینان نہیں ہے ۔ انہوں نے مدعا علیہ کو بھیڑ مارتے ہوئے نہیں دیکھا ۔ انہوں نے صرف چند آوازیں سنیں جسے انہوں نے سمجھ لیا کہ اس بھیڑ کی آوازیں ہیں جو جان سے ماری جا رہی ہو حالانکہ مجھے بھیڑوں کی آواز کی شناخت نہیں ہے لیکن اگر مسٹر میک کال سے اور تبادلہ خیال ہو تو آوازیں بھی پہچان لونگا ۔ مجھے افسوس ہے کہ مسٹر میک کالم کا وکیل موجود نہ تھا ۔ میں مقدمہ کا فیصلہ مدعا علیہ کے حق میں مع خرچہ کے کرتا ہوں ۔

[منصف جانے کے لئے اٹھتا ہے ۔ تمام لوگ تعظیماً اٹھ جاتے ہیں ۔ سب لوگ باہر جاتے ہیں عوام مقدمہ پر رائے زنی کرتے ہیں اور ہنستے ہیں مسٹر میک کالم ۔ مسٹر میکن ٹاش کے سر ہو جاتا ہے]

میک کالم ۔ مسٹر میکن ٹاش وہ وقت دور نہیں ہے جب تمہیں ہیبرس ٹوئیڈ کے چرانے کا مزا معلوم ہوگا ۔

میکن ٹاش۔ میرے دوست آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا جو کیسے کہا جاتا ہے۔ میرے پاس دو گواہ ہیں۔

میک کالم۔ نہیں نہیں۔ تمہارے دو گواہ ضرور تھے لیکن اب تو ایک ہی ہی رہ گیا ہے۔ تمہارا ایک گواہ تو بھیڑ ہو گیا ہے جو صرف با کرنا جانتا ہے۔ [وہ یہ کہکر باہر چلا جاتا ہے کورٹ افیسر بھی اس کے پیچھے پیچھے جاتا ہے روری و میکن ٹاش اکیلے رہ جاتے ہیں میکن ٹاش اپنی گاؤن اتارتا ہے اور کاغذات کو اٹیچی کیس میں رکھتا ہے]

میکن ٹاش۔ روری شاباش وہ سب گئے اب ہمیں آپس میں ہدیہ تبریک پیش کرنا چاہئے میرا خیال ہے۔ [وہ روری سے مصافحہ کرتا ہے] اب کہئے کیا رائے ہے۔

روری۔ با۔

میکن ٹاش۔ خوب دو ایک روز تک یہی سوانگ رچے رہو میں ابھی رسید لکھتا ہوں۔ میری فیس پانچ گنیاں ہیں [وہ رسید پر ٹکٹ لگاتا ہے اور روری کو دیتا ہے]

روری۔ [روری جیب میں رکھتا ہے دروازہ کی طرف بھاگتا ہے] با۔

میکن ٹاش۔ کیا کہنے خوب مگر ذرا جلدی کرو مجھے اسٹیمر سے جانا ہے

روری۔ [دروازہ سے باہر نکل جاتا ہے وکیل کی طرف دیکھتا ہے] با۔

[بھاگ جاتا ہے]

میکن ٹاش۔ میری پانچ گنیاں مجھے رسید واپس کردو۔

[لیکن دور سے جواب با ملتا ہے۔ میکن ٹاش دوڑکر دروازہ تک آتا ہے اور روری کی طرف دیکھتا ہے]

[پردہ گرتا ہے]

....

....

....

....

الیاس۔ بی۔ اے

حسنِ جاوداں

(از جناب روشن دین صاحب تنویر)

(۱)
بلبل نے کہا کہ اس چمن میں
گر چاہو تو میں کمال کر دوں
فانی ہے جہاں میں حسنِ گل کا
لاؤ میں اسے لازوال کر دوں

(۲)
پھر رکھدیا خار پر جگر کو
مفقود تھا اس کے دل سے خطرہ
اور چھیڑ کے گیت گل کے لب پر
ٹپکایا لہو کا قطرہ قطرہ

(۳)
جب گرم لہو رگوں میں ٹپکا
لرزش سی ہوا اس گل پہ چھائی
اک شعلہ سا رنگ و بو کا لپکا
اک آگ بھڑک اٹھی چمن میں

(۴)
بلبل کی نوا میں سب سمایا
لتھڑا ہوا رنگ و بو لہو میں
بلبل ہے نہ گل جہاں میں باقی
باقی ہے نوا ہی چار سو میں

(۵)
شاعر کے گلو میں یہ نوا اب
بنجاتی ہے جانفزا ترانے
نغموں سے جو کر رہا ہے برپا
فردوس کے جاوداں زمانے

محمد بن تغلق

(از جناب شفاعت محمود صاحب)

جہانتک احساسات کا تعلق ہے، کوئی شخص تاریخ ہند کے اس حصہ کا مطالعہ، جسکا تعلق ازمنۂ وسطیٰ سے ہے، بغیر اس احساس کے نہیں کر سکتا کہ اس کے اکثر واقعات نہایت کمزور غلط اور بے بنیاد ہیں اور بغیر کسی پس و پیش کے کہا جاسکتا ہے کہ اس کی وجہ یا بنیاد زیادہ تر وہ حکایات و فسانے ہیں جن کو مورخوں نے بنیادی چیز سمجھ لیا ہے، اگرچہ ان حکایات کی محاکاتی دلچسپی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن جہاں تک اسناد کا تعلق ہے، ان کے یک طرفہ اور مشتبہ ہونے میں کوئی شک نہیں، کیونکہ جنبہ داری کے جذبات کی وجہ سے جہاں وہ کسی ناگوار و ناسزاوار واقعہ کے بیان سے پرہیز نہیں کرتے، وہاں وہ کسی ایسے شخص کی شہرت وعظمت کو خاک میں ملا دینے سے بھی گریز نہیں کرتے، جس سے وہ خود یا ان کے سرپرست کسی وجہ سے اختلاف رکھتے ہوں۔

تاہم اس الزام سے دوسرے وہ مورخ بھی بری نہیں، جنھوں نے اول اول نہایت بالغ نظری کے ساتھ واقعات کا تجزیہ کیا اور ان پر بالکل مغربی طرز استدلال کے ساتھ نگاہ ڈالی، مگر بدقسمتی سے ان میں سے بعض وہ اہل قلم ہیں جو اصول درایت   سے بہت حد تک ناواقف ہیں، کیونکہ جب متضاد واقعات سامنے آجاتے ہیں تو انکی فہم میزان اعتدال میں نہیں رہتی، یہی وجہ ہے کہ اگلے مورخ کے قلمبند کئے ہوئے واقعات سے اکثر مورخانہ استفادہ ناممکن ہوجاتا ہے، ان حالات کی موجودگی میں ضروری ہے کہ ایسے تمام اہل قلم کے کارناموں پر کبھی کبھی موجودہ اصول درایت نقد و تبصرہ کے لحاظ سے نگاہیں ڈالی جائیں، تاکہ آثار و قرائن، قیاس اور اس کے اصول کے تحت میں حجابات برطرف ہوکر حقائق سامنے آجائیں۔ اس تجویز پر عمل ہونے ہی ہم یقیناً ایسے نتائج اکثر اخذ کرسکیں گے جو نظر انداز کردیئے گئے ہیں۔ یا جو ایام سلف کے مورخوں کے غلط اور تعجیلی فیصلوں کی وجہ سے یا تو نور کامل بن گئے ہیں یا ظلمت مطلق!

مسئلہ زیر بحث میں اس سے کسکو انکار ہوسکتا ہے کہ محمد بن تغلق اور اس کے جانشین فیروز شاہ کے حالات اسی قسم کی لغزشوں کی وجہ سے ابتک معرض بحث میں ہیں۔ اگر متضاد روایتوں اور مختلف قسم کے انعام و الزام (اگر وہ واقعی ہوں) تو لکھے نہ جائیں! میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ غلط بیانی سے کام نہ لیا جائے، درآنحالیکہ زیر نظر مسئلہ میں اس جذبہ سے اسقدر کام لیا گیا ہے کہ گتھیوں کا سلجھنا ایک امر مشکل ہوگیا ہے۔ چنانچہ آخرالذکر --- فیروز شاہ --- عیاش طبع شخص پرست، مے نوش اور کچھ مجہول فطرت تھا، لیکن تاریخ کے اوراق پر وہ قابل احترام سزاوار تحسین اور لائق تقلید ہے اور فیصلہ کن طریقے پر کہدیا جاتا ہے کہ وہ عالم، فاضل، رحیم، دوراندیش اور جانے کیا کیا تھا۔ برخلاف اس کے اول الذکر۔ یعنی محمد بن تغلق جو معتدل خیال، شفقت پسند، کریم النفس ہونے کے ساتھ ساتھ۔ راعی اور رعایا دونوں کے لئے اختراع و ایجاد غور و خوض سے فلاح و بہبودی کے خیال میں منہمک رہا کرتا تھا، اس کو تمام مورخ اتنے نا ملایم الفاظ سے یاد کرتے ہیں، جن سے زیادہ ہونا ممکن نہیں

غور کرنے کی بات ہے کہ فیروز شاہ اپنے بوڑھے وفادار وزیر احمد ایاز کو محض دوسروں کو خوش کرنے کے لئے قتل کردیتا ہے، حالانکہ یہی وزیر وہ تھا جس نے تاج و تخت کے قیام کے لئے انتھک کوشش کی تھی، ورنہ اس خاندان سے اسکا وجود ختم ہوگیا ہوتا، مگر تاریخ میں اس کمزوری کا صلہ یہ دیا جاتا ہے کہ وہ "مجسمۂ شرافت و تدبر" تھا، اسکے بالکل برعکس محمد بن تغلق سے عین الملک[1] بغاوت کرتا ہے، اس کے تاج و

(لے حاشیہ دوسرے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

زندگی و ناموس کو خطرے میں ڈال دیتا ہے لیکن اس پر قابو پانے کے بعد وہ نہ صرف اس کو معاف کر دیتا ہے بلکہ اس کے عہدے سے بھی اس کو نہیں ہٹاتا، مگر تاریخیں اس کو خونیں اور قاتل کہنے سے نہیں شرماتیں!!

یہی نہیں بلکہ فیروز شاہ اپنی یادگار قائم کرنے کے لئے "حصار فیروزہ" کے نام سے ایک شہر آباد کراتا ہے اور ایسی جگہ پر جہاں پانی بالکل کمیاب تھا، لیکن اس عقیدے کی بنا پر کہ اگر وہ مسلمانوں کی فلاح کے لئے ایک شہر تعمیر کرائے گا تو خدا پانی کا خود انتظام کر دے گا"۔

وہ اپنے ارادے سے باز نہیں آتا اور شہر تعمیر کرا دیتا ہے۔ اور اسی کے صلہ میں "رعایا پرور" کا خطاب پاتا ہے، اس کے بالکل برعکس محمد بن تغلق جس کو خوب خبر تھی کہ ــــ

"اس قوم کی حالت نہیں بدلتی جو اپنی حالت بدلنے کی
سعی نہیں کرتی"

قحط کے زمانے میں سخت سخت محنت برداشت کر کے اپنی زراعت پیشہ رعایا کے لئے کنوئیں کھدواتا ہے اور جب آبرسانی کے اہتمام میں ناکام رہتا ہے تو ان اضلاع کے باشندوں کو ہجرت کا حکم دیتا ہے جہاں پانی بالکل نہ تھا۔ علاوہ اس کے اور بہت سی حکمتیں اس بات میں پوشیدہ تھیں، مگر مورخوں کی عام رائے میں وہ ایک "خیالی انسان" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، تاہم تاریخ کے اوراق سے یہ الفاظ کس طرح مٹائے جاسکتے ہیں کہ

"سلطان در از دیاد زراعت اسلوبہا اختراع می کرد
ہرچہ در از دیاد زراعت در تصور سلطان می گذشت
در قلم می آمد و آں را اسلوب نام می شد، اگر آں سالیت
متصورہ واقع شدے، از دیاد زراعت و حیثیت
زراعت جہاں از نعمتہائے گوناگوں گشتے و خزائن
گنجہا رآمدے، در معاملہ از دیاد زراعت دیوانے
وضع شد و آں دیواں را امیر کوہی نام کردند ....."

(فیروز شاہی برنی ... مخطوطات دارالمطالعہ پٹنہ)

یہاں پہونچکر قدرتاً ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ تاریخی دلائل کے باوجود وہ کون سی چیز تھی جس کی وجہ سے فیروز شاہ کو تاریخ کے صفحات پر اعلےٰ حیثیت مل گئی اور محمد بن تغلق پستی میں جا گرا؟ سو اس کا جواب جہاں تک تقابل کا تعلق ہے نہایت آسانی سے یہ ہو سکتا ہے کہ امیر تیمور کے قاہرانہ حملہ و تباہ کاریوں کے بعد لوگوں کی تمام توجہ فطری طور پر، دہلی کے حکمرانوں میں سے اسکی طرف ہو سکتی تھی، جو متاخرین میں سے کسی قدر مشہور تھا اور جس کے متعلق "عہد زریں" کا افسانہ خیز خیال پیدا ہو سکتا تھا اور یہ فیروز شاہ کے علاوہ کون ہو سکتا تھا؟ اس کے علاوہ امیر تیمور کی تباہ کاریوں کے بعد عہد فیروزی کے فتنہ و فساد پر فطرتاً وقیع نظر نہ جا سکتی تھی کیونکہ وہ نسبتاً کم المناک تھے، حالانکہ یہی وہ فسادات تھے جنکی وجہ سے سلطنت کی بنیاد تک ہل گئی تھی

لہ عین الملک کی بغاوت کا واقعہ یوں ہے کہ ۷۴۱ھ میں مابین رمضان و شوال خوب بارش ہوئی جس سے قحط کے دفع ہونے کی امید بندھی، اس زمانہ میں کچھ خائن اور بددیانت اہلکار، اودھ اور ظفر آباد میں سلطان محمد تغلق کے خوف سے پناہ گزیں ہوئے، عین الملک صوبہ دار تھا، حکم پہونچا کہ مفرورین کو گرفتار کر کے بھیجدیا جائے۔ عین الملک نے تعمیل حکم کا ارادہ کیا، اتفاقاً اس زمانے میں اس کو دارالسلطنت کو جانا پڑا، سلطان سے ملاقات ہوئی تو بر سبیل تذکرہ اس کی زبان سے نکل گیا، کہ میں تم کو دکن کا صوبہ دار بناؤنگا، بات ختم ہوگئی عین الملک ظفرآباد واپس آیا منجملہ اور باتوں کے اس امر کا بھی ذکر لوگوں سے کیا، مفرورین میں اس کے بھائی بھی تھے، ان کو موقع مل گیا۔ عین الملک کو بہکانا شروع کیا کہ سلطان تجھ کو بے دخل کرنا چاہتا ہے، بہتر ہے کہ بغاوت کر کے خود مختار ہونے کا اعلان کر دے، بات موقعہ کی تھی لالچ نے مجبور کر دیا۔ چنانچہ ۷۴۲ھ میں اس نے بغاوت کر دی، سلطان نے خود اس بغاوت کا استیصال کیا، عین الملک کے بھائی اس جنگ میں کام آئے، عین الملک گرفتار ہو کر دربار میں آیا، کوئی دوسرا ہوتا تو اسے قتل کر دیتا، لیکن شرافت کو راہ دے کر دیرینہ خدمات کا خیال کر کے ان الفاظ کے ساتھ سلطان نے معاف کر دیا "عین الملک کی طبیعت میں فساد نہیں ہے، میں جانتا ہوں کہ وہ بہکایا گیا تھا۔ پرانی وفاداریاں یاد آتی ہیں، معاف کرتا ہوں اور خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کرتا ہوں"!

اس کے علاوہ محاصل کی معافی فیروز شاہ کے بذل وکرم پر ایسی دلیل تھی جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ محاصل سے چشم پوشی ہی کی بدولت بیت المال میں کمی پیدا ہوئی اور اقتصادی کمزوری کی وجہ سے فتنہ وفساد رونما ہوئے اور پھر آنے والے تمام مورخوں نے ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروزشاہی کو اپنا ماخذ قرار دیا جو یکطرفہ بیان سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے فیروز شاہ کی قصیدہ خوانی اور محمد بن تغلق کو متہم کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا!؟

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوتی ہے کہ فیروز شاہ کے متعلق طائرانہ نگاہی سے کام لیا جا سکتا ہے، لیکن محمد بن تغلق کے متعلق کسی سطحی خیال کو مدنظر رکھ کر کوئی رائے قائم کرنی نہ صرف مضحکہ انگیز حد تک غلطی ہے بلکہ کھلی ہوئی ناانصافی بھی ہے، کیونکہ اس کو مجرم ٹھیرانیوالوں کی طرف سے اگر ایک طرف جنوبی ہندوالوں کی یہ ضرب المثل پیش کیجاتی ہے کہ "تغلق کے ملک (کی سلطنت) سے بھاگو"

تو دوسری طرف ہمعصر مورخوں کی رائیں، مبادیات تاریخ سے لیکر منتہی قسم کی تاریخی کتابیں بھی اس قسم کے ہذیانات سے خالی نہیں، پر لطف لطیفہ یہ ہے کہ اب بھی اس حکمران کو بدنام کرنے کے لئے یہ الزامات ناکافی تصور کئے جاتے ہیں۔ خالی از دلچسپی نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ ذیل کے الزامات یا تقریباً یہی اعتراضات تمام تاریخوں میں محمد بن تغلق کی ذات سے وابستہ کئے جاتے ہیں:۔

(۱) "محمد بن تغلق ذاتی خصوصیات کا ایک مجسمہ تھا لیکن بحیثیت حکمران کے وہ بالکل ناکام ثابت ہوا"

(۲) اس کا عہد حکومت جنون انگیز تجاویز کا ایک مرقع تھا جنہیں سے سکہ کم مایہ کا اجراء دہلی سے دولت آباد کی ہجرت، ایران وچین فتح کرنے کی سعی مذموم، اس کی قاتلانہ بے رحمیاں اضافہ لگان کی وجہ سے بغاوتوں کا رونما ہونا جس سے صوبے پر صوبے اس کے ہاتھ سے نکلتے گئے، اگر فیروز شاہ کی رعایا پروری اس کے بعد ہی سامنے نہ آجاتی تو آئندہ نصف صدی تک سلطنت کا قیام ناممکن ہوجاتا!"

اس یکطرفہ فیصلہ سے کوئی مورخ، سوائے وسیع النظر مورخ الفنسٹن کے کوئی نہ بچ سکا، اس کا خیال ہے کہ مذکورالصدر الزام اسقدر متضاد المعنی ہیں کہ ان کا تجزیہ ناممکن ہے۔ ان پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق ہوشیار و تجربہ کار حکمران ہونے کے ساتھ بالکل بے وقوف بھی تھا ـــــ حالانکہ دونوں باتیں ایک ہی شخص میں بیک وقت جمع ہوتے کبھی دیکھی نہ گئیں۔ کیونکہ ایک کی موجودگی دوسری کی عدم پر دلالت کرتی ہے ـــ تاہم ایسے بھی واقعات سے ذہن و دماغ آشنا ہیں جن میں ادبی اور علمی جواہر سے متصف انسان ناکام حکمران ضرور ثابت ہوئے ہیں، مثال کے طور پر عرض ہے کہ جیمس اول جو عیسائی دنیا میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ادیب ہونے کے ساتھ بیوقوف بھی تھا، لوئی سیزدہم نہایت زبردست صناع اور گھڑی ساز تھا، لیکن جہانتک حکمرانی کا تعلق ہے دونوں ناکام تھے مگر اسی کے ساتھ اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ان دونوں نے اپنے لئے اور اپنی نسل کے لئے ایسے ہی بیج بوئے تھے، جنہیں فتنہ وفساد ہی کے ثمر پیدا ہوسکتے تھے اس کے علاوہ زیر بحث مسئلہ میں یہ بات غالب نہیں ہے۔ کسی ادیب یا صناع کو تخت حکومت پر نہیں بٹھایا گیا تھا، بلکہ صاحب تخت و تاج ہونے سے بہت پہلے محمد بن تغلق نے اپنے قابل، عقلمند، بہادر اور مرد میدان ہونے کا پورا پورا ثبوت دیدیا تھا، اس کو بھی جانے دیجئے تو یہ ماننا پڑیگا کہ ازمنہ وسطی میں بیوقوفوں کی حکومت چند دنوں بھی برداشت نہیں کیجا سکتی تھی نہ کہ چھبیس برس تک اس کے زیر سایہ ہر قسم کی تکالیف و مصائب سہنا، کسی طرح قابل قبول نہیں ہے! کیونکہ وہ زمانہ "عدم تشدد" سے واقف نہ تھا، اور نہ اس وقت کے لوگ بیکار کی بحث کرنی جانتے تھے، وہ جس حکمران کے خلاف ہوتے اس کو تخت سے اتار کر بلکہ قتل ہی کر کے چھوڑتے۔

اس عہد کے مورخوں نے جو رائے اس بادشاہ کے خلاف قائم کی تھی اگر ان میں شک وشبہ کو دخل بھی نہ دیا جائے اور اس کی فیاضی اور تشدد سے بالکل قطع نظر کر لیا جائے، تو اس صورت یا شبیہہ فیروزشاہی اور مسلک کے صفحات پر یوں نظر آئے گی:۔

"سلطان محمد بن تغلق نہایت خوبصورت انسان تھا تمام فنون سپاہگری ورزشوں میں طاق تھا۔ اتنا تعلیم یافتہ تھا کہ ایسے افراد بادشاہوں کی

نسل میں الشاذ کالعدم کا مرتبہ رکھتے ہیں، جن علوم میں اس کو خاص شغف تھا، وہ ادب فارسی اور بالخصوص حکمت سے متعلق تھے، خوشنویسی میں اسے ید طولےٰ حاصل تھا اور یہی چیزیں اسوقت علوم مشرقی کی روح تصور کیجاتی تھیں تقریر کی فصاحت تحریر کی بلاغت میں اس کو ایک بلند مرتبہ حاصل تھا، دور اندیشی اس کی عادت تھی، اس کا حافظہ نہایت درست تھا، جس چیز کو لوگ عام طور پر بھلا دیا کرتے ہیں وہ بھی اس کو یاد رہتی تھیں، اندرونی اور بیرونی دونوں زندگیوں میں وہ بہت متواضع تھا، اعتدال پسندی، میانہ روی اس کا دستور تھا، اخلاقی حیثیت سے دوسروں کے کمالات کا ہر لحظہ معترف رہتا تھا، اتقا و پرہیزگاری اس کی زندگی کے لوازم تھے، اپنوں پر شفقت اپنے آقازادوں۔ قطب الدینؒ سے محبت اس کا شیوہ تھا، اسلامی شعار میں حصہ لینا اس کی ترویج کی کوشش کرنی ضروری مانتا تھا، خود مسلمان دوسروں کو مسلمان دیکھنا پسند کرتا تھا۔ مگر تعصب سے کوسوں دور تھا، بایں ہمہ خدا ترسی اس قدر غالب تھی کہ دیگر مذاہب کی مجلسیں منعقد کراتا تھا اور تمام مباحث کو نہایت شوق سے سنا کرتا تھا۔ داد و دہش سے عناصر ہر وقت غالب رہتے تھے، ابتدائی بادشاہوں میں یہی وہ بادشاہ تھا جس نے "تعلیم" کو رواج دینے کے لئے خون پانی ایک کر دیا تھا اس میں صرف یہی خصوصیت نہ تھی کہ وہ نظامِ حکومت کو اصول کے تحت میں رکھنا چاہتا تھا اور عدل و انصاف کے معاملہ میں کبھی کسی کمزوری کو دخل نہ دیتا تھا، بلکہ خود اپنے اعمال و افعال کے محاسبہ کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا اس کے لئے سخت سے سخت توہین کو برداشت کر سکتا تھا حوصلہ مندی اور بہادری اس کی گھٹی میں پڑی تھی، ان وجوہ سے ہر شخص اس کی عزت کرنے اور اس سے ڈرنے پر مجبور تھا، درباری دستور کا دور دورہ تھا جس کی وجہ سے غیر ممالک کے سفراء آیا کرتے تھے، ابن بطوطہ اسی کے زمانہ میں آیا تھا، جس نے اس کی فیاضی وغیرہ کی بہت ستائش کی ہے، گو وہ لکھتا ہے کہ وہ سلطنت کے کچھ معاملوں میں بہت سخت تھا، مثلاً مجرموں کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتا تھا مگر یہ چیز ایک بادشاہ کے لئے عیب نہیں بلکہ بیدار مغزی کا ثبوت ہے ـــــ

سلطان کو علم فقہ اور تصوف میں بھی کافی دستگاہ تھی:

سطور بالا کا تقاضا تو یہ ہے کہ محمد بن تغلق کو جامع کمالات صوری و معنوی مان لینے کے بعد، یہ فیصلہ کر دیا جائے کہ اس کے مقابلے میں کوئی دوسرا حکمران پیش نہیں کیا جا سکتا!! لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے اس عہد کے سلاطین میں صرف **غازان خاں** میں تقریباً یہی بلکہ بعض مزید کمالات وخصائص موجود تھے، جس سے تیرھویں صدی کے آخری دور کا ہر ذرہ آگاہ ہے، اور قیاس کیا جاتا ہے کہ محمد بن تغلق چونکہ خراسان سے آیا تھا اس لئے بہت ممکن ہے کہ اس مشہور و معروف حکمران کے بعض خصائل و عادات سے متاثر ہوا ہو اور اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہو، غالباً اس امر کی وضاحت دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مذکورالصدر تصویر ان تین مورخوں کی تحریروں سے اخذ کی گئی ہے، جن میں سے دو بعض مصدقہ استدلال کی بنا پر سلطان کے سخت ترین مخالف تھے، اس لئے یہ گمان کہ ان تحریروں میں خوشامد، چاپلوسی، زبانی جمع خرچ، جنبہ داری کو دخل ہے، بالکل بے معنی ہے، اس کے علاوہ جسوقت ان مورخوں نے اپنی تاریخیں لکھنی شروع کی تھیں، اسوقت سلطان واصل بحق ہو چکا تھا اور تیسرا مورخ ہورتھ ہندوستان سے بہت دور کا باشندہ تھا اور کبھی ہندوستان نہ آیا تھا، اس لئے اس کو یہاں کی سیاست سے متاثر ہونے کا موقع ہی نہیں ملا تھا:

یہاں شاید یہ خیال ہو کہ یہ ایک "ادبی فریب" ہے کہ تاریخیں بعد کو لکھی گئیں، لیکن ایسا نہیں ہے، کیونکہ محمد ابو عبداللہ ابن بطوطہ اپنے سفر کے

۱؎ تاریخ منگولی از ہورتھ ـــ حصہ سویم۔

حالات ابن جوزی کو سنہ ۱۳۵۴ء میں تحریر کرائے تھے، ضیآء الدین برنی نے
اپنی تاریخ سنہ ۱۳۵۶ء میں ختم کی تھی، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس کی ابتدا
سلطان کی موت کے بعد ہوئی، سلک الابصار سنہ ۱۳۳۷ء اور سنہ ۱۳۴۲ء کے
مابین لکھی گئی، جس کا مصنف ابوالعباس شہاب الدین احمد متوفی سنہ ۱۳۴۹ء
یہ مراکش کا رہنے والا اور سلطان مصر کا درباری تھا۔ یہ ہیں وہ لکھنے
والے جو لکھتے ہیں:۔

"کہ سلطان ذہنی دیوانگی اور مذہبی جنبہ داری کی وجہ سے
متعصب تھا اس کے عادات و اطوار پر کوئی حکیم کبھی
دیوانگی، بے رحمی، اور سفاکی کا الزام نہیں عائد کر سکتا
عیاشی اور عشرت نفسی سے اسکو دور کا بھی واسطہ نہ تھا
وہ کاہل نہ تھا کہ وزراء پر امور سلطنت چھوڑ دیتا۔
برخلاف اس کے وہ معتدل مزاج، خدا ترس، محسن
عالم، خبر گیر اور بے مثل بے نظیر سپاہی تھا"

یہ تھی وہ زبردست شخصیت جس کو تمام مورخ، تحکم کے لہجے میں خود
مطعون کرتے ہیں اور دوسروں کو طعن کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ وہ بہترین
شخصیت کے ساتھ بدترین ناکامیوں کا حامل تھا خلیق و متواضع ہونے کے
ساتھ بے مثل خونی شخص۔ نقل کفر کفر نباشد۔ تھا! کیا یہ اجتماع ضدین؟
یہ ژولیدہ بیانی، یہ کلام و علم کلام سے بے خبری قرین قیاس و یقین ہے؟
یا اس کا یہ مفہوم ہے کہ سلطان سے دیدہ و دانستہ طور پر انتقام لیا گیا ہے
اور اس کی صورت بالکل مسخ کر کے دنیا کے سامنے پیش کی گئی ہے!؟!

یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب بغیر جرح و تعدیل کے ناممکن
ہے۔ اس لئے اس مسئلہ کے اس رخ پر غور کرنے کے لئے جس کا تعلق بنیادی ماخذ سے
ہے، ضروری ہے کہ ضیآء الدین برنی کے لکھے ہوئے واقعات پر گہری نظر
ڈالی جائے، کیونکہ یہی وہ مورخ ہے جس کی تصنیف پر اس کے بعد کی تمام
تصانیف کا انحصار ہے، یہ مورخ بلند شہر کا رہنے والا تھا، اس کا خاندان
نہ صرف وفاداری کے لئے مشہور تھا، بلکہ حکومت کے دوش و بازو پر
اس کا بڑا احسان تھا، محمد بن تغلق جب تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر بیالیس سال کی
تھی، اور بقول خود اُس نے سلطان کی خدمت تقریباً ۱۰ سال تک کی تھی، اس نے
مختلف مواقع پر اپنے راز دار ہونے کا پورا پورا ثبوت بھی دیا تھا، سلطان کے
فوت ہونے کے بعد کچھ دنوں اور زندہ رہا، اس لئے اس کو اس امر کا پورا
پورا موقع ملا کہ وہ اُس عہد کے واقعات من و عن دیکھ کر یا سنکر نہایت اچھے
انداز میں لکھتا رہے، لیکن برنی نے جو تصویر سلطان کی لفظوں میں کھینچی ہے
وہ (باوجود ان تمام خوبیوں کے جسکو دوسرے ہمعصر مورخوں نے نظرانداز
نہیں کیا ہے) اس قدر تاریک اور افسوسناک ہے کہ جسکو دیکھ کر نظر کے
سامنے ایسا زمانہ آجاتا ہے، جس کے لئے ذیل کے الفاظ شاید مکمل نہ تصویر
ہوں:۔

"پے در پے ایک کے بعد دوسری لغو دلائل باتوں کو رواج
دیا جا رہا تھا، مسلسل جنوں انگیز تجاویز بروئے کار لائی جا رہی
تھیں، ناکامیوں کی انتہا نہ ہونے کے باوجود ضد کے طور پر
انہیں پر اصرار کیا جا رہا تھا، فتنہ و فساد کی کڑیاں برابر
ایک دوسرے سے ملتی جا رہی تھیں، صوبے پر صوبے
نکلے جا رہے تھے، ہلاکت و اموات کی بہتات تھی،
قحط افلاس کی گرم بازاری تھی اور ان تمام کے ساتھ
معصوم لوگوں کو بھی قتل گاہ میں نہایت بے رحمی کے
ساتھ ذبح کیا جا رہا تھا"

یہ اور اسی قسم کے واقعات ابتدائی تاریخ گردانی میں ملتے ہیں جن سے
سلطان کی فطرت، اس کے کردار سے متباین اعمال کا ایک لاانتہائی سلسلہ
پیش کرتی ہے اور موجودہ یا آئندہ نسل انسانی چاہے جسقدر بھی کاوش
کرے، برنی جیسے "زمانی" مورخ کے لکھے ہوئے واقعات اپنا وزن
نہیں کھو سکتے، کیونکہ ہندوستانی تواریخ بدقسمتی سے ایک خاص انداز
میں لکھی گئی ہیں، جن کا تعلق ماخذ سے ہے، اور اسی مخصوص طرز کی وجہ سے
تحقیق کرنے والوں کی مشکلوں میں اضافہ ہوئے بغیر نہیں رہتا، موجودہ
دور پر جنبہ داری کا جذبہ موجود ہے، لیکن ابتدائی دور میں ماخذ کا یہ عالم
رہا ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی شخص کے تاثرات کا حامل ہوتا تھا، جن میں جذبہ
تقابلی کی جگہ جذبہ ترجیحی ہمیشہ کارفرما ہوتا تھا، بے لوث و نقد و تبصرہ
بے کم و کاست محاکمہ اور رائے کی بات اور ہے لیکن "ترجیحی" جذبہ خیالی کے،

ساتھ جنبہ داری سے بری ہونا یکسر غلط ہے، اس لئے باوجود اس کے کہ برنی زمانی مورخ تھا لیکن وہ بھی اس جذبہ سے بری خیال نہیں کیا جا سکتا اس کے علاوہ اس کے مقالاتِ تاریخی کو اتفاقیہ طور پر بھی پڑھنے والا یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کہاں کس جذبہ سے متاثر ہو کر لکھ رہا ہے خصوصاً محمد بن تغلق تک جب وہ آتا ہے تو نہایت کھلے ہوئے انداز میں اس حسن تسلسل کو نظرانداز کر دیتا ہے جو اس کی تحریر کا خاصہ ہے اور بالکل انمل بے جوڑ طریقے پر اس کے حالات کی تقسیم تین حصوں میں کرتا ہے

(۱) سلطان کا کردار ــــــــ

(۲) وہ مجنونانہ تجاویز جن سے ملک کو نقصان پہونچا۔

(۳) وہ فتنے جو سلطان کی غلطیوں سے برپا ہوئے۔

اس قسم کی اچانک تبدیلی سے ظاہر ہے کہ برنی نے پہلے سے ایک خاص نظریہ قائم کر لیا تھا، اور اسی جچے تلے فیصلے کی وجہ سے اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ملا۔ سلطان کا نام آتے ہی کھل کھیلنے سے گریز ناممکن ہو گیا اور وہ اس جوش و غلبۂ خیال کو روک نہ سکا، جس سے ہر منصف مزاج مورخ کو الگ رہنے کی انتہائی ضرورت ہوا کرتی ہے، حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ بے لاگ فیصلہ ہوتا اور واقعات کا وہ رخ جس کا تعلق تاریخ سے ہے جنبہ داری و طرفداری سے بالکل الگ دکھائی دیتا، نہ صرف یہی بلکہ جب ہم قلمبند واقعات کو بنظرِ غور دیکھتے ہیں تو زبان و طرزِ زبان سے بھی اس تکدّر کا پتہ چلتا ہے، جو مسلسل طور پر بیان و حذف، اخفاء اظہار واقعات میں پوشیدہ ہے، اس کے علاوہ وہ خود نہایت کشادہ دلی سے واقعات کے تسلسل کے ترک کا یوں اظہار کرتا ہے:-

"میں نے واقعات کے تسلسل پر نگاہ نہیں رکھی ہے
کیونکہ ان کے سمجھنے کے لئے اس کی ضرورت نہیں ہے"

[ایڈورڈس رائٹرز آف بمبئی صفحہ ۵۲]

برنی کا یہ خیال ان کے حق میں ضرور مفید ہے۔ جو اس کی طرفداری وفاداری کے قائل ہیں اور اس کے اخفاء و اظہار تحریف و انکسار کا یقین رکھتے ہوئے، واقعات کو سچ جانتے ہیں، لیکن اس کی ضرورت ان کو ضرور ہے جو واقعات کی صحیح تصویر دیکھنے کے متمنی ہیں!

برنی کی اغلاط سے۔ چونکہ وہ گوش آشنا نہیں ہیں۔ نہایت آسانی سے گذرا جا سکتا ہے اور اگر ہم چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ بحیثیت ایک پکے مسلمان کے اس نے ان واقعات کو حذف کر دیا تھا جن کا تعلق جو ہار کی ریاست سے ہے ہم اس کے حملے کے ایک رخ پر نظر ڈال کر گذر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ برنی ان سے اس لئے گذر گیا کہ وہ کچھ زیادہ وزنی نہ تھے، ہم برنی کے اس قول کو بھی مان لیں گے جس کا تعلق تسخیر سرزمین بمبئی سے ہے، لیکن ان تمام مراعات کے بعد بھی یہ کسی طرح ماننے کی بات نہیں ہے کہ وہ ایک "وفادار عامل" اور خاندانِ حلیف کے باوجود ان واقعات پر بھی پردہ ڈالدے گا، جو کور نظروں کو بھی نظر آ سکتے ہیں۔ اور جو اگر چھپائے نہ گئے ہوتے تو اس کے آقا کے کردار کو بہت حد تک وقیع ثابت کرنے کے کام آتے!

اور پھر اگر الزامات ایک ایک کر کے گنائے جا سکتے ہیں، اگر غلطی اور اجتہادی غلطی کو روشن طور پر نمایاں کیا جا سکتا ہے اگر نقائص ہی کو پیش نظر رکھ کر کسی کا کردار مراتب کیا جا سکتا ہے تو ضرور کیا جائے لیکن دیگر معاصرین کے لکھے ہوئے واقعات پر کس طرح پردہ ڈالا جا سکتا ہے؟ کیا وہ خطرناک قسم کے ہنگاموں کا فرو کرنا قلعہ کانگرا، پیرامئو اور گوگو کے ان بحری قزاقوں کا استیصال۔ جنہوں نے ۱۳۴۲ء میں ملکھراجی گوپل کی سرداری میں سواحل کرنال اور جزائر میں ایک تہلکہ ڈال رکھا تھا۔ دربار کی عظمت و شان، ایران، چین، خوارزم، اور جاوا کے سفرا کی آمد، ملکی ماحول کی دیکھ بھال، تجدید عہد و مراعات، محاصل اور خشکی میں کمی، سکے اور انکی ضرب میں اختراع، آئین دیوانی کی اصلاح اور اشکال اقتصادیات حل کو فراموش کیا جا سکتا ہے اور کیا ان واقعات کی موجودگی میں سلطان کی وہ تصویر جو برنی نے پیش کی ہے، بالکل دھندلی نہیں ہو جاتی؟

تاہم برنی ایک ہوشیار اور زیرک مورخ ہے، اس کی غلطی کو جلد گرفت کر کے پیش کر دینا آسان نہیں ہے مگر "دروغ گو را حافظہ نباشد" کا قول بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، اس لئے یہ لکھنا کہ

"سلطان کے مشیر زیادہ تر شاعر، فلسفی اور دہریئے تھے"

اپنی جگہ پر ٹھیک ہو سکتا ہے مگر ثبوت کے لئے نام گنوائے جاتے ہیں

توان میں عبید شاعر بھی نظر آتا ہے، جو خود برنی کے قول کے مطابق، محمد بن
تغلق کے عہد حکومت سے قبل، بغاوت میں ماخوذ ہو کر مارا جا چکا تھا! غالباً
اس کا نام لکھتے وقت برنی پر وہ جذبہ طاری ہو گیا ہوگا، جس کا تعلق
"خود فراموشی" سے ہے، یا یہ کہ کس امر کے ثبوت کے لئے صداقت و احتیاط کی
ضرورت نظر انداز ہو گئی ہوگی! !!

اغلاط سے قطع نظر التباس واقعہ کے علاوہ برنی کا طرہ امتیاز یہ بھی
ہے کہ وہ جب چاہتا ہے، نہایت کامیابی کے ساتھ کسی واقعہ کے خبر و خلاصہ سے
جس پر انحصار نقد و تبصرہ ممکن ہو، بالکل آنکھیں بند کر کے گذر جاتا ہے۔
عین الملک کی بغاوت کا واقعہ اسی ضمن میں آتا ہے جس کے متعلق اس نے
لکھا ہے کہ کس طرح کچھ لوگوں نے سلطان کی سخت گیریوں سے گھبرا کر دہلی سے
بھاگ کر عین الملک کے یہاں پناہ لی تھی، اور پھر کس طرح سلطان نے حکم
بھیجا تھا کہ ان کو گرفتار کر کے سزا کے لئے واپس کیا جائے، لیکن نتائج پر
نظر کر کے اور سلطان کی مذبوحانہ حرکت سے متاثر ہو کر ان سب کے لئے
چارہ ہی نہ تھا کہ وہ بغاوت کی آڑ میں پناہ لیں! کیا یہ حال پڑھ کر
ذہن و خیال میں یہ بات نہیں آتی، کہ سلطان کتنا بے رحم، سفاک اور
ظالم تھا، کیا اس سے یہ مترشح نہیں ہوتا کہ اس کے مقابلے میں پناہ دینے والے
اپنی جانیں خطرے میں ڈالنے والے نہایت رحم دل تھے کیا اس سے سلطان کی
جارحانہ اور سفاکانہ عادتوں کا یقین نہیں ہوتا؟ کیا اس قسم کے تاثرات سے
اس کے خلاف تمام تاریخی ماخذ لبریز نہیں ہیں اور کیا۔۔۔ بغاوت کرنیوالوں کی
ہستیاں لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ کی مصداق نہیں نظر آتیں!؟!

ایک بات نہایت قابل غور ہے کہ علامہ برنی نے ایک واقعہ کو نظر
انداز کر دیا ہے۔ وہ یہ نہیں لکھتے کہ مفرورین کی سلطان کی سختی سے ڈرنے کی
وجہ کیا تھی، دوسرے اہل قلم بھی جہانتک حالات سے اس کا تعلق ہے، غیر
ذمہ دارانہ طور پر گذر گئے ہیں۔ یہ واقعہ ان ایام قحط کا ہے جو اپنی تمام شدت و
ہلاکت کے ساتھ ان تمام اضلاع پر محیط تھا، جو گنگا سے مغربی سمت واقع
تھے، مردم خوری پنجابی علاقوں میں ہی جاری نہ تھی، خود دار الریاست
بھی اس سے محفوظ نہ تھا، سلطان ایک زبردست مہم سے واپس آیا تھا،
خستگی و علالت سے مجبور ہو رہا تھا، لیکن وہ اس وبا کے دفاع میں نہایت
انہماک کے ساتھ مصروف ہو گیا، اس سے پہلے انیسویں صدی کے ربع صدی تک
کسی ہندوستانی نظام سلطنت نے اس طرح ایسے اہم مسئلہ کو اتنی کامیابی کے
ساتھ طے نہ کیا تھا، وہ سعی و کاوش جو اس بالغ نظر سلطان نے کیں وہ عام
طور پر مشہور ہیں، لیکن خاص طور سے جو اس نے دار الریاست کے بچانے
میں کوشش کی وہ کم مشہور ہے، مگر جب تک تاریخ کے اوراق موجود
ہیں، مردم شماری محلے محلے اور کوچے کوچے کی علیحدہ علیحدہ فہرست باشندگان کی
تیاری، تھوڑے تھوڑے لوگوں کو خاص خاص معتمد حکام کے تحت میں تقسیم کیا
تاکہ اشیاء خورونوش کی فراہمی میں دقت نہو، یہ اور ایسی دیگر باتوں کو
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، ناممکن ہے، کیونکہ ابن بطوطہ جو اس عہد کا مورخ
ہے خود ایک معتمد رفاہ عام کی حیثیت سے کام کرنے پر مامور تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ تمام دوسرے نظام کو معطل کر کے اس مہلک
اور اہم عذاب کو برطرف کرتا تھا، اسی زمانے میں بعض حکام نے غداری پر
کمر باندھی، اپنے بھائیوں کی پریشانی کا نفع اٹھانے کا موقع سمجھا اور وہ
رقم خطیر جو رفاہ عام کے لئے تھی، خرد برد کرنے لگے، مگر خفیہ نگاہ رکھنے والوں سے
کس طرح بچ سکتے تھے، گرفتار ہوئے، اپنی سزا کو پہونچے، لیکن ان میں سے
اکثر اودھ کی طرف بھاگ نکلے جہاں عین الملک کے بھائی موجود تھے، اور
ایک عرصہ سے بغاوت کی فکر میں تھے، انہوں نے ان مفرور مجرموں کو
ہاتھوں ہاتھ لیا، جاگیر اور روپیہ سے تواضع کی اور اپنے بہی خواہوں میں
انکا نام لکھ لیا،۔۔۔ لیکن واقعہ کی تصویر برنی کے بیان کردہ واقعات کے
بالکل برعکس ہے وہ ان کا فرار دہلی کے قحط کے سلسلے میں ضرور بیان
کرتا ہے، لیکن بھاگنے کی صحیح توجیہہ کو نظر انداز کر جاتا ہے، مگر صرف برنی کی
اغلاط والتباس کے بیان ہی سے، سلطان کے کردار و طرز حکومت کا اصل
نقشہ سامنے نہیں آسکتا ہے، بلکہ اس کے عہد حکومت میں بعض واقعات
ایسے ہوتے ہیں جنکو بدفعات جانچنے اور پرکھنے کی ضرورت ہے ان واقعات کی
تقسیم پانچ دفعات میں ہو سکتی ہے۔

(۱) دوآبہ کی آراضیات پر اضافہ لگان ——
(۲) دہلی سے دیوگیر کو دار الخلافہ کی تبدیلی۔
(۳) تانبے کے سکے کا اجراء ——

(۴) فتح خراسان کا عزم

(۵) مسلمانوں کے ساتھ مراعات خصوصی ——

یہ ہیں وہ واقعات جن پر اہل قلم نے مختلف قسم کی حاشیہ آرائیاں کی ہیں لیکن جہانتک علل واسباب کے حقائق کا تعلق ہے، تقریبًا سب نے چشم پوشی کی ہے، ورنہ سلطان کے کردار سے وہ باتیں ہرگز متعلق نہ ہوتیں جو ایک حکمراں کو بدنام کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہیں، اس لئے ذیل کی توجیہات پر حق پسند نظروں کی طلب بے جا نہیں ہے۔

دوآبہ کی اراضیات، ملک میں سب سے زیادہ زرخیز تھیں اور اضافہ لگان کی مستحق، علاوہ اس کے یہ اضافہ اُس سے زیادہ نہ تھا جو اس کے بعد کے زمانوں میں کیا گیا، یہ دوسری بات ہے کہ بدقسمتی سے اضافہ لگان کے ساتھ ہی قحط بھی رونما ہو گیا، جس پر کسی انسان کو قابو نہیں اس دوآبہ کی اراضی پر علاء الدین کے زمانے میں سیاسی اغراض کے لئے زمینداروں کاشتکاروں کو پچاس فیصدی محصول دینا ہوتا تھا، اور اس کا نام خراج تھا (برنی) اس رقم کو قطب الدین نے کم کر دیا تھا لیکن کسقدر؟ اسکی تفصیل نہیں ملتی، غیاث الدین تغلق نے دس فیصدی محصول کر دیا تھا، لیکن اس کے علاوہ بعض حالتوں میں اضافہ بھی ممکن تھا، محمد بن تغلق نے اس رقم کو بیس فیصدی کر دیا تھا، کیونکہ بقول برنی، اس اضافہ سے ۵ سے ۱۰ فیصدی وصولیابی کی زیادہ امید تھی، لیکن طبقات اکبری کا مصنف نظام الدین احمد لکھتا ہے کہ ۱۰ فیصدی اضافہ کیا تھا، فیروز شاہ نے اس کو پھر دس فیصدی کر دیا تھا، کیونکہ اس کے خیال میں یہی آئینی تخمینہ تھا، الغرض ان تمام اختلافات سے نتیجہ بہ آسانی نکل آتا ہے کہ ان اراضیات پر، پچاس فیصدی محاصل کے برداشت کی قوت تھی، اضافہ یا کمی حالات کے ماتحت ہوتی رہی اس لئے اگر محمد بن تغلق نے اضافہ لگان مالی کمزوری کی وجہ سے منظور کیا تو کیا برا کیا؟ کیا دیگر حکمرانوں نے ایسا نہیں کیا تھا؟ کیا اب محصول میں کمی زیادتی نہیں ہوتی؟ لیکن متعصب اہلِ قلم کو کیا کہیئے کہ انہوں نے سلطان پر جانے کتنے الزام اس اضافہ لگان کے سبب سے لگا دیئے

ایک عام خیال اہلِ تاریخ کا یہ بھی ہے کہ دوآبہ سے مراد گنگا اور جمنا کے مابین کی اراضی ہے، مگر یہ درست نہیں ہے، کیونکہ اس کا مفہوم ہر زمانے میں بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہتا ہے، اُس زمانے میں اس کا تعین ذیل کی جگہوں پر تھا۔

مشرق میں دریائے گنگ، مغرب میں دریائے ستلج،
شمال میں قنوج، آگرہ، اور راجپوتانہ۔

یہی وہ خطۂ ملک تھا جس میں شجاع افراد کی آبادی کی کثرت تھی اور اکثر وبیشتر اس حصۂ ملک میں بغاوتیں رونما ہوتی تھیں، جو خود اپنی جگہ ایک وجہ اور ضرورت ہے، اضافہ لگان اور محاصل کی، بھول نہ جایئے کہ اس کی ضرورت اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ سلطان کی اس تدبیر نے بہت کچھ لوگوں کی سرکشی کو دبا دیا تھا اور پھر جنگ کی ضرورتیں محاصل کو بڑھانے کی سب سے بڑی وجہ ہوتی ہیں۔ اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک کا زمانہ ہندوستان ہی کے لئے ایسا زمانہ اضطراب انگیز رہا ہے کہ تعزیری افواج محاصل کی ضرورت پڑتی رہی اور تمام لوگوں نے اس کو بخوشی ادا کیا، بڑے مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس تعزیری محاصل کے شکار اس زمانے میں بھی زیادہ تر وہی خطۂ ملک رہا، جو زمانہ سلطان محمد بن تغلق میں تھا، مثلاً الٰہ آباد، آگرہ، اجودھیا، بنارس اور غازی پور وغیرہ وغیرہ! حالانکہ اس زمانے میں گورنمنٹوں نے نہ معلوم کتنے طریقے روپے وصول کرنیکے ایجاد کر رکھے ہیں، معمولی کاغذ کے ٹکڑوں پر وہ لاکھوں روپئے حاصل کر لیتی ہیں، پھر بھی ٹیکس کی بھرمار ہے اور جنگ کے زمانوں میں تو بہتات ہو جاتی ہے، مگر یہ ٹیکٹ یا تدبر ہوتا ہے! کیا لوگ لارڈ ہیسٹنگز کی عہد حکومت بھول جائیں گے؟ اس نے روپیوں کو وصولنے کے لئے کیا کیا سختیاں نہیں کی تھیں، اور یہ سختیاں بالکل بے جا کہلا سکتی ہیں، مگر کوئی

اس کو تو دیوانہ نہیں کہتا؟ اس نے تو حکومت کی بھلائی کے لئے یہ باتیں کی تھیں!!! -

اچھا اب ذرا ان الفاظ کو بھی سن لیجئے جو برنی نے اضافہ لگان کیلئے لکھے ہیں :-

خراج ولایت میانِ دوآب، یکے بدہ، ویکے بیست
می بالا ستد"

ان الفاظ کا مفہوم دس گنا اور بیس گنا تصور کیا جاتا ہے، حالانکہ علم ریاضی سے دلچسپی رکھنے والے اس کا مفہوم ۱/۱۰ و ۱/۲۰ سمجھتے ہیں اور یہی قرینِ قیاس بھی ہے، کیونکہ دیگر کتب تاریخ میں پانچ فیصدی اور دس فیصدی سے زیادہ نہیں تسلیم کیا گیا ہے۔

(طبقات اکبری تاریخ مسٹر-۱۵۱۹۴ء فارگوسن برگس وغیرہ)

اس دوآبہ میں فتنہ وفساد رونما ہونے کے متعلق برنی لکھتا ہے

ہندوان فرہنا غلہ را آتش می زدند، سوختند مواشی را
از خانہا بیروں می کردند، سلطان ستداران و فوجداران را
فرمود تا دست و تاراج زدند ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ولایت
خراب می شد، دہم دراں ایام سلطان محمد تغلق برطریق
شکار در ولایت برن رفت"

اس کے اس بیان میں نشان زدہ جملہ قابلِ غور ہے۔ لیکن لکھنے والے نے بالقصد یہ لکھا ہے کہ

"اس قسم کی خرابی رونما ہو چکی تھی کہ اہلِ ہند و کھلیانوں
میں آگ لگا رہے تھے، مویشیوں کو بھگا رہے تھے
غلہ تمام جل کر خاکستر ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ایسے میں سلطان کا
حکم صادر ہوا کہ اہلِ فوج تاخت و تاراج، مار دھاڑ سے
کام لیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور خود باوجود اس کے کہ ملک چوپٹ
و ملیامیٹ ہو رہا تھا، ان ایام میں برن کی طرف شکار
کھیلنے میں مصروف تھا۔"

بادی النظر میں تو معلوم پڑتا ہے کہ ایک سادے سے واقعے کا بیان ہے مگر میں آپ کو بتاتا ہوں کہ برنی نے اس شکار کی آڑ میں کیا چیز پوشیدہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اس نے کس طرح "انسانوں کے شکار" کو "جانوروں کے شکار" سے بدل دیا ہے اور اس کو اہل نظر ہی خوب سمجھتے ہیں کہ اس ایک جملہ میں بے پروائی، شوق لہو ولعب معاملات کی اہمیت سے بےخبری کے کتنے زہریلے نشتر پوشیدہ ہیں؟ درآنحالیکہ واقعہ کچھ اور ہے جس کے لبستہ؟ کشادمیں اگر ایک طرف سلطان پر الزام آتا ہے تو دوسری طرف خود برنی اور اس کے اعزا کی بے وفائیاں پسِ پردہ رہ جاتی ہیں، اصل قصہ یہ تھا کہ دوآبہ میں جب بغاوتیں رونما ہوئیں تو قنوج اور برن کے لوگوں نے اس میں خاص طور پر حصہ لیا، یعنی یہی وہ مرکز تھے جہاں سے فساد کی چنگاری دُور دُور تک پھیل رہی تھی، اس لئے سلطان نے نہایت دانشمندی کے ساتھ اور اثر پذیر حصوں کو دیگر افواج کے انتظام میں چھوڑا اور خود مرکز کی طرف حملہ آور ہوا، اس کی خبر پاتے ہی باغی جنگلوں میں جا چھپے، جس کی وجہ سے لازمی طور پر سلطان کو جنگل جنگل تعاقب کرنا پڑا وہ اگر ایسا نہ کرتا تو وہ صورت کہ جب موقع ملتا باغی حملہ آور ہوتے، کھلیانوں کو آگ لگاتے، کھیتوں کو ویران کرتے اور پھر جنگلوں میں روپوش ہو جاتے کبھی نہ تبدیل ہو سکتی، اب رہی یہ بات کہ برنی نے ایسا الزامی جملہ کیوں لکھا، سو اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ برن و قنوج کے باغیوں میں خود برنی کے اعزاء شریک تھے، اور نہ صرف شریک تھے بلکہ اپنی اعزازی حیثیت کے لحاظ سے سرگروہ تھے، اس لئے اس کو پسِ پردہ رکھنا مقصود تھا، اور پھر چونکہ یہ لکھتے ہوئے دل دکھتا تھا کہ سلطان کے اس شکار میں جانوروں اور درندوں کی جگہ خود اس کے اعزاہ بے وفا اور باغی اقربا ہدف تیر و تفنگ بنے تھے، اس لئے نوعیت بدل دینے ہی سے مقصود حاصل ہو سکتا تھا، یعنی شکار کھیلنا بیان ہو جائے، اور باغیوں کی جگہ خود غریب سلطان موردِ الزام ٹھیرے!

(۲) دار الخلافہ کی تبدیلی کے متعلق، رائے قائم کرنے سے پہلے اس وقت کے سیاسی جغرافی حالات کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے، پیش رفتہ سلاطین تغلق کی سلطنت تھیں۔ تقریبًا۔ غیر متعلق حصوں میں منقسم تھی، حصہ اول وادی گنگ، پنجاب و لاہور، وادی انڈس اور شمالی ملتان پر محیط تھا، حصہ دوم ـــ اگرچہ پہلے سے چھوٹا تھا لیکن دشوار طلب

ضرور تھا۔ مشرقی خاندیش، برار و حیدر آباد اور مشرقی مدراس شامل تھا حصہ سوم، شمالی گجرات اور خلیج کھمبے پر محیط تھا، اور پہلے دو حصوں سے بہت مختصر تھا، لیکن قدر و قیمت میں اس کی حیثیت بہت زیادہ تھی، کیونکہ ممالک غیر سے تجارت کا یہی مرکز تھا، ان غیر متعلق حصص کو جو حصہ ملک ملاتا تھا، وہ ایک تنگ مقبوضہ تھا، جو گوالیار سے دھار اور وہاں سے جنوب و مغرب کو چلا جاتا تھا، اس کے علاوہ نگرانی کے لئے چند گڑھ اور قلعے رتبین کی سرحد میں بھی تھے، چنانچہ ابن بطوطہ جو اس رستے سے گذرا تھا لکھتا ہے کہ برنان ایک جگہ تھی جسپر اغیار کے حصار میں مسلمانوں کا قبضہ تھا، اس کے علاوہ دو وجہوں سے جن کا ذکر یاد رکھئے کہ برنی نے نہیں کیا ہے۔ ابتدائے حکومت میں ثقل مرکز بہت دور ہٹ گیا تھا، اول یہ کہ پنجاب کا علاقہ جو صدیوں سے مغلوں کی حوصلہ مندیوں کا مرکز تھا، نہ صرف تاخت و تاراج ہو چکا تھا، بلکہ اس عہد کے زبردست سیلاب نے اسکو بالکل ویران کر دیا تھا، دریا کا رخ بدل چکا تھا، لاکھوں نفوس انسانی بے گھر و بے در ہو چکے تھے، دوسرے یہ کہ اسی زمانے میں جنوبی حصہ ملک میں صوبۂ دکن کا الحاق بھی ہوا تھا، اس نئے الحاقی صوبے کی حالت شمالی حصہ ملک سے بالکل الگ تھی، اس کے جنوبی اطراف میں جنگجو سلطنتیں موجود تھیں، پورا صوبہ ابھی پوری طرح قبضہ و اختیار میں نہ آیا تھا، اس لئے اس کے لئے کئی تدبیریں اختیار کی گئیں پہلی تدبیر وہ تھی، جس کا تعلق زیر بحث مسئلہ سے ہے، یعنی نئے صوبوں کا سلطانی مقبوضات میں الحاق اور دیوگیر کو اس کا دار الخلافہ ثانی قرار دینا، جو دہلی کی بہ نسبت زیادہ مرکزی حیثیت رکھتا تھا، اور مقام خطر سے بالکل قریب تر۔

اگرچہ مکمل تفصیل سے کتابیں عاری ہیں، لیکن یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ سلطان کی غیر حاضری اور جنوب میں موجودگی کے زمانے میں وزیر سلطنت شمالی حصہ ملک پر پورے قبضہ و اختیار کے ساتھ سلطان کی نیابت کرتا تھا، اگرچہ دونوں دار الخلافے ایک دوسرے سے بسیط فاصلہ پر تھے، لیکن ذرائع رسل و رسائل نہایت معتبر و منظم تھے، اور کوئی دقت نہ ہوتی تھی، یہ ضرور ہے کہ اقتضائے مصلحت کی وجہ سے جو خارج از موضوع ہیں، اس تجویز کو مسترد کر دیا گیا، لیکن ابتدا میں سخت قسم کے مصائب کا مقابلہ کئے بغیر اس تجویز پر عمل ممکن بھی نہ تھا، لیکن مورخوں نے تجویز کی بنیادی چیز کا تذکرہ تو در کنار اس کی عملی حیثیت پر صرف بحث کی ہے

دار الخلافہ یا ضروری ارکان و عمال حکومت کی تبدیلی تقریباً ۱۳۲۷ء میں بہ لحاظ نظام مملکت عمل میں آئی تھی اور کئی برس کے بعد رعایا کے لئے نقل مکان کی نوبت آئی تھی، جسپر اسقدر لے دے مچائی جاتی ہے، عموماً تبدیلی دار الخلافت کی تاریخ ۱۳۳۷ء سے متعلق بتائی جاتی ہے۔ جو بالکل غلط ہے، کیونکہ یہ واقعہ اس زمانے سے پہلے کا ہے جب ابن بطوطہ ۱۳۳۳ء میں دہلی میں تھا، بدایونی نے اس واقعہ کا ظہور ۱۳۲۶ء لکھا ہے، اگرچہ صحت تاریخ کو وہ اکثر ملحوظ نہیں رکھتے، لیکن واقعات کے لحاظ سے وہ اس کا ظہور اس زمانے سے متعلق بتاتے ہیں، جب بہاء الدین یا بہادر گرشاسپ نے بغاوت کی تھی اور یہ بغاوت ۱۳۲۶ء میں ہوئی تھی، اس کے علاوہ دولت آباد کا وہ سکہ جو ۲۷ء سے متعلق ہے، اور جسپر (Monopolies [illegible]) "مرکز اسلام" کی عبارت کندہ ہے، اس امر کی پوری تصدیق کرتا ہے۔

ان حالات کی موجودگی سلطان کی تعمیری تجاویز جو دہلی سے متعلق تھیں، ان پر عمل اور ابن بطوطہ کا دہلی کی مرفہ الحالی کا عینی مشاہدہ ایسی شہادتیں ہیں جن کے مقابلے میں علامہ برنی کے مبالغہ آمیز بیانات کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتے، کیونکہ ان کے بیان کے مطابق

"دہلی میں ایک بلی یا کتا بھی باقی نہ رہ گیا تھا اور وہ لوگ جو دوسرے شہروں سے لائے گئے تھے ان میں سے کچھ تو مر گئے تھے اور کچھ اپنے وطن مالوف کو واپس گئے"۔

برخلاف اس کے جب ابن بطوطہ دہلی پہونچا ۱۳۳۴ء تو اس نے اس کو خالی اور کم آباد پایا، اور پھر آگے چل کر تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے کہ "دہلی میں کافی آبادی تھی"

یہ اختلاف حال ہے معاصرین کے ماخذ کا جسپر اس زمانے کی تاریخ کا انحصار ہے! برنی کے قول کو اگر قابل اعتبار کہا جائے تو یہ بھی یقین

کرنا ضروری ہوجاتا ہے، کہ ویران شدہ شہر دہلی کو پھر سے آباد کرنے کی تمام کوششیں ناکام رہیں، اور اگر ابن بطوطہ کے پہلے قول کو صحیح مان لیا جاتا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پرانی دہلی اور سیری بھی ویران تھی، کیا یہاں کے لوگ بھی دولت آباد چلے گئے تھے؟

ان اعتراضات کے جوابات برنی و بطوطہ دونوں کے خلاف ملیں گے، کیونکہ جہانتک علائق کا تعلق ہے اثبات میں نہیں مل سکتے برخلاف اس کے مہاجرین دہلی کو پنجاب کے سیلاب، قحط اور تاتاریوں کے حملہ سے بہت کچھ تعلق ہے، لیکن تاویل طلب چیز کو چھوڑ کر نہ صرف بنیادی چیز کو دیکھنے کی ضرورت ہے بلکہ اس خیال کی بھی ضرورت ہے کہ ایک نئے دار الخلافہ کے لئے جو کچھ حصہ ملک میں ہو، ضروری ہے کہ اسکو نئے طور سے آباد کیا جائے، اب سوال یہ ہوتا ہے کہ ایسا کون کر سکتا ہے، یہ بات کسی کے قبضہ واختیار میں ہے؟ اس کے علاوہ تبدیلی دار السلطنت کوئی نئی بات نہیں، عنبر، چتوڑ، فتحپور سیکری، مانڈو کا وجود اس امر کا شاہد ہے، ان کے علاوہ مکمل مثال فارس میں مل سکتی ہے جہاں کے بادشاہ الجیت خاں نے ہندوستان کے اس واقعہ سے صرف دس سال پہلے سلطانیہ ایک نیا شہر بنا کر تبریز کے لوگوں کو نقل مکان و ملک کرنے کا حکم دیا تھا، اب رہی یہ بات کہ محمد بن تغلق نے جو نقل دار الخلافہ کا حکم دیا تھا، اس کے متعلق طرح طرح کی حکایات کیوں مشہور ہوگئیں سو اس کی وجہ سوا اس کے کچھ نہیں ہے کہ ابن بطوطہ نے اپنے یہاں ہی ایک نابینا اور مفلوج آدمی کی کہانی لکھ کر اس افسانے کو طول دے دیا حالانکہ ابن بطوطہ اس لحاظ سے ہرگز معتبر نہیں ہے، کیونکہ وہ ایک سیاح کی حیثیت سے ملک میں تھا، اس لئے جو بات اس کے مشاہدہ میں نہیں آئی اسکو صحت کے درجے میں قلمبند کرنا محض اس لئے کہ وہ بات زبان زد تھی ہرگز زیبا نہ تھا، ذرا یہ سوچنے کی بات ہے کہ ایک کی زبان سے دوسرے کی زبان تک جاتے جاتے اس بات نے کتنی حاشیہ آرائی حاصل کر لی ہوگی؟ پھر اس کا یہ بیان اور معاصرین سے متباین ہے، چنانچہ برنی خود لکھتا ہے کہ مہاجرین کو نہایت فیاضی کے ساتھ ان تمام اشیاء کے لئے جنہیں ان کو چھوڑنا پڑا تھا، معاوضہ دیا گیا تھا، انکو پورے طور پر زادراہ وسامان سفر ملا تھا، اس کے علاوہ جب وہ لوگ نئے شہر میں آئے تو انعامات، جاگیریں اور زر امدادی سے انکی مدد کی گئی۔ بایں ہمہ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ ان میں سے کچھ راستے میں مرکھپ گئے ہوں گے، اکثر لوگوں نے سفر کی مشقت کو برا سمجھ کر دہلی کو واپس جانا چاہا ہوگا، اور ایسے بھی لوگ ہوں گے، جنہوں نے نئے ماحول وفضا کو بری نظروں سے دیکھا ہوگا، لیکن یہ بھی بالکل درست ہے کہ ان کے لئے بہت کچھ کیا بھی گیا تھا، مگر ہندوستان میں یہ بات قابل تسلیم ہی نہ تھی اور نہ لوگ اس جذبے سے آشنا تھے، کہ حکومت کی ضرورت کی وجہ سے انفرادی رائے اور خیال کے خلاف کوئی کارروائی ہو سکتی ہے اور اسی وجہ سے برنی نے صرف اس موقع پر جمہوری جذبے سے متاثر ہو کر اپنا تمام زور قلم غربا کی تکالیف بیان کرنے میں صرف کر دیا ہے۔

اسی کے ساتھ اس عہد کا ایک غیر معروف لیکن دلچسپ واقعہ تانبے کے سکے کا اجرا ہے، جسکو چاندی کے سکے کا ہم رتبہ وقیمت تسلیم کر لیا گیا تھا، یہ واقعہ غیر معروف اس لئے ہے کہ ہندوستانی مورخوں نے نہ صرف اس کو نظر انداز کر دیا ہے بلکہ تعجب تو یہ ہے کہ انہوں نے اس کو سمجھنے کی بھی کوشش نہیں کی اور دلچسپ اس لئے کہ دو معاصر مورخوں نے بھی یعنی ابن بطوطہ اور مصنف مسالک الابصار — جو اس قسم کی باتوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے، اس کا تذکرہ کرنا بھی گناہ خیال کیا ہے، برنی نے جو کچھ اس کے متعلق لکھا ہے وہ یہ کہ

> "تانبے کے سکے جاری کئے گئے اور ان کو ملکی سکہ تسلیم کر لیا گیا، جس کی وجہ سے ہر ہندی نے جعلی سکے بنانے شروع کر دیئے، انہیں جعلی سکوں سے مالگذاری ادا ہونے لگی نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کو سخت مالی نقصان پہنچنا شروع ہوا اور چونکہ وہ جلدی گھس جاتے تھے اس لئے ان کو پھر سے بنانا پڑتا تھا، جعلی اور اصلی سکوں میں کوئی امتیاز نہ رہ گیا تھا جس کی وجہ سے خزانے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچنا لازمی تھا"

برنی کے اس بیان میں جتنی کمزوریاں ہیں ان کو نظر انداز کر کے

صرف دو باتیں توجہ طلب ہیں ۔
(۱) تانبے کے سکے کیوں ایجاد کئے گئے ؟
(۲) یہ ایجاد کیوں ناکام رہی ؟

برنی کے خیال میں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سلطان کی فیاضیوں سے خزانہ خالی ہوگیا تھا، حالانکہ وہ اپنے اس بیان کی تردید بھی کر چکا ہے ۔ اس لئے اس کو پُر کرنا ضروری تھا، آگے چل کر یہی مورخ لکھتا ہے۔ کہ دارالخلافہ کی تبدیلی میں اسقدر خرچ ہوگیا تھا، کہ اس کمی کو اس طرح پورا کیا جاسکتا تھا، اس کے علاوہ کوئی اور اس سے زیادہ کچھ نہیں بیان کرتا، کہ سلطان کی حوصلہ مندیوں اور ناقابل عمل فتحمندی کے جذبات کیلئے زیادہ سے زیادہ رقم کی ضرورت تھی، اسوجہ سے یہ راستہ اختیار کیا گیا، دورجدید کے جتنے مورخ ہیں وہ سب کے سب انہیں میں سے کسی ایک کو اختیار کرکے کچھ اور اضافہ کر دیتے ہیں کہ ۔ یہ بھی منجملہ دیگر خبطی باتوں کے ایک جنونی بات تھی! اگر ان وجہوں کو سامنے رکھا جائے اور اس عہد کے قحط پر بھی نظر رکھی جائے تو ایک حد تک ان کی وجہ سے خزانے کا خالی ہوجانا ممکن ہے، اور عارضی طور پر مالیات پر اثر پڑنا ضروری ہے لیکن باوجود اس کے اسے صحیح توجیہہ تصور کر لینا ایک ایسی اہم اور انقلابی تجویز کے لحاظ سے درست نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ قیاس کرنا کہ یا تو محمد بن تغلق یا اس کا کوئی مشیر، مالیات کا پورا ماہر تھا، بالکل قرین مصلحت ہے اور پھر اس "مسی سکے" کے اجراء سے پہلے، سکوں کی شکل کی ترمیم سکہ گری کے محکمہ تدوین، سلسلہ اعتباریہ پر عمل اور سکہ گری کے اصول میں ایجاد وترقی عملی صورت اختیار کر چکی تھی جس سے یہ قیاس یقین کے درجہ تک جا پہونچتا ہے، اس لئے یہ گمان کہ اس کا اجراء محض خبط کی وجہ سے تھا، یا اس کی وجہ جہالت اور حرص کے الفاظ میں پوشیدہ ہے، غلط اور بے بنیاد ہونے کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے ۔

اس کے ساتھ یہ خیال کہ سلطان اس سکہ کے اجراء کو نہایت کامیاب دیکھنا چاہتا تھا، اور اس کے لئے سخت بیقرار ومتفکر تھا، بہت حد تک ٹھیک نہیں ہے، کیونکہ سکہ پر کسی قسم کی تنبیہہ منقش نہ تھی اور سلطان ایسی باتوں کا عادی نہ تھا، درآنحالیکہ اسی زمانے میں فارس اور چین میں کاغذی سکوں پر تنبیہہ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے، اگر اس نے کچھ کیا تھا تو یہ کہ اپنی رعایا سے درخواست کی تھی کہ وہ اس سکہ کو چاندی کے عوض قبول کرلیں! اسی درخواست میں تمام اعتراضات کا رازِ پنہاں ہے، اور اسی پر غور کرنے سے عقدۂ مشکل حل ہو جاتا ہے ؛

تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ برسوں پہلے سے چاندی کی فراہمی میں دنیا بے حد کمی اور دقت محسوس کر رہی تھی اور دہلی میں یہ وقت اسوقت محسوس ہوئی جبکہ ملک کا ایک بڑا حصہ اس قلمرو میں ملا لیا گیا تھا اور اس لئے سکہ کے اعداد وشمار میں نسبتاً اضافہ لازمی تھا، برخلاف اسکے ازمنہ وسطی میں چاندی کی فراہمی اسی قدر ممکن تھی کہ وہ محدود طریقوں پر اجرائے سکہ کے کام آسکے لیکن کسی اور وجہ سے اگر اس کا استعمال دوسری شکلوں میں ہونے لگے، تو لازمی طور پر سکوں کے لئے اس کی فراہمی کم ہو جائے گی اور یہ دونوں شکلیں رونما ہو چکی تھیں، ایک طرف ٹرانسلوانیا، سکسونی اور ہسپانیہ سے چاندی کی برآمد منقطع ہوگئی تھی تو دوسری طرف یورپ کے اکثر بلاد میں اور مشرق کے زیادہ تر شہروں میں چاندی، زیورات اور دیگر تعیش کی چیزوں کے بنانے میں صرف ہو رہی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ انگلستان، مصر، جاپان، فلانڈرس فارس، اور اسکاٹلینڈ میں بھی انہیں ایام میں جبکہ سلطان اس کی جگہ کسی اور دھات کی تلاش میں تھا، اس کی غایت کمی محسوس ہو رہی تھی جی ہاں ایک سوال ہوسکتا ہے، سلطان نے باوجود اس مسئلہ میں مہارت تامہ رکھنے کے کاغذی سکوں کا رواج دینا کیوں نہ ضروری سمجھا! درآنحالیکہ چین میں یہ عرصہ سے جاری تھا، اور جاپان میں بھی انہیں ایام میں اس کو رواج دیدیا گیا تھا؟ اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ ممکن ہے اس نے اسقدر اہم ترمیم مناسب نہ سمجھی ہو یا چھاپنے چھپنے کی دقتیں پیش پیش رہی ہوں، یا پھر یہ کہ ملک کی آب وہوا اس کے منافی نہ سمجھی گئی ہو، لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ اسباب پیشِ نظر نہ تھے، بلکہ ۱۲۹۴ء فارس کی اس اصول پر چلنے کے بعد ناکامی نے اس طرف توجہ کرنے سے باز رکھا اور جسکو مسترد کر دینے کے بعد تانبہ ہی وہ دھات ہوسکتا تھا، جسکو وزن اور احساس سے پرکھ سکتے تھے ؛

اس کے علاوہ اس ترکیب کا بالکل ناکام رہنا، خصوصاً ایسے

نافہم زمانے میں خالی از دلچسپی نہیں ہے، لیکن سلطان کی کوشش سے یہ بہت حد تک مقبول ہو چکی تھی، اس لئے اس کو کامیابی کے قریب تصور کر لینا یقیناً بے روک انصاف کی بات ہے، کیونکہ تقریباً تین سال تک "سکہ مسی" برابر چلتا رہا، صرف اس عرصہ کے آخر میں یہ کسی قدر عدم مقبولیت کی نظر سے دیکھا جانے لگا تھا، ابوبرنی کا یہ کہنا کہ ہر ہندی کا مکان ٹکسال بن گیا تھا، ایک ایسا مبالغہ ہے جس کو سکوں کی صفائی اور جعلی سکوں کے ڈھالنے والوں کا زجر و توبیخ سے محفوظ رہ جانیکے مقابلہ میں ہرگز تسلیم نہیں کیا جا سکتا، تاہم جہاں جعلی سکوں نے رواج پایا وہ کسی حد تک دکن کا صوبہ تھا، بایں ہمہ، جعلی سکوں سے زیادہ جس چیز نے اس تجویز کو سترد کرنے کی طرف قدم بڑھایا وہ سرمایہ دار فرنگی وہ چال تھی، جس کا تعلق دور کے صوبوں میں سونے اور چاندی کے سکوں کی خرید سے تھا اور جس نے بیرونی تجارتوں پر بڑا بار ڈالدیا تھا، پس سکوں کے کونوں پر سونے کا وجود اور چاندی کے سکے کا عدم اجراء فطرتاً نئے سکے پر اثر انداز ہوا، لیکن سلطان فطرتاً اس حال میں بھی کاہل نہ رہا بلکہ اپنی سابقہ سرعت کے ساتھ نہ صرف ایمانداری سے بلکہ مالیاتی فہم و فراست کے ساتھ معرض بحث سکوں کو گلا دینے کا حکم دیدیا اور تمام تانبے کے سکوں کو اصلی قیمت پر چلانے کا حکم نافذ کر دیا، اگرچہ یہ طریقہ کار مزید اخراجات کا طلبگار تھا، لیکن اس سے آئندہ کی تمام تلبیسی جرائم معدوم ہوگئیں اور ٹکسال کا وزن برابر ہو گیا، جس کی وجہ سے ابن بطوطہ جو دو برس بعد ہی ہندوستان آیا تھا، اس اہم تبدیلی اور ترمیم کا کہیں ذکر نہیں کرتا، اس لئے ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ایک مصیبت ایک مشکل اور ایک دقت کا مقابلہ اسی طرح کیا جا سکتا تھا، اور اس کو کسی طرح خبط یا جنون سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اب رہی یہ بات کہ وہ ناکام کیوں رہا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کی جگہ جو بھی ہوتا ناکام رہتا، حالات ہی ایسے تھے اور پھر اگر کسی ترکیب یا تجویز کی ناکامی ہی پر جنون و سکون کا انحصار ہے تو اسوقت بھی جبکہ ایک دماغ سے زیادہ دماغ ایک ہستی سے زیادہ ہستیاں غور و فکر کے بعد اکثر لائحہ عمل بروئے تجربہ لاتی ہیں لیکن شدید ناکامی کے بعد اس کو ترک کر دیتی ہیں تو حضور کیا ان سب کو مجنون و خبطی ہی تصور کیا جاتا ہے، کیا محکمہ محاسبہ اور حساب ( ) کو علیحدہ کر کے لاکھوں روپیہ خرچ کرنے والے تمام پاگل تھے؟ کیا کوہ ہمالیہ کی چوٹی تک پہونچنے کا خبط ہر سال اپنے دورنگی وجہ سے جنون کہے جانے کا مستحق ہے؟ کیا اس کی تائید کرنے اور ناکامی پر افسوس کرنے والوں کو پاگل نہیں، تو "مجنون دوست" کہا جا سکتا ہے؟

کیا قرضۂ جنگ عظیم کی عدم ادائیگی کا احساس اور سونے کا تمام ہندوستان سے اخراج، بینک میں زر کی کمی، کاغذی سکوں کی کثرت اسی امر کی متقاضی ہے کہ ہوائی ذریعہ رسل و رسائل — باوجود پیہم نقصان جان و مال — مستقل طور پر ایک ذریعہ بنا لیا جائے اور دنیا میں آئندہ اس کے سوا کوئی اور ذریعہ نہ رہے؟ کیا یہ ایک جنون انگیز ایک سعی تباہ کن اور ایک تجویز خبط نہیں ہے؟

فتح خراسان کا عزم - تجویز سکہ کے بعد مہم خراسان ہے جس پر برنی اور اس کے بعد والوں نے شدت کے ساتھ اعتراضات کئے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ اسی قدر وحشتوں سے بھری اور تنہا تجویز تھی؟ جسقدر کہ ہم سے اس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے؟ جہانتک واقعات کا تعلق ہے اس کا جواب نفی ہی میں تاریخ سے مل سکتا ہے، ورنہ کیا محمود غزنوی شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی وغیرہ وغیرہ سب کے سب خبطی تھے، کیا انہوں نے ایسے خواب نہیں دیکھے، کیا نپولین اعظم بھی خبطی تھا جس نے روس کیلئے جاڑے میں افواج بھیجی تھی، جہاں تقریباً ان کا زیادہ حصہ برف میں جم گیا تھا، لیکن کسی تاریخ دان کے قلم میں یہ جرأت نہیں کہ وہ اس کو مجنون اور خیالی انسان لکھ سکے، اچھا اب ذرا اس عزم کے اسباب سنئے۔

خراسان و فارس ابوسعید کی کمزور طبیعت کی وجہ سے اپنی طاقت کھو چکے تھے، اس کا زبردست مشیر امیر چوپان[1] مر چکا تھا، حالانکہ اس نے

[1] امیر چوپان فی الحقیقت امیر ابوسعید کا ایسا ہی بزرگ تھا جیسا بیرم خاں، اکبر کا، قضا کار امیر ابوسعید امیر چوپان کی حسین و جمیل لڑکی طاہرہ پر فریفتہ ہو گیا، شادی کرنی چاہی لیکن چوپان راضی نہ ہوا، ابوسعید وقت کا منتظر رہا موقع پاکر امیر چوپان کا گلا گھٹوا کر مروا ڈالا، سلاطین کے عشق کی داستانیں نہایت طویل ہیں انہیں سے یہ واقعہ بھی ڈرامہ فسانہ اور ناول نویس کیلئے ایک خاص ماحول رکھتا ہے

اپنے ابتدائی دور میں محلوں کی بنیاد ڈالدی تھی، اس کے مغربی اور شمالی محاذ پر دو نبرد آزما قوتیں محض مالِ غنیمت کی فکر میں لگی رہتی تھیں، ہر طرف طوائف الملوکی کی رونمائی تھی، ایک چغتائی حکمران، ترمشیریں خراسان پر کئی بار حملہ کرنے کی جرأت کر چکا تھا، اور اب محمد بن تغلق کا حلیف تھا، دوسرا شاہ مصر تھا جو مغربی حصہ ایران پر تاخت کر کے ایرانی افواج کو غلط راستے پر لگانے کی دھمکی دیرہا تھا اور اس کے پاس بھی محمد بن تغلق نے اپنا سفیر بھیجا تھا، خراسانیوں کی درخواست تھی کہ اسپر قبضہ کرلے...... ان اسباب کے باوجود تجویز عملی جامہ کے کسقدر قریب پہونچی تھی اس کا ثبوت سلطان کی ان ترکیبوں سے مل سکتا ہے جو عمل میں آئیں، اس کے تحائف اور وظائف جو اس نے اہلِ خراسان کو بھیجے یا دیئے، اسراف بیجا سے زیادہ کچھ نہ ہوتا، اگر اس تجویز کو محض آئندہ پر اٹھا رکھا گیا ہوتا اور اس الزام سے بچنے کی صورت، اس کے سوا کوئی نہ تھی کہ اس کو فوراً عملی جامہ نصیب ہو، مگر بدقسمتی سے اخیر زمانے میں یہ تجویز ناکام رہی اور تمام عملی سرگرمیوں پر اوس پڑگئی اور اس خیال کو قطعی چھوڑ دیا گیا، جس کو قبل از وقت کہا جا سکتا ہے، لیکن یہ قبضہ بعد از نتیجہ بھی ہوسکتا تھا تاہم یہ دیکھنا باقی ہے کہ تجویز ناکام کیوں رہ گئی؟

برنی ——— یا تو ان واقعات کی بے خبری کی وجہ سے جو ہندوستان کے باہر ہو رہے تھے، یا پھر اس خیال سے کہ وہ ایک چیز کو جانتے ہوئے سمجھنا نہیں چاہتا ——— اور دوسرے ہندوستانی مورخ اس کے جواب میں خاموش ہیں، لیکن خوش قسمتی سے دوسرے ماخذ ایسے موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ تین باتیں ایسی جمع ہوگئی تھیں، جنہوں نے ایسی امید افزا تجویز کو مسترد کر دیا۔

اول یہ کہ مصر کے خدیو نے اس کام کے انجام دینے سے انکار کر دیا، جو اس کے سپرد تھا، دوم یہ کہ چین نے مداخلت کر دی کیونکہ وہ ترمشیریں ——— جو اس کا ہمسایہ تھا ——— کی قوت کو بڑھتا نہ دیکھ سکتا تھا، سوم یہ کہ عین وقت پر ترمشیریں کو اس کے امرانے معزول کر دیا، امیر ابوسعید سے دوستانہ تعلقات بھی قائم ہوگئے اور یہی سب سے زیادہ سخت اور مہلک ردعمل تھا، جس نے محمد بن تغلق کو بالکل تنہا چھوڑ دیا اور ایسے میں اس کے سوا چارہ ہی کیا ہوسکتا تھا کہ عزم کو فسخ کر دیا جائے

اس تجویز کے اختیار کرنے کے بعد یہ کہنا کہ اگر سلطان دہلی کے لئے یہ تجویز قابو سے باہر تھی تو "فتح چین" کا عزم تو اور بھی مخبوط ہونے کا ثبوت دیتا ہے، اپنی جگہ پر قرین مصلحت اسوقت ہوتا، جب ہمالیہ اور تبت سے فوجیں گذر جاتیں اور پیکن تک جا پہونچتیں؛ لیکن سچ تو یہ ہے کہ تمام الزامات کے سلسلے میں یہ الزام سب سے زیادہ لچر پوچ نادرست اور کم عقلی پر منحصر ہے اسی کے ساتھ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ الزام دینے والے غیر ملکی اور اُن خارجی تعلقات سے بالکل بے بہرہ تھے، جن کے رونما ہونے یا نہونے پر سلطان کو کوئی اختیار نہ تھا کیونکہ آچل کی مہم کا مفہوم ایک ہمسایہ کوہستانی سلطنت پر قبضہ کرنے کے سوا کچھ نہ تھا، تاہم یہ ضرور ہے کہ اسپر قبضہ کر لینے کے معنی یہ بھی تھے، کہ ممالکِ چین پر نگاہ رکھی جاسکے اور اس قسم کی پیش بینی ہر بالغ حکمران کا حق ہے اور پھر اس مہم کا نہ صرف پورا پورا تعلق فتح کنگڑا سے ہے جو پچھلے سال حاصل ہو چکی تھی ——— بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسی مہم کا ایک ناتمام حصہ تھا اس کے علاوہ آثار و قرائن نے اب اس امر کو پوری طرح واضح کر دیا ہے کہ جس حصہ ملک پر حملہ کیا گیا تھا وہ اس زمانے میں "کالو" کہلاتا تھا اور اس قطعہ ملک پر حملہ سوائے اس لئے کہ دہلی کی سلطنت میں اضافہ ہو، اور کسی بات پر محمول نہیں ہوسکتا؛

بعض تاریخوں سے ہم قراجل کا دہلی سے کم مسافت پر واقع ہونا ثابت ہوتا ہے، چنانچہ ابن بطوطہ نے اس کی مسافت دہلی سے دس میل لکھی ہے، قیاس یہ بھی کہتا ہے، قراجل کے بجائے وہ جگہ ہماچلی ہوگی، جو آگے چل کر ہمالیہ کے نام سے پکاری گئی، بہر نوع وہ پہاڑی جگہ جو بھی ہو، لیکن ملک چین سے اس کو کوئی نسبت نہیں ہے، مہم بحیثیت مجموعی ناکام نہ تھی ——— حالانکہ برنی اس کا ذکر نہیں کرتا اور نہایت چالاکی سے بچا جاتا ہے ——— بلکہ جس مقصود کو پیش نظر رکھ کر یہ حملہ کیا گیا تھا، وہ حاصل ہو چکا تھا، دقت جو رونما ہوئی اس کا سبب یہ تھا کہ آگے بڑھ جانے والے ایک حصہ فوج نے باوجود امتناعی احکامات کے سرحد سے آگے بڑھنے کی کوشش کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مانسون جھیل کے

قریب یہ مصائب میں گرفتار ہوگیا، اسی کے ساتھ موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہی کوہستانی سخت بارش شروع ہوگئی، جس کی وجہ سے قراجل کی مہم سر کرنے والی فوجوں کو سخت دقتوں کا سامنا کرنا پڑا، وبائیں رونما ہوگئیں مختلف قسم کی بیماریوں نے آگھیرا، سپاہیوں کے ساتھ سردار بھی تکالیف میں پھنس گئے۔ نہ آجکل کا سا نظام فوج تھا، نہ طبی امداد بہ قدر منتظم حیثیت رکھتی تھی، اس لئے ہر فرد نے چھٹیوں کی درخواستیں دینی شروع کر دیں بالکل بارش میں بھیگی ہوئی، بیمار اور بے جگر فوج تھکی ماندی دہلی کی طرف آہستہ آہستہ واپس ہونے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ کوہستانی جرگے ایک ایک کرکے جمع ہونے لگے، اور پیہم حملوں سے تمام فوج کو تباہ کر دیا، اس تباہی و بربادی کے اثر نے تمام مورخین کے دماغوں کو اسقدر متاثر کر دیا ہے کہ انہوں نے اس کے مقابلے میں "حاصل" کا خیال بالکل چھوڑ دیا، اور عام طور پر سلطان کے سر یہ الزام رکھدیا کہ اگر فوج اور اس کے سردار منتخب ہوتے تو یہ دن دیکھنا نہ نصیب ہوتا! اس زمانے میں بھی جبکہ فوجی نظام نکھر چکا ہے، جبکہ موسمی تکالیف سے بچنے کے تمام سامان فراہم ہوچکے ہیں، رسل و رسائل طبی امداد کے ساتھ ہوائی قوتیں مہیا ہوچکی ہیں، کیا منتخب سردار فوج کے باوجود اکثر مہم میں ناکامی و بربادی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا؟!

اگر جواب نفی میں ہے تو درۂ دانیال، جنگ تسلیجہ، سقوط، انٹیورپ جنگ سمرنا، وغیرہ کے متعلق کیا کہا جاسکتا ہے!؟! یہاں تک لکھنے کے بعد اب صرف پانچویں دفعہ یعنی "مسلمانوں کے ساتھ مراعات" باقی رہ جاتی ہے، اس کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے ماحول کے سمجھ لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ برنی کے اغلاط یا ماخذ کے استقصاء سے، ممکن ہے کہ ہم سلطان محمد تغلق کے متعلق اپنی رائے بدل دیں اور یہ کہکر چھٹکارا حاصل کرلیں کہ چونکہ برنی کو خود اور اس کے اعزہ کو استیصال بغاوت برن میں سلطان کے ہاتھوں نقصان پہونچا تھا، اسوجہ سے اس نے دل کے پھپھولے، اس کے خلاف زہر اگل کر پھوڑے ہیں، لیکن اس دفعہ کے جواب میں بغیر ماحول کو سمجھے ہوئے یہ کہنے کے سوا چارہ نہیں ہے، کہ سلطان کے غلط طریق عمل کی وجہ سے یہ صورت حال رونما ہوئی تھی۔

لیکن نہیں اس کا صحیح حل اس طرح حاصل نہیں ہوسکتا، اس کیلئے یہ صورت ہے کہ مسلمانوں کے دور حکومت ہند پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ ظاہر ہوگا، کہ التمش سے لے کر اورنگزیب تک حکمرانی کے دو طریقے رہے ہیں۔

(۱) وہ یہ کہ جسکی سند حرف بحرف قرآن سے ملتی ہو یا خلفائے پیشین کی تقلید۔

(۲) وہ کہ جن میں قیاس و اجتہاد کو دخل ہو یا جو علاءالدین خلجی کے اس قول کے مطابق کہ ——

"میں جو کچھ مفید سمجھتا ہوں —— رعایا اور ملک دونوں کیلئے
—— وہ کرتا ہوں خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز، میں
نہیں جانتا بلکہ اس کا فیصلہ خدا پر چھوڑتا ہوں"

اب چونکہ زیادہ تر تاریخی کتابیں انہیں حضرات کی تصنیف ہیں جو طریقہ اول کے دلدادہ تھے، اس لئے تمام سلاطین یا تو اچھے کہے گئے ہیں۔ یا برے، ان کی اچھائی یا برائی ان کے طریقہ حکمرانی پر منحصر تھی، بعض ایسے بھی تھے، جو طریقہ اول پر پورے طور پر کاربند نہ تھے لیکن ان کو بھی اچھوں کے زمرے میں رکھا گیا ہے، مگر اس انداز کے ساتھ کہ وہ پرہیزگار اور اچھے ضرور تھے، لیکن —— قرآنی احکام کی نامکمل پابندی کی وجہ سے —— انکو ناکام اور بے نتیجہ کار کا لقب ضرور دیدیا گیا ہے، سلطان ناصر الدین اور فیروز شاہ انہیں میں سے ہیں، لیکن التمش کی تمام توصیف کے بعد رضیہ کے انتخاب ولیعہدی پر اس کے خلاف ناک بھوں چڑھائی گئیں کہ اس کا عہد حکومت مشکلوں کی آماجگاہ بن گیا، علاءالدین نے حملوں کو روکا، توسیع سلطنت کی، ایسا طور اختیار کیا کہ جس سے ہندو مسلم تفریق نمایاں تھی، جس کے عوض میں وہ بہت توصیف و ثنا کا قابل تھا، لیکن حکمرانی کی آزادیوں نے اس کو اس کا مستحق نہ ٹھہرایا اسپر بھی اچھی طرح الزامات عائد کئے گئے، اسی طرح اکبر باوجود اپنے اور وقار کے محض حکمرانی کے اجتہادی اصول کی بنا پر ہدف ملامت بنا، مختصر یہ کہ کوئی حکمراں ہو اور کتنا ہی قابل کیوں نہ ہو اگر وہ علما کے اصول کے مطابق حکمرانی نہ کرسکا، تو وہ سخت سے سخت الزام کا ہدف ضرور بنا، اس کا دور حکومت کبھی مطمئن نہ کہا جاتا!

اگرچہ اصول کے لحاظ سے وہ طرزِ حکومت جس کا تعلق تقلید سے ہے، ہر زمانے میں بدلتی رہی ہے، لیکن چودھویں صدی میں اس کے بنیادی اجزاء یہ رہے ہیں:-

ا۔ تمام محاصل کی تقسیم صرف چار قسموں میں سے ہونی ضروری تھی۔

(۱) خراج۔

(۲) ذکوٰۃ۔

(۳) جزیہ۔

(۴) خمس۔

ب۔ اہلِ ہنود کے لئے ضروری تھا کہ وہ بہرصورت مطیع رہنے پر مجبور رہیں، جس کا مفہوم یہ تھا کہ ان پر کچھ بار رکھا جائے۔

ت۔ جو حصہ یا قطع ملک فتح نہ ہوا ہو، اس کو فتح کر کے ملحق کر لیا جائے۔

ث۔ مالِ غنیمت میں سے ⅕ بیت المال میں جائے اور باقی فاتح افواج میں تقسیم کر دیا جائے۔

ج۔ حکومت کی آمدنی میں سے قلیل حصہ پر سلطان کو اختیار ہو جسکو بھی وہ اپنی مرضی کے مطابق صرف کرنے کا مجاز نہ تھا۔

ح۔ حنفی علما کے سوا کسی کو حق نہ تھا کہ انصاف وعدل کے معاملے میں دخل دے۔

خ۔ مسلم کا خون کسی صورت سے روا نہ تھا۔

د۔ سادات قضاۃ، مفتیانِ وقت صرف معزز ہی نہ تھے، بلکہ حکمرانی میں ان کا غالب حصہ ضروری تھا،

اس طرزِ حکومت کے طرفداروں کو چودھویں صدی میں نہ صرف معزز تصور کیا جاتا تھا بلکہ ان کو استحقاق حاصل تھا کہ وہ ان تمام مسلمانوں کے پیشرو اور قائد تصور کئے جائیں، جو دار الحرب ہند میں رہ کر دیگر ممالک اسلامیہ کے طور طریقے سے بے خبر تھے۔

لیکن ان تمام پابندیوں کے باوجود تقلیدی گروہ نے تمام وکمال طور پر حکومت اور اس کے اجزاء پر قابو نہیں پالیا تھا کیونکہ امراء میں دو قسم کے لوگ تھے، ایک تو وہ جو صرف رسمی طور پر تقلیدی گروہ کے ساتھ تھے، دوسرے وہ جو شدت کے ساتھ اس کے پابند تھے اور یہ دونوں اس حکمران کو زیادہ ترپسند کرتے تھے، جس کے ہاتھوں کو "مالیات" و "اقتصادیات" کے تحفظ میں کم دخل ہوتا تھا، جس چیز کی ایسے حکمران کو خاص ضرورت ہوتی تھی وہ یہ تھی کہ وہ ایسے طریقے اختیار کرے، جس سے امراء اس کا ساتھ دینے پر مجبور رہوں۔

اس ماحول کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد جب سلطان محمد تغلق کی طرزِ حکومت پر نظر ڈالی جاتی ہے، اس کے عہدِ حکومت کی اصلاحات کا تجزیہ کیا جاتا ہے، تو صاف کھل جاتا ہے، کہ وہ مقلد ہی نہ تھا بلکہ بعض امور میں تقلید کو اچھا سمجھتا، بعض میں حکمرانِ پیشین کے مقرر کردہ اصول کی پابندی کرتا، اور بعض میں خود اپنے اجتہاد و رائے سے کام کرتا جو چیز اس کے سامنے تھی وہ تخت و تاج کے اختیارات کی وسعت تھی، اس وجہ سے "وہ شرعی تقسیم" تک محاصل کو محدود نہ کر سکا بلکہ اور ضروری تعزیری محاصل ایجاد کئے، حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو چار قسم کے محاصل ہی سے آئندہ کے تمام محاصل کا تعلق ہے، جو نقطۂ شرعی سے جائز تصور کئے جاتے تھے!

جہانتک اہلِ ہنود سے متعلق امر ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس چیز کو اکبر اعظم نے بہت بعد محسوس کیا اور اسکو عملاً کر دکھایا، اسکو سلطان محمد تغلق نے بہت پہلے محسوس کیا تھا، اس نے ستی کی رسم کی سخت مخالفت کی اور پابندیاں عائد کیں، ہنود کو تمام اعلیٰ عہدوں پر ممتاز کیا، اور تمام ہندو رعایا کی بہتری و بہبودی کا خواہشمند رہا، اسی وجہ سے برنی کا شدید ترین الزام سکۂ مس کے اجراء کے سلسلے میں یہی ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ مراعات کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے خوب جعلی سکے بنانے شروع کر دیئے اور اپنی غربت کو امارت سے تبدیل کر لیا، اگر کوئی شرعی انسان ہوتا تو ایسے لوگوں کو اس کا موقع ہرگز نہ دیتا، نہ صرف یہی بلکہ اس نے راجپوتوں کے قلعے رنتنبھور اور چتوڑ کی طرف بالکل توجہ نہ کی برخلاف اس کے جنوبی ہند کی خودمختار ہندو سلطنتوں کو بہت حد تک مضمحل وافسردہ کر دیا، اور نئی قائم شدہ ہندو ریاستوں کی خودمختاری تسلیم کر لی..... لیکن اہلِ نظر سمجھ سکتے ہیں کہ اس کا طورِ حکومت اس قدر عقلمندی پر مبنی تھا، جسقدر مابعد زمانے میں اکبر اعظم کا طورِ حکومت، کیونکہ

کہا جاسکتا ہے کہ سیاست وقتی کا یہی تقاضا تھا کہ رنتنبھور اور چتوڑ پر حملہ کر کے جان و مال کے نقصان کے بعد ان پر قبضہ قائم رکھنا مصلحت کے خلاف تھا لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ اس زمانے میں بھی یہی خیال راسخ تھا کہ ہندوؤں کا قتل مسلمانوں کا فرض ہے ..... ایسے میں کسی انسان کا عملی طور پر اس کے خلاف ثابت ہونا یقیناً تعجب انگیز ہے!

سلطان محمد تغلق سے پہلے علاؤ الدین ہی وہ سلطان تھا جس نے مال غنیمت کی تقسیم میں ترمیم کی، پہلے پہل اس نے ⅘ حصہ خود لیا اور ⅕ فوجیوں کو دیا تو اس کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں، فوجی بگڑ گئے، بغاوت کے آثار پیدا ہو گئے، بلکہ شروع ہو گئی، لیکن اسنے اپنے فولادی ہاتھوں سے بدامنی دفع کر دی اور ترمیم شدہ اصول پر قائم رہا، پہلے دو تغلق بادشاہوں نے اس کی تقلید کی اور چودھویں صدی تک یہ ترمیم اس نوع تک پہونچ گئی کہ فوجیوں کی تنخواہیں مقرر ہو گئیں، درآنحالیکہ عہد مغلیہ میں بھی جس زمانے کو "عہد مسلم" کا "زریں عہد" کہا جاتا ہے اس کی تقلید میں تکلف محسوس ہوتا تھا۔

سلطان وقت اپنے اخراجات کے لئے اسی قدر یا کچھ زیادہ آمدنی کا حقدار تھا، جسقدر اس کے امرا حقدار تھے، سو اس کا امکان تو اس روشن زمانے میں بھی نہیں ہے، زمانہ وسطیٰ میں یہ کس طرح ہو سکتا تھا، انگلستان میں بھی جب یہ مسئلہ مجلس شوریٰ اور مجلس ملی میں پیش ہوا تو سخت ترین مباحث شروع ہو گئے۔ اس لئے سلاطین دہلی کس طرح سے اس دراز دستی کو برداشت کر سکتے تھے، خصوصاً سلطان علاء الدین اور اس کے مقلد سلطان محمد بن تغلق سے قطعی ناممکن تھا!

باقی دفعات یعنی (۱) عدل و انصاف کے معاملات میں دخل (۲) مسلمانوں کی سزائے قتل سے بریت۔ (۳) سادات کا اعزاز مخصوص ایسی دفعات ہیں جو سلطان محمد تغلق کے بے رحم اور خونریز ہونے پر کافی روشنی ڈالتے ہیں، لیکن یہ معلوم کر کے واقعی حیرت ہو گی، جو شخص کہ اس زمانے میں "خونریز" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، وہی عہد اکبری تک "عادل" کہا جاتا تھا، اس لقب کی صداقت ان واقعات سے ثابت ہو سکتی ہے جو عدل و انصاف کے سلسلے میں اس سے ظہور میں آئے، لیکن جہانتک "سر تسلیم خم کرنے" کا تعلق تھا وہ تقلیدی گروہ کی نظروں میں ممتاز رہا، مگر جیسے ہی اس نے عدل گستری کے لئے ایک نئے باب کی بنیاد ڈالی، اور خود اس کی کرسی عدل پر آخری چارہ سازی کے لئے بیٹھا تو کھلبلی سی مچ گئی، کیونکہ اب یہ ہونے لگا کہ مفتیوں کے فیصلوں پر نظر ثانی ہونے لگی، جس کے بعد جرح و تعدیل کے لحاظ سے انہوں نے خود اپنی رائے بدلدی تو خیر ورنہ ان کے فیصلے مسترد کئے جانے لگے، نہ صرف یہی بلکہ اس نے بعض اپنے خاص اور معتمد عمال کو بھی عدل و انصاف بیچ بچاؤ اور فیصلہ کے اختیارات دیدیئے، حالانکہ وہ نہ مفتی تھے، نہ قاضی اور نہ مستند قانون دان، یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان امور سے اور خونریزی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کی تفسیر سے یہ الزام اس کے سر سے ہٹ سکتا ہے، حالانکہ عدل گستری بھی وہ چیز ہے جو ایک انسان کو "خونریز" نہیں بنا سکتی، کیونکہ ایک ہی وقت میں دونوں صفتیں انسان میں جمع ہو جائیں، یعنی وہ "ظالم" بھی اور "عادل" بھی ناممکن ہے، تاہم اس مسئلہ پر دوسرے رخ سے بھی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے اچھا واقعات بغاوت کو سامنے رکھئے، تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ ۱۲ بغاوتیں نہایت کامیابی سے فرو ہوئیں جن میں سے سات کو تو سلطان نے خود فرو کیا اور پانچ کو اس کے حکام نے، سلطان نے جو سات بغاوتیں دفع کیں، ان کے سرداروں میں سے ایک تو جنگ ہی میں مارا گیا تھا، ایک فرار ہو گیا، اور پانچ کو معاف کر دیا گیا، چنانچہ برنی خود لکھتا ہے کہ سلطان کے خلاف ایک زبردست سازش کی گئی، نہ صرف بغاوت کے لئے بلکہ اس کی جان اور اس کے تاج و تخت کے لئے قضا کا راز کھل گیا۔ سازش کا سرگروہ قتلغ خاں ثابت ہوا اور سردار بھی گرفتار ہوئے لیکن بہ اس کی خونریزی تھی یہ اس کا قاتلانہ جرم تھا، کہ وہ ان سب کو معاف کر دیتا ہے ـــ برنی کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"شرائط تعظیم قتلغ خاں کہ پیش او در عنفوانِ شباب
چیزے خوانده بود، چناں محافظت نمودے ومبالغت
کرد کہ ہیچ شاگرد را ہیچ استاد میسر نہ شد!"

(فیروز شاہی)

حالانکہ ایک قاتل بے رحم، خونریز، ان معاملات میں کبھی شاگردی استادی کا لحاظ نہیں کر سکتا، خصوصاً جبکہ استاد سازشی گروہ کا سردار بھی ہو، برخلاف ان شہادتوں کے پانچ بغاوتیں جو حکام نے دفع کی تھیں ان میں سے دو بغاوتوں کے سرداروں کو پھانسی دیدی گئی یہ مقابلتاً بہت اہم ہیں۔ اور سلطان کو "خونریز" ہونے کی جگہ "رحیم" ثابت کرتی ہیں، اسی کے ساتھ یہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے کہ تقریباً آٹھ بغاوتوں میں جو لوگ اپنی سزا کو پہونچے ماخوذ ہوئے، یا معاف کردیئے گئے، ان میں سے زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کا تعلق سادات، شیوخ، اور قضاۃ سے تھا، اور جو کھلی ہوئی بغاوت، سازش، رشوت، یا غبن میں ماخوذ ہوئے تھے اور یہی وہ بنیادی چیز ہے جس پر تمام الزام "خونریزی" کا انحصار ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ اس زمانے میں خونریزی نہایت آسان بات تھی، لیکن تمام جماعت و گروہ کے لوگ لرزہ براندام بھی رہتے تھے کیونکہ معاملات عدل و انصاف میں سلطان کسی کی رعایت و طرفداری نہ کرتا تھا، وہ شیخ ہوں کہ سید وہ علما ہوں یا قضاۃ، وہ امرا ہوں یا جاگیر و منصب دار، جرم ثابت ہوجانے کے بعد یہ چیزیں ان کو انصاف کے سخت ہاتھوں سے نہیں بچا سکتی تھیں،........ اس لئے اس گروہ کے نزدیک جو اپنے کو ابتک معصوم و مصئون تصور کرتا تھا، ایسا زمانہ ہولناک اور خونریزی ہو سکتا ہے، اور پھر اگر یہی گروہ سلطان کے طرز عمل کا مخالف ہوتا، تو سلطان کی خصوصیتیں اس اٹھائے ہوئے فتنے کو دفع کردیتیں، لیکن دو اور باتوں میں بھی اس کے خیالات سطح عام سے بلند تھے، یعنی

۱۔ سرحدی امور میں ترمیم۔

۲۔ ملکیوں کے مقابلے میں غیر ملکیوں کو ترجیح اور ان کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ جسکی وجہ سے الزام و اعتراض کے اور بھی مواقع پیدا ہوگئے در آنحالیکہ دونوں باتوں میں مجتہدانہ طرز عمل نہایت ضروری تھا کیونکہ (۱) ایک صدی سے تمام مغربی صوبوں پر منگولوں کے پیہم حملے ہوتے رہتے تھے، پنجاب جو پہلے بے حد اچھی حالت میں تھا، اب تقریباً ویران ہوچکا تھا، حملہ آوروں سے مقابلہ کا سوال ایک زبردست اہمیت رکھتا تھا، اور تمام سلاطین دہلی اس کا خیال کرتے آئے تھے اس لئے کہ دار السلطنت پر بھی ان کی نگاہیں تھیں، اسی وجہ سے انکی نگرانی کے لئے ایک زبردست نگران فوجی دستہ مقرر کیا تھا، پس قدامت پرست دماغ کے لوگ اس کو کس طرح اچھی نظروں سے دیکھتے کہ قابل نفریں دشمنوں سے جنگ کے بجائے صلح کرلی جائے، لیکن یہ تبدیلی بے سبب نہ تھی، کیونکہ منگولوں میں خانہ جنگی ہو رہی تھی، چغتائی حکمران مسلمان ہوچکا تھا، حجاب کفر دور ہوچکا تھا، ایک عرصہ سے سرحدی حملے بند ہوگئے تھے، ملک کے امن و امان میں رخنہ اندازیاں ان کی طرف سے ختم ہوگئی تھیں،..... ایسے میں دوستانہ تعلقات کا بڑھانا ہی بیدار مغزی تھی، اور آئندہ کے فسادات اسی طرح رک سکتے تھے، مگر سلطان کی دوست طلبی یہیں تک ختم نہ ہوئی بلکہ اس کی دعوت پر چغتائیوں کی کثیر جماعت ہندوستان آئی اور اس کا نہایت تپاک کے ساتھ استقبال کیا گیا، جس کی وجہ سے برنی کو اپنے غیظ و غضب میں اضافہ کرنا پڑا۔ حالانکہ اخوت اسلامی کبھی اس قسم کے قہر و غضب کی طرفدار نہیں ہے، خصوصاً اس حال میں کہ آنے والے فی الاصل شدت ظلم سے گھبرا کر بصورت مہاجر آئے تھے،

سلطان کی فیاضی پر برنی کی برہمی، تعجب و حیرت سے خالی نہیں ہے کیونکہ فیاضی کبھی جرم نہیں سمجھی گئی۔

جب معاملات کی تہ کو پہونچنے کی سعی کی جاتی ہے تو عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مراعات و فیاضی سے مستفیض ہونے والے زیادہ تر بیرونی لوگ تھے، بعض ان میں سے ملازمت اختیار کرچکے تھے، بعض ملازم ہونے والے تھے، اور بعض ایسے تھے جن کو سلطان ملازم رکھنا چاہتا تھا، لیکن یہ برہمی درحقیقت ذاتی کہی جا سکتی ہے، کیونکہ سلطان کی فیاضی یا رعایت کوئی جرم نہ تھی، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جو لوگ اس کے مستحق تصور کئے گئے تھے، وہ ایسے تھے جنکو کچھ اچھا نہیں خیال کیا جاتا تھا، اگرچہ اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ سلطان خود ہی ملکی نہ تھا، اس کا خاندان ایک صدی یا اس سے کچھ کم و بیش پہلے ہندستان

آیا تھا، اسوجہ سے بیرونی اشخاص سے اسکو قدرتاً لگاؤ تھا، لیکن یہ جواب کافی نہیں ہے اور نہ اس وجہ سے سلطان کی فیاضیاں باہری لوگوں کے ساتھ تھیں، بلکہ اصل واقعہ یہ تھا کہ وہ حکمرانی کے عام اصول میں ترقی چاہتا تھا، کیونکہ اسوقت فارس اور مغربی ایشیا کی سلطنتیں کافی سے زیادہ تربیت و ترقی یافتہ تھیں اور وہاں کے لوگ بھی ہندوستانی لوگوں سے زیادہ قابل تھے، کیونکہ سلطان علاء الدین کے زمانے کے تجربہ کار لوگوں میں سے بعض تو طبعی عمر کو پہونچ چکے تھے، اور عموماً مر چکے تھے، اور کچھ لوگ قطب الدین اور خسرو خان کے دورِ حکومت میں داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے، سلطنت عرض و طول میں بڑھتی جاتی تھی، جس کے انتظام و انصرام کیلئے بہترین اشخاص کی ضرورت تھی جو انہیں ملکوں سے سلطان کو مل سکتے تھے، یا خود ہندوستان کے باشندوں میں سے تربیت و تعلیم پا کر کارآمد ہو سکتے تھے، اس کے لئے ایک زمانے کی ضرورت تھی، ہندوستان میں وہ گروہ جو خاندانی طور پر اپنے کو حکومت کا اہل سمجھتا تھا، اس نظریہ کے مطابق کہ (جب شرافت و حسن و عمل کی انتہا ہو چکتی ہے تو قبائل و خاندان میں بدترین اور ارذل ترین خصائل پیدا ہو جاتے ہیں؟) ناکارہ ہو چکا تھا حکومتوں کو بنانے اور بگاڑ دینے کے "افساد" سے ان کا ہر فرد آگاہ تھا، اس لئے ان پر پوری طرح اعتماد کر لینا، ہنرمند اور ہوشمند فرمان روا کا کام نہ تھا، اور ان سے پناہ میں رہنے کی وہی صورت تھی جو سلطان نے اختیار کی، لیکن "ان خود غلط" لوگوں کو ان ہندوستانی باشندوں کی حکومت جو ابتک اس کے اہل نہ سمجھے جاتے تھے، بیرونی اشخاص کی طلبی و آمد سے زیادہ گراں معلوم ہوئی، کیونکہ جن لوگوں کو حقیر نظروں سے دیکھنے کے وہ عادی تھے، انکو اپنے برابر دیکھنا پھوٹی آنکھوں سے نہ بھا سکتا تھا، مگر ان تمام احساسات کے باوجود سلطان کے اس جذبہ کو کس طرح فرو کیا جا سکتا تھا کہ وہ اچھا دورِ حکومت اور پسندیدہ طور زندگی دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے سلطان کو الزام دینے سے زیادہ آسان یہ ہونا چاہئے کہ "ان ذاتی بغض و عناد کو اس کی تہ میں پوشیدہ دیکھ لیا جائے جو فی الحقیقت تمام الزامات کی بنیاد ہیں؟!

مذکورالصدر امور کی وضاحت سے یہ صاف کھل جاتا ہے کہ سلطان نے دو بڑے گروہوں کو ان کے ذاتی اغراض و مقاصد کے خلاف عمل کر کے ناراض کر دیا تھا، اول پشتینی خیر خواہان دولت دوم ہندی نژاد حکام و عمال اس کے ساتھ خلیفۂ مصر کے سامنے سر اطاعت خم کر دینے کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جو فی الاصل اپنی حالت کو مضبوط تر بنانے کیلئے ایک "اتحاد" کی صورت رکھتا تھا، لیکن بدقسمتی سے اس عہد و پیمان کا کوئی نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی سلطان کے حکام خارجہ نے بغاوتیں شروع کر دیں، سلطان کی جان لینے کی بھی سعی کی گئی تاکہ "کٹھ ملاؤں" کا بندۂ بے زر فیروزشاہ اس کی جگہ تخت پر بیٹھ سکے مگر برسوں تک ان بغاوتوں کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ جیسے جیسے دن گذرتے گئے تجربہ کار وفادار عمال حکومت ختم ہوتے گئے اور فیروزشاہ متعصب اور تنگ نظر گروہ کے ہاتھوں میں کھلونا بنتا چلا گیا، بالآخر سلطان محمد بن تغلق کی حکومت و زندگی سندھ کے ریگستانوں میں ختم ہوتے ہی یہ سریرآرائے سلطنت ہوا، لیکن مشیرکاروں کی تنگ نظری کی بدولت اسی کے عہد میں اس تباہی کی بنیاد پڑ گئی، جس نے سلاطین دہلی کو برباد کر دیا اور اسپر امیر تیمور کی غارت گری نے ہمیشہ کے لئے مہر بربادی ثبت کر دی۔

زیر بحث موضوع جہانتک واقعات کے تجزیہ سے متعلق ہے اپنی موجودہ شکل میں ختم ہو جاتا ہے، لیکن برنی اور محمد تغلق پر ایک مختصر سے تبصرہ کے بغیر یہ کسی حد تک تشنہ رہ جاتا ہے۔۔۔ برنی کی وہ تصویر جو تاریخ کے صفحات پیش کرتی ہے بتعجب ہے کہ بے حد دھندلی ہے، حالانکہ وہ اپنے آقا کا سترہ برس تک خیر خواہ تھا، بزعم خود یا واقعتاً وہ نہایت ایماندار بھی تھا، اسکی نظروں میں سلطان کا ہر عمل الزام سے خالی نہ تھا، مگر خود اس کی تصویر ظلمت و استکراہ سے بری نہ رہ سکی، شاید اس لئے کہ منہ چڑھانے والے، دوسرے کے عیوب ڈھونڈھنے والے کسی کی رحلت کے بعد اسپر تبرا کہنے والے اشخاص جب اپنے گریبان کے آئینہ میں خود اپنی تصویر دیکھتے ہیں یا جب ان کی شبیہہ دوسرے الفاظ میں کھینچی جاتی ہے تو وہ ہمیشہ کریہہ اور تاریک ہی ہوتی ہے!

الغرض سلطان محمد تغلق کے بعد ہی برنی جال میں نظر آتا ہے .... ملاحظہ ہو۔

"اب برس کی وفاداری ختم ہو گئی ہے، امارت کی جگہ غربت نے لے لی ہے، کوئی عزت نہیں کرتا ہے انقلاب نے اسکی ملازمت بھی چھین لی ہے، فیروز شاہ کے دربار میں اس کا گذر نہیں ہے، قصیدہ خوانی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، پانچ برس بیکاری میں گذر چکے ہیں، عزت و شوکت، قدر و منزلت ہر طرف زندگی کی ضرورتیں مشکل سے پوری ہوتی ہیں، برنی ہے اور سلطان محمد تغلق کے عہد کا خیال، عہد فیروزی ہے اور اسکی انقلابی صورتیں ...... تاریخ لکھنے کا خیال آتا ہے، اپنے آقا کے خصائل سامنے آتے ہیں لیکن اپنی محرومیوں اور مجبوریوں کا تقاضا پیش پیش ہے، واقعات کے بیان کے ساتھ اگر قصیدہ خوانی نہیں کی جاتی، بھلائیوں کو دبا کر، برائی کو اجاگر نہیں کیا جاتا، عہد گذشتہ کو دور موجودہ کے مقابلے میں پست نہیں دکھایا جاتا تو نہ "داستان گوئی" کا لطف ہی آسکتا ہے اور نہ فیروز شاہ بغیر کسی رد و قدح کے اسکو آخری عہد حکومت کی شاہی مستند تاریخ مان سکتا ہے اور نہ اس کی موت تجاہل عارفانہ کے ساتھ کہہ سکتا ہے۔

کہ "کاش میرے بعد بھی کوئی ایسا ہی شخص میرے عہد کی تاریخ لکھنے والا ہوتا"

پس مطلب سازی اور تعصب کا آئینہ سامنے آجاتا ہے، جس میں ابلیس اپنی انگلی سے اشارہ کر کے کہتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔
کہ "سلطان محمد تغلق برا تھا، یہ خدا کا آخری فیصلہ ہے!"

اس اشارے کو پاتے ہی اپنی تاریخ کی ابتدا کر دیتا ہے اور اسی اثر و انداز کے تحت میں صفحے کا صفحہ سیاہ کرتا چلا جاتا ہے!!

اب رہ گیا سلطان...... تو ہم یہ اوپر لکھ آئے ہیں، اٹھارویں صدی تک اہل قلم کا یہی فیصلہ رہا ہے کہ وہ "عادل" تھا اس کے علاوہ نامساعدت وقت، عہد حکومت کی ابتدا ہی میں پانچ برس تک شدید قحط دوآبہ میں، اضافہ لگان، چاندی کی کمی سے سکہ مسی کا اجرا، اتحاد ثلاثہ کی شکست سے مہم خراسان کا فسخ...... یہ سب مل کر کیا، کسی سلطان کو مخبوط الحواس ثابت کر سکتے ہیں؟ کیا ان دلائل کے باوجود بھی اس مدبر، عاقل اور بلند مرتبت سلطان کو خونریز، سفاک، اور ظالم کہا جا سکتا ہے؟ اور کیا اس کا خیال کر کے کہ سلطان محمد تغلق کی حکومت و سلطنت کی سی وسعت سوائے اورنگ زیب راج کے کسی اور کو نصیب نہ ہوئی یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ موانع و مشکلات میں جس شخص نے نہایت حسن و سلیقہ، صبر و انتظام سے حکومت کی وہ لائق صد تحسین و آفرین ہے؟!!

(شفاعت محمود)

حضرتِ حفیظ اور اُن کی ادبی زندگی

(از جناب محمد شفیع صاحب امرتسری)

حفیظ پنجاب کے قدیم شہر جالندھر میں پیدا ہوئے، سن ولادت ۱۴/جنوری ۱۹۰۰ء ہے، آپ کا خاندان قدیم چوہان سورج بنسی خاندان کی ایک شاخ ہے، جو آج سے تقریباً دو سو سال پیشتر ہندو سے مسلمان ہوگیا تھا اور جسے اپنی دین کی تبدیلی کے سبب دنیوی املاک سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔

تعلیم آپ کی تعلیم محلے کی ایک مسجد میں ہوئی جس کا تذکرہ آپ نے اپنی مشہور تصنیف شاہنامہ اسلام میں ، دوسری جلد کے آغاز (مسجد و مکتب) میں کیا ہے، یہاں آپ نے قرآن شریف پڑھا اور کریما، مامقیما ، گلستان اور بوستان صرف چھ برس کی عمر میں نوک زبان کرلیں۔

۱۹۰۶ء میں آپ کو دینوی مدرسے میں داخل کرایا گیا، آپ وارفتہ مزاج تھے ہی، مدرسہ کے ضابطوں کی تاب نہ لا سکے، بہت سے مدرسے تبدیل کئے گئے، آخر یہ کہتے ہوئے ؎

یہاں دیتے ہیں پہلا درس مذہب سے بغاوت کا
یہاں بوتے ہیں تخم اولیں نسلی عداوت کا
یہاں ماں باپ سے باغی کیا جاتا ہے بچوں کو
یہاں جھوٹوں کا پس خوردہ دیا جاتا ہے سچوں کو
یہاں باقاعدہ الحاد کی تعلیم ہوتی ہے
یہاں باضابطہ شیطان کی تعظیم ہوتی ہے
یہاں مکر و ریا کا عقلمندی نام رکھا ہے
یہاں جور و جفا کا سربلندی نام رکھا ہے

مدرسے سے بھاگ نکلے

بچپن اور بچپن میں شاعری کی ابتدا آپ کو اردو زبان اور شاعری سے فطری مناسبت تھی، ان دنوں جالندھر میں میلادِ رسول کا بہت چرچا تھا، آپ بھی دوسرے بچوں کے ساتھ محفلوں میں شریک ہوئے، اس طرح پہلے پہل نظم کی جو صنف ان کے کان میں پڑی، وہ نعت رسول تھی۔

جن دنوں آپ دوسری جماعت میں پڑھتے تھے اور شعر و شاعری کی مطلق خبر نہ تھی، آپ نے اچانک ایک نظم خود بخود لکھنا شروع کر دی اور دو سو کے قریب بیت لکھ ڈالے، یہ نظم غلط سلط اور یکسر طفلانہ تھی، مگر موضوع نعت رسول تھا۔ میں نے بارہا دیکھا ہے کہ آپ ابتک اس نظم کا تذکرہ کرکے بہت خوش ہوتے ہیں۔

۱۹۱۱ء میں گیارہ سال کی عمر میں آپ نے باقاعدہ شعر کہنا شروع کیا، اسوقت غزل آپ کا تختۂ مشق تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم ادھوری رہ گئی، غزل ترقی کرتی گئی، سکول کی حاضری گھٹتی رہی، آٹھویں جماعت میں سکول کا تعلق منقطع ہوگیا، اگرچہ ادب کا مطالعہ رات دن جاری رہا

تلمذ ملک الشعرا مولانا غلام قادر صاحب گرامی کا وطن تو جالندھر تھا، مگر وہ ان دنوں حیدر آباد دکن میں حضور نظام محبوب علی خاں (خلد آشیاں) کے شاعر خاص اور فارسی کے مسلم الثبوت استاد تھے، اور جالندھر والوں کے لئے سرمایہ ہزار فخر و ناز تھے، ان کو آپ نے ایک مرتبہ بچپن میں دیکھا بھی تھا، جب آپ شعر کہنے لگے، تو ان کو خط لکھ کر اپنے کلام کی اصلاح چاہی۔

گرامی مرحوم نے ایک طویل خط میں آپ کے کلام کی تعریف کی، دل بڑھایا اور لکھا ”گرامی فارسی کا شاعر ہے، اردو سے بہت دور ہے اور حفیظ کو صرف یہ مشورہ دیتا ہے کہ حفیظ اپنے کلام کو بار بار خود ہی ناقدانہ نگاہ سے دیکھا کرے“ آپ نے اس پر عمل کیا اور پھر جب گرامی نے دکن سے رخصت ہو کر جالندھر میں رہنا اختیار کیا، تو آپ نے اس یگانۂ روزگار شاعر کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیا۔

حفیظ کی ادبی زندگی

۱۹۲۲ء میں آپ نے ایک اردو رسالہ ”اعجاز“ جاری کیا، مولانا گرامی مرحوم اس کے سرپرست تھے، مولانا عبدالحلیم صاحب شرر، یاس یگانہ، حضرت عزیز لکھنوی، عشرت لکھنوی وغیرہم ایسے لوگوں کی قلمی امداد حاصل تھی، مگر جالندھر کی آب و ہوا میں آپ کا یہ پہلا ادبی فرزند پنپ نہ سکا اور ۵ ماہ بعد چل بسا۔

لاہور کا رخ

اب آپ نے لاہور کا رخ کیا، اور اردو کے مشہور رسالہ شباب اردو کی ادارت میں منسلک ہو گئے، لاہور کے قیام کے ساتھ ہی آپ کی شہرت کا آفتاب طلوع ہوا، آپ نے اپنے کلام اور طرز بیان سے انجمن ارباب علم کے فرسودہ مشاعروں میں جان ڈال دی مگر یہاں آپ کو حسد کا سامنا بھی کرنا پڑا، اور آپ کے خلاف ایک طوفان کھڑا ہو گیا، ساتھ ہی مشہور اہلِ قلم اور سچے خادمانِ ادب سے دوستی کا شرف بھی حاصل ہوا، اور سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ اردو ادب کے مخلص سرپرست شیخ سر عبدالقادر صاحب کا آغوشِ شفقت بھی مل گیا جو آپ کی ادبی زندگی کے لئے اردو میں رحمت سے کم ثابت نہیں ہوا

شباب اردو کے بعد رسالہ ہزار داستان کی ادارت ہاتھ میں لی، یہی زمانہ ہے جب آپ نے غزل کے ساتھ ساتھ اردو شعر میں گیت اور مناظرِ قدرت کی مترنم مصوری پیش کی، اور ساتھ ہی نثر میں طبع زاد افسانہ نویسی کے جوہر دکھائے، ہزار داستان کو چھوڑنے کے بعد آپ کو پھول اور تہذیب نسواں میں کام کرنے کا موقع ملا، جہاں شمس العلما مولوی ممتاز علی صاحب ایسے ناقدِ ادب، سید امتیاز علی صاحب تاج، مولانا عبدالمجید صاحب سالک اور پروفیسر بخاری پطرس سے دوستی ہوئی، نیز بچوں کے لئے نظمیں، گیت اور کہانیاں لکھنے کی ایسی مشق ہو گئی، جس سے اردو ادب کو بہت فائدہ حاصل ہوا۔

۱۹۳۵ء میں فرمانروائے خیرپور سندھ نے آپ کو تین سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر شاعرِ دربار کے طور پر یاد فرمایا، مگر یہ زندگی پسند نہ آئی اور جلدی بیزار ہو کر پلٹ آنا پڑا، نظم رقاصہ اسی زمانہ کی یادگار ہے۔

نغمہ زار

خیرپور سے مراجعت کے بعد آپ کا اپنا پہلا مجموعہ کلام نغمہ زار شائع ہوا، جس میں ۱۹۲۵ء تک کی غزلیات اور وہ مترنم نظمیں اور گیت ہیں جو آپ کی شہرت کا باعث ہوئے، اور جن سے اردو شاعری میں ایک نئے طرز بیان کی بنیاد پڑی، نیز جن کے ذریعہ آپ نے ادبی حلقوں کو نئے بحور و قوافی سے متعارف کرایا۔ اس کتاب کا پہلا دیباچہ سید احمد شاہ صاحب بخاری (پطرس) نے لکھا اور فرمایا۔

”جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ عرصہ سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے، جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے، قدرت کی رنگینیاں تصویریں بن کر سامنے آ جاتی ہیں، اور غائب ہو جاتی ہیں، اور لطافت اور نزاکت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگجاتی ہیں“

حضرت گرامی مرحوم نے فارسی میں ایک تعریظ لکھی، جس کے چند شعر یہ ہیں۔

فصاحت مجسم، بلاغت مصور　　کلامِ حفیظ است اللہ اکبر
معانی دلاویز، الفاظ دلکش　　کلامِ حفیظ است یا سلک گوہر
فصیحِ معظم، بلیغ مکرم　　حفیظِ سخنگو، حفیظِ سخنور
چہ نسبت بود ذرع حفیظم　　موخر مقدم، مقدم موخر

دوسری اشاعت میں پرنسپل تاثیر صاحب (ڈاکٹر - پی - ایچ ڈی) نے ایک اور دیباچہ ایزاد کیا - یہ کتاب حفیظ کے شباب کی شاعری ہے، اور بقول تاثیر ہمیشہ رہے گی، چھ ایڈیشن اب تک شائع

ہو چکے ہیں۔

اسی زمانے میں دار الاشاعت پنجاب نے آپ کی شاعری کا دوسرا پہلو نمایاں کیا۔ یعنی وہ نظمیں اور گیت شائع کئے جو آپ نے بچوں کیلئے بچوں کی زبان میں بچہ کی سی ذہنیت اختیار کر کے لکھے تھے، بہار کے پھول جس کا دیباچہ سید امتیاز علی تاج نے لکھا ہے۔

(۲) پھول مالا جس کا دیباچہ مولانا عبد المجید صاحب سالک مدیر روزنامہ انقلاب نے لکھا۔ دونوں بچوں کے بہار یہ گیتوں اور نظموں کے مجموعے ہیں اور ہندوستاں ہمارا بچوں کے لئے منظوم تاریخی کہانیاں ہیں اسی کا مختصر دیباچہ علامہ عبد اللہ یوسف علی صاحب نے لکھا ہے،

پھر آپ نے انجمن حمایت اسلام کے اخبار کی ادارت کی اور اس کے بعد مشہور رسالہ مخزن کو دوبارہ جاری کیا، یہ رسالہ شیخ سر عبد القادر صاحب ممبر انڈیا کونسل نے اس صدی کے آغاز میں نکالا تھا۔ مدتوں آپ وتاب کے ساتھ خدمتِ ادب کرنے کے بعد شیخ صاحب کی دوسری مشغولیتوں کے باعث ایک مصنف کے حوالے کر دیا گیا اور یہ رسالہ سسک سسک کر مر گیا تھا، آپ نے پھر سے تین سال تک زندہ کر دیا، بوجہ باہمی اختلاف جو آپ اور رسالہ کے مالکوں میں ہوا آپ الگ ہو گئے، اور پھر یہ رسالہ ختم ہو گیا۔

اسی زمانہ میں آپ نے ہفت پیکر شائع کی جس میں سات طبعزاد مختصر افسانے ہیں اس کا دیباچہ مشہور افسانہ نگار سید امتیاز علی صاحب تاج نے لکھا۔

شاہنامہ اسلام نغمہ زار کی اشاعت کے بعد آپ نے اس چیز کو محسوس کیا جسکی آج سب سے زیادہ ضرورت ہے، آپ کی دوربین نگاہوں نے دیکھا۔

مسلمانوں پہ ہے مردہ دلی چھائی ہوئی ہر سو
سکوتِ مرگ نے چادر ہے پھیلائی ہوئی ہر سو
عزیمت ہے نہ جرات ہے نہ ہے تاب وتواں باقی
فقط حسرت سے تکنے کے لئے ہے آسماں باقی
نظر آتے ہیں اب وہ صف شکن بازو نہ شمشیریں
مقدر کی طرح سوئی پڑی ہیں آج تکبیریں
گئی دنیا سے آقائی محمدؐ کے غلاموں کی

پھر خیال پیدا ہوا ——— بھلا بیٹھے جو یاد اپنے سلف کے کارناموں کی

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جاؤں

ارادہ ہے کہ پھر انکا لہو اک بار گرماؤں
دلِ سنگیں سخن کے آتشیں تیروں سے برماؤں

پس آپ نے شعر وسخن کے ذریعہ خدمتِ اسلام کرنے کا تہیہ کر لیا اگرچہ اس راہ میں ہزار ہا مشکلیں پیش آئیں لیکن وہ آپ کو اس نیک ارادہ سے روک نہ سکیں۔ اور آپ نے شاہنامۂ اسلام نظم کرنا شروع کر دیا۔

۱۹۲۸ء میں پہلی مرتبہ حیدر آباد دکن کے ایک بہت بڑے جلسہ عام میں آپ نے اپنے سب سے بڑے کارنامے شاہنامہ اسلام کے ابتدائی اشعار سنائے، یہ جلسہ خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا جس میں حیدر آباد دکن کے مشاہیر اہل قلم و زبان اور عمائد موجود تھے، آپ نے برابر دو گھنٹہ تک سب کو مبہوت رکھا، انگریزی اردو اخبارات و رسائل دکن نے اس کی تعریف میں متعدد نوٹ لکھے،

اس جلسہ کے تین چار ماہ بعد علیگڈھ یونیورسٹی کے یونین ہال میں آپ نے شاہنامہ اسلام کے ابتدائی ایک ہزار اشعار ایک نشست میں سنائے، جلسے کے صدر سید سجاد حیدر صاحب یلدرم تھے، جلسے کے خاتمے پر یلدرم صاحب نے آپ کے زورِ قلم، کلام کی ندرت، سادہ پرکاری اور دلچسپی پر اظہار تعجب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اس یونیورسٹی کی تاریخ میں شاید یہ پہلا واقعہ ہے کہ صرف ایک شاعر کو سننے کے لئے اتنا بڑا اجتماع ہوا ہو اور پورے پانچ گھنٹے ایک ہی فرد نے ایک ہی مضمون پر سننے والوں کو مبہوت کر کے اسقدر داد حاصل کی ہو۔"

یلدرم صاحب نے آپ کو اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے "اردو کا بنسری بجیا" اور "اسلام کا شہنائی نواز" قرار دیا۔

۱۹۲۹ء میں شاہنامہ اسلام کی پہلی جلد شائع ہوئی، تو ملک بھر میں اس کی دھوم مچ گئی، جس میں آپ نے ہبوط آدم سے آغاز کرکے مؤسس اسلام حضرت ابراہیم اور ان کی اولادوں یہود اور بنی اسمٰعیل کا تذکرہ کرنے کے بعد آنحضرت پیغمبر اسلام صلعم کی ولادت مبارکہ، طفولیت، بعثت، تبلیغ رسالت، ہجرت، اور مبادیات بدر تک دو ہزار سے زیادہ اشعار کہے ہیں، دیباچہ شیخ سر عبدالقادر صاحب بالقابہ نے لکھا ہے، یہ کتاب ایسی مقبول ہوئی کہ پانچہزار کا پہلا اڈیشن دس ماہ میں نکل گیا، اب تک پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اس کتاب کی تصنیف اور طباعت کے سلسلے میں آپ مالی طور پر زیر بار ہو گئے تھے، مگر متعدد قدردان اصحاب نے ایک ایک نسخہ سیکڑوں میں اور ایک صاحب نے جن کا اسم گرامی کپتان ملک ممتاز محمد خان صاحب ٹوانہ ہے ایک ہزار روپیہ میں خریدا۔ اس طرح آپ قرض سے سبکدوش ہو گئے۔

اسی سال آپ کو ایک سانحہ جانگداز دیکھنا پڑا، شاہنامہ اسلام کے آغاز کے وقت آپ کی ایک دختر اعجاز بتول بعمر ½ سال فوت ہو گئی تھی۔ اب بڑی بچی ارشاد بتول بعمر دس سال اچانک گھر کے کنوئیں میں گر کر جاں بحق ہو گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس صدمہ نے آپ کے دماغ پر بہت بُرا اثر کیا۔ حتٰی کہ پانچ دن میں سر کے بہت سے بال سفید ہو گئے، آپ ان دنوں جالندھر میں مقیم تھے، کیونکہ لاہور میں جلسوں اور مشاعروں کی مصروفیتیں شاہنامہ اسلام کی تکمیل میں مانع آتی تھیں، اب پھر وطن کو ترک کر دیا — لاہور سے باہر ماڈل ٹاؤن میں مکان تعمیر کرکے رہنے لگے، مگر بچی کی مرگ ناگہانی نے عرصہ تک دماغ کو ماؤف رکھا، یہاں سکون کی تلاش میں مقیم ہوئے تھے، مگر آہ سکون نصیب نہ ہو سکا۔

شاہنامہ اسلام کی اشاعت کے بعد اسلامی انجمنیں، ادارے یتیم خانے، اور مدارس جو کم و بیش چندے کے سہارے چل رہے تھے ان کے کارپردازوں نے آپ کو تاکا اور اپنے ہنگامی مقاصد کے لئے آپ کو استعمال کرنے لگے، یہ قدردانی آپ کے لئے سوہان روح ہو گئی، صحت نے جواب دے دیا اور کام میں تعویق پیدا ہو گئی۔

کارزار ۱۹۳۳ء میں آپ نے ماڈل ٹاؤن سے ایک اخبار کارزار نکالا، جس کے ذریعہ بعض معاشرتی خرابیوں اور ادبی نقائص کے خلاف جہاد مدنظر تھا، دو سال کے بعد یہ مفید اخبار بہت بڑے خسارے کے سبب بند کر دیا گیا۔

۱۹۳۳ء ہی میں آپ کو خاندان عباسیہ کے تاجدار فرمانروائے بھاولپور نے نوازا، اس دربار اور افراد سے آپ کا قلبی تعلق پیدا ہو گیا۔

۱۹۳۴ء میں شاہنامہ اسلام کی دوسری جلد شائع ہوئی جو آپ کے زور کلام اور اردو مثنوی میں رزم نگاری کا پہلا کامیاب نمونہ ہے، میدان بدر میں کفار مکہ کے مقابلہ میں تین سو تیرہ نہتے مسلمانوں کا اپنے ہادی کی قیادت میں معرکہ آرا ہونا، دونوں طرف کے احساسات اور خیالات دونوں فوجوں کے مقاصد اور ذہنیتیں، دلوں کی کیفیتیں آخر تین سو تیرہ مسلمانوں کا ایک ہزار لشکر جرار پر محض جوش ایمان اور اللہ کی مدد سے فتح پانا، مکہ میں انتقام کا جوش مدینے میں یہود اور منافقین کی شرارتیں، حضرت علی اور حضرت زہرا کی شادی، جنگ سویق اور مبادیات جنگ احد یہ سب دو ہزار سے زیادہ اشعار میں سمایا ہے، اس جلد کا دیباچہ بھی شیخ سر عبدالقادر صاحب نے لکھا ہے، اور تاثیر صاحب نے معیار کے عنوان سے کتاب کو جانچنے کے اصول بیان کئے ہیں۔

سوز و ساز شاہنامہ جلد دوم کے ساتھ ہی آپ کے دوسرے کلام کا ایک اہم مجموعہ سوز و ساز کے نام سے شائع ہوا، سوز و ساز میں آپ کا ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء تک کا کلام اور میرا اسلام لے جا، تین نغمے (اقبال، ٹیگور اور حفیظ) رقاصہ۔ دل ہے پرائے بس میں اور وہ تمام گیت جو زبان اور بیان کے لحاظ سے خالص ہندوستانی ہیں۔ وہ تمام نظمیں جس میں آپ کی انفرادیت

اپنے اصل رنگ میں نمایاں ہے، اور وہ تمام غزلیں جو آپ کے صاحب طرز ہونے کا ثبوت ہیں، جذبات انسانی کی فراوانی اور حیات کی رنگارنگی اس کتاب کے حرف حرف سے ظاہر ہے اور جس سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح ہوا۔

سوز و ساز کا دیباچہ پنجاب کے مشہور و معروف شاعر پنڈت ہری چند صاحب اختر نے لکھا ہے، اس کتاب کو پنجاب کی ٹیکسٹ بک کمیٹی نے اپنے وقت کی بہترین کتاب قرار دے کر آپ کو اول درجہ کا انعام دیا اور شاید آپ ہی پہلے شاعر ہیں جنہوں نے بہتصر سی جونک لگائی، یعنی پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ارباب بست و کشاد کو مجبور کر دیا اور وہ اردو شاعری کی قدردانی سے روگردانی نہ کر سکے

خطابات اور مناصب

۱۹۳۵ء میں آپ کی شہرت کا آوازہ حکومت نے بھی سنا، اور آپ کے لئے ایک خطاب کی ضرورت محسوس کی، اور آپ کو "خان صاحب" بنا دیا، ملک کے اخبارات نے "سخن فہمی بالا" کہکر اس قدردانی پر آپ اور حکومت دونوں پر پھبتوں پھبتیاں کہیں

حج و زیارت

۱۹۳۵ء ہی میں شاہنامہ اسلام لکھنے کا اصل انعام ملا ــــــ یعنی حج و زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، اعلیحضرت شہریار بھاولپور اپنے ہمراہ اس مبارک سفر پر لے گئے۔

آپ نے خوب کہا ہے۔ ؎

سبز گنبد سے نہ جانے کیا اشارا ہو گیا •
رہبر اس منزل میں اک روشن ستارا ہو گیا

"میرا اسلام لیجا" کے عنوان سے جو نظم آپ نے مدت ہوئی، مدینہ والے کے نام لکھی تھی، اور جو آج ہندوستان کے بچے بچے کی زبان پر ہے، رنگ لائی اور آخر آپ کو یاد کیا گیا، اور آپ سر کے بل حاضر ہوئے۔

۱۹۳۶ء میں ریاست ٹونک کے بیدار مغز، علم دوست اور ہنر نواز فرمانروا نے آپ کو یاد کیا، شاہنامہ سنا اور سالگرہ کے دربار میں ہندوستان کے مشہور شعرا کی موجودگی میں "ملک الشعرا احسان الملک بہادر" کے خطاب سے سرفراز کیا، اور خلعت و انعام سے مزین فرمایا۔

۱۹۳۷ء میں ریاست ابد قرار حیدرآباد میں آپ کو نوازا گیا، یعنی اعلیحضرت سلطان العلوم بادشاہ دکن خلد اللہ ملکہ کی ریاست کی کونسل نے باتفاق رائے شاہنامہ اسلام کی تکمیل کے لئے تین سو روپیہ کلدار ماہانہ کی امداد منظور کی، جس پر شاہی مہر تصدیق ثبت ہوئی، اسی طرح آپ اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ہر روز کی مشقت سے بے نیاز ہو گئے؛

تصویر کشمیر

اسی زمانہ میں آپ کی نظم تصویر کشمیر شائع ہوئی، یہ معرکہ آرا اور ہنگامہ خیز نظم سرینگر کشمیر کے ایک بہت بڑے مشاعرے میں وزرائے ریاست کی صدارت میں سنائی گئی تھی، اس کے ہر اک بند میں کشمیر کے مناظر کی خوبصورتی اور معاشرت کی زشت روئی پر روشنی ڈالی ہے، اس کا دیباچہ سر راس مسعود صاحب المخاطب بہ مسعود جنگ بہادر (سرسید احمد مرحوم کے پوتے) نے اپنے انتقال سے چند ماہ بیشتر لکھا تھا۔

سفر انگلستان

آخر کار گذشتہ پانچ سات سال کی ہنگامہ خیز زندگی دماغی کام کی کثرت، بھائیوں اور بہنوئیوں کی موت، ایک بہت بڑے کنبے کا بار مل ملا کر آپ کے نحیف و نزار بدن پر غالب آگئے، اور ان سب سے زیادہ انجمنوں اور اداروں کی فرمائشیں چار چار پانچ پانچ گھنٹے چندہ کی فراہمی (انجمنوں اور اداروں) کے لئے کھلی ہوا میں اشعار پڑھنا، ان سب مصروفیتوں اور کوفتوں نے آپ کو صاحب فراش کر دیا، درد گردہ، بواسیر، معدہ کی خرابی کے ساتھ ساتھ اختلاج قلب اور غشی کے دورے پڑنے لگے آغاز ۱۹۳۸ء میں آپ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے، ایک بنگالی ڈاکٹر مسٹر دت کے ہومیوپیتھی علاج سے افاقہ تو ہوا لیکن ڈاکٹر صاحبان نے ہندوستان سے باہر جانے کا مشورہ دیا، مگر آپ یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتے، اس لئے متامل تھے، انہی دنوں آپ کے مربی شیخ سر عبدالقادر صاحب ممبر انڈیا کونسل لنڈن نے چھٹی پر لاہور

آئے ہوئے تھے، شیخ صاحب نے آپ کو انگلستان جانے پر راغب کر لیا، آج کل آپ لنڈن میں ہیں، جہاں تبدیلی آب و ہوا کے علاوہ علاج میں بھی آسانی ہے اور شاہنامہ اسلام کے لئے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی لائبریریوں سے مواد فراہم کر رہے ہیں۔ مگر لنڈن میں بھی (جہاں تک سننے میں آیا ہے اور اخبارات و رسائل سے پتہ چلتا ہے) آپ کو سکون نصیب نہیں، وہاں بھی جلسے ہوتے ہیں اور آپ اردو زبان و شاعری کی داد غیر ملکیوں سے حاصل کر رہے ہیں، دیکھیں ہندوستان کب[1] پلٹتے ہیں ؛ محمد شفیع اثر انصری

دھن والوں کی بستی

(از جناب محمود اسرائیلی)

(۱)

دھن والوں کی آدھرمی بستی
کیوں نہیں اس پر آگ برستی
پاپ کے ساگر خون کی نہریں
بَیر کے جھاگ، کپٹ کی لہریں
گھومتے ہیں انیائے کے بیڑے
کرودھ کے کونے کونے ڈیرے
دھن والوں کی آدھرمی بستی

(۲)

ہر مندر ہے، چھل کی مورت
ہر مسجد ہے لوبھ کی صورت
کام کی دیوی گہنے ڈالے
کرتی ہے چاند سے مکھڑے کالے
دھن والوں کی آدھرمی بستی

(۳)

اس بستی میں کہاں ہے اُجالا
روپ ہے سندر، من ہے کالا
ہر دیپک ہے بجلی چمکے
جس کی لَو تلوار سی چمکے
دھن والوں کی آدھرمی بستی

(۴)

ہر سنگھیٹ ہے رس کی دھارا
ہر کوٹھا ہے چتر دوارا
چور لٹیرے ہر پگ ڈنڈی
یہ نگری ہے لوٹ کی منڈی
دھن والوں کی آدھرمی بستی

(۵)

کاٹھ شریر اور من ہیں پتھر
آنکھیں ہیں دو چھلیے کنکر
انگ انوکھے، رِیت نرالی
اور اُچھل ہر پیڑ کی ڈالی
دھن والوں کی آدھرمی بستی

(۶)

ایشور کا وشواس نہیں ہے
اُس کی دیا کی آس نہیں ہے
انت گھڑی کا دھیان نہیں ہے
اتنا بھی ان کو گیان نہیں ہے
دھن والوں کی آدھرمی بستی

(۷)

کیسا دھرم اور کیسی سیوا
کون ہے دان اور پُن کا دیوا
مایا کے ہوتے ہیں درشن
چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن
دھن والوں کی آدھرمی بستی

[1] حضرت حفیظ اب ہندوستان واپس تشریف لا چکے ہیں۔ (ادارہ)

میر ناصر علی دہلوی اور اُن کا لٹریچر

(از جناب مظفر حسین صاحب شمیم مہتمم انجمن ترقی اُردو (ہند) اورنگ آباد - دکن)

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ ؛ افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

۱۸۷۶ء کا زمانہ ہے سرسید کا مشہور رسالہ "تہذیب الاخلاق" دھوم دھام سے نکل رہا ہے، سرسید کی پشت پر خانبہادر سید رضا حسین (پٹنہ عظیم آباد) نواب بہادر عبد اللطیف (کلکتہ)، نواب وقار الملک نواب محسن الملک اور خواجہ الطاف حسین حالی نہیں بلکہ ان کے قابل فخر بیٹے جسٹس سید محمود بھی ہیں، اسی زمانہ میں اکبرآباد کے افق سے ایک آفتاب طلوع ہوتا ہے اس کا نام "تیرھویں صدی" ہے، اس رسالہ میں سرسید کے قومی مشن سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا بلکہ ان کے مذہبی عقائد اور ادبی تصرفات پر ہر نمبر میں تنقیدیں شائع ہوتی ہیں، دار العلوم علی گڈھ کا بانی ہمارے زمانے کا کوئی کم ظرف مولوی نہ تھا کہ ان تنقیدوں سے چراغ پا نہ ہو جاتا، عالی ظرف سرسید خندہ پیشانی سے اُن بے لاگ تنقیدوں کو دیکھتے اور جو بات قابلِ قبول سمجھتے اسے قبول کر لیتے، تیرھویں صدی کی بے لاگ تنقیدوں کا کچھ ایسا شور بلند ہوا کہ ہر طرف سے اہلِ نظر کی نگاہیں اس رسالہ پر پڑنے لگیں، جوہر شناس سرسید نے قابل اور ہونہار اڈیٹر کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے "ناصح مشفق" کا خطاب دے کر اپنی انصاف پسندی کا ثبوت دیا، اس نوجوان اڈیٹر کے سر سے اسوقت زندگی کی صرف اُنتیس بہاریں گذری تھیں، اور وہ ابھی بالکل نوجوان تھا اس نوجوان کا نام میر ناصر علی تھا، یہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے پہلو بہ پہلو برابر اسی شان سے نکلتا رہا، ملک میں میر ناصر علی کی انشاء پردازی کی دھوم مچ گئی، لٹریری حلقوں میں اس رسالہ کا ذوق و شوق سے انتظار ہونے لگا، یہ رسالہ ساڑھے چار سال تک نکلتا رہا، اس کے بعد خدا جانے اسے کس کی نظر کھا گئی، خوش نظر ناظرین کا معنوی جلوہ دیکھنے کے لئے بیقرار ہو گئے، علمی حلقوں اور ادبی انجمنوں میں میر ناصر علی کی تلاش شروع ہوئی لیکن سب بے سود! ناصر علی کا پتہ نہ لگنا تھا نہ لگا، یکایک پھر اکبرآباد سے آسمان ادب پر "زمانہ" نام ایک نیا ستارہ طلوع ہوا اور اس کے سرورق پر میر ناصر علی دہلوی کا نام نظر آیا، اہلِ ذوق نے اس رسالہ کی راہ میں آنکھیں بچھائیں، یہ رسالہ بھی چار پانچ سال چل کر بند ہو گیا۔

"تیرھویں صدی" اور "زمانہ" کے بعد دلی سے "افسانۂ ایام" جاری ہوا، اس رسالہ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تقریبًا تمام مضامین میر ناصر علی کے قلم سے لکھے ہوئے ہوتے تھے، جب "افسانۂ ایام" گردش ایام کی نذر ہوا اور زمانہ نے یہ ورق بھی اُلٹ دیا تو میر ناصر علی نے دلی سے "ناصری" نامی ایک بلند پایہ رسالہ شائع کرنا شروع کیا، اس رسالے میں اس دور کے جلیل القدر انشا پردازوں کی تحریریں بھی چھپتی تھیں، ظرافت کی چاشنی نے "ناصری" میں چار چاند لگا دیئے تھے، اس کے مضمون بِسورتوں کو ہنساتے اور ہنستوں کو دیوانہ رقہقہہ بناتے تھے اس کے بعد کچھ عرصہ تک خاموشی چھائی رہی، میر ناصر علی دہلوی کی شوخی تحریر کے فریادی ہر طرف دیوانہ وار ناصر علی کو ڈھونڈنے لگے اور شوق کی آنکھیں زبان حال سے پکارنے لگیں کہ ؎

بازآ یوسف گم گشتہ کجائی بازآ — عاشقاں بہر تو بیت الحزنے ساختہ اند!

بڑے صبر و انتظار کے بعد ۱۹۰۶ءمیں دلی سے "صلائے عام" نکلا اور اس کے سرورق پر بحیثیت اڈیٹر میر ناصر علی کا نام نامی نظر آیا لیکن اس مرتبہ ناصر علی محض میر ناصر علی دہلوی نہ تھے بلکہ اب وہ میر ناصر علی خاں بہادر تھے، یعنی انگریزی حکومت کی طرف سے انہیں "خان بہادر" کا خطاب مل چکا تھا، شوق کے ہاتھوں نے صلائے عام کو ہاتھوں ہاتھ لیا، یہ رسالہ ایک وضع اور ایک ہی ڈھب پر چوبیس سال نکلتا رہا، یہ میر صاحب کا آخری کارنامہ حیات تھا، اس کا رنگ اتنا پختہ تھا کہ جن لوگوں کو بھی "صلائے عام" کی زیارت کرنے کا موقعہ ملا ہے ان کے کام و دہن اب تک اس کی پرلطف ادا کو یاد کرتے اور چٹخارے بھرتے ہیں، اس میں بعض خاص عنوان قائم تھے مثلاً "نیرا یہ آغاز" "مضمون پریشان" "محشر خیال" - اور "ہماری زبان" وغیرہ ان عنوانوں پر سالہا سال اکیلے میر صاحب طبع آزمائی فرماتے رہے اور ایک ہی مضمون کو سو دو سو نہیں ہزار در ہزار انداز سے باندھا کئے لیکن کیا مجال کہ کسی مقام پر بھی دلکشی میں فرق آ جائے۔

ایک مضمون پریشان ہی کو لیجئے، زلف یار کی پریشانی کا مضمون کسقدر حسین اور جمیل مضمون ہے، کون سا ایسا کمبخت شاعر یا نثار ہوگا جس نے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ نہ لکھا ہو، لیکن میر ناصر علی نے اسی پامال موضوع پر ایک دو دن نہیں مسلسل چوبیس سال خامہ فرسائی فرمائی، مضمون وہی زلف یار کی پریشانی کا تھا لیکن انداز بیان اور اسلوب نگارش ہمیشہ نیا ہوتا تھا، اردو کے ایک مشہور مرثیہ گو شاعر ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھنا اپنے لئے سرمایۂ فخر و مباہات سمجھتے رہے، لیکن میر ناصر علی اسی ایک مضمون کو سو کیا معنی ہزار رنگ سے باندھا کئے اور ہر مرتبہ رکھ رکھاؤ کا یہ عالم ہے کہ ایک مضمون دوسرے سے بالکل الگ معلوم ہوتا ہے، یہ صحیح ہے کہ بات ایک ہی ہے مگر انداز بیان ایسا دلکش و دل آویز ہے کہ ابھی مضمون پریشاں کو زلف حسیناں سے تشبیہ دے رہے ہیں اور ابھی آشفتہ مزاجوں کے دامن و گریبان کے پرزوں سے مشابہ کرتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد اسے وہ خط شوق بتاتے ہیں جسے یار ٹکڑے ٹکڑے کرکے پھینکدے، پھر کچھ آگے بڑھے تو فرمانے لگے کہ مضمون پریشاں کو اس ہار سے کیوں تشبیہ دی جائے جو رات کو یار کے گلے سے ٹوٹ گیا، جسکے موتی سیج پر بکھرے ملیں، اور آگے چلے تو مضمون پریشاں کو گیسوئے جاناں میں دل صد چاک کا شانہ بنانے لگے، اسی طرح تشبیہوں اور استعاروں میں "مضمون پریشاں" کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "مضمون پریشاں" کو غالب کے اس شعر کی شرح سمجھئے۔ ؎

نالہ پابند نَے نہیں ہے — فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے

اس طرح کی تشبیہیں اور استعارے میر صاحب کے لٹریچر میں ہزاروں نظر آئیں گے، اگر ہمارے شاعر باحواس ہوتے تو وہ محض میر صاحب کے لٹریچر کا مطالعہ کرکے سیکڑوں اور ہزاروں تشبیہیں اور استعارے حاصل کر سکتے تھے، اور ہماری شاعری جو تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت کے اعتبار سے بہت کم مایہ ہے، آج ایک حد تک اس طرح طرح ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری سے پیچھے نہ رہ جاتی:

مضمون پریشاں محض تشبیہوں اور استعاروں کی رنگینی و نیرنگی ہی کے لحاظ سے لاجواب نہ ہوتا تھا، بلکہ اس میں محاورات کی چاشنی زبان کی گھلاوٹ اور میر صاحب کے خاص انداز تحریر سے قطع نظر کہیں فلسفۂ حیات کی گتھیاں سلجھتی نظر آتیں اور کہیں موت کے فلسفہ کی عقدہ کشائی کی جاتی، کہیں مفکرانہ انداز میں جبر و قدر کے مسئلہ پر روشنی ڈالی جاتی اور کہیں تصوف کا کوئی اہم نکتہ حل کیا جاتا غرض "مضمون پریشاں" کیا تھا گویا ایک ایسا سدا بہار باغ تھا جس میں ہر ملک کا تازہ قلم لاکر لگایا گیا تھا، جس کی نسیم جانفزا مردہ دلوں میں نئی زندگی کی لہر دوڑاتی اور جس کی شمیم عنبر بیز بند دماغوں کو طبلۂ عطار بنا دیتی تھی، مضمون پریشاں کا ایک اور نمونہ ملاحظہ ہو۔

"صلائے عام" میں "مضمون پریشاں" کے سلسلہ نے زلف خوباں کی طرح پریشانیوں کو مٹانے میں لگاتار زور لگا رکھا ہے کہ ناظرین

صلائے عام کے لئے غم غلط کرنے کی صورت نکلے بقول میر حسن۔ ؎

وہ زلفیں کہ دل جس میں اُلجھا رہے ؛ اُلجھنے سے جی جن کے سلجھا رہے

حضرت اسمٰعیل منیر فرخ آبادی کا شعر ہے۔ ؎

پریشانیوں پر ہے جوبن نیا ؛ مگر زلف اُس نے سنواری ابھی

لیکن سچ پوچھئے تو پریشانی کے حق میں اس سے بہتر کہنا مشکل ہے

پریشانی اگر عیب است با رہم دارد

جس طرح محبت میں یار کی کوئی بات معیوب نہیں سمجھی جاتی

اسی طرح عالم اسباب میں خلاق دو عالم نے کوئی چیز حسن و خوبی سے خالی نہیں بنائی، یہی بالوں کی تمثیل لیجئے کہ گندھی چوٹی اگر چاہنے والوں کیلئے آفت روزگار ہے کہ بقول میر حسن ؎

کشاکش میں اسکی تھا جینا تو ہیچ ؛ کھلے کو رکھا اس نے ڈھیلا ہی پیچ

لڑکیوں کو کڑی گندھی چوٹی سے ڈھیلی چوٹی میں زیادہ آرام ملتا ہے بلکہ چوٹی کھولکر کندھے پر بال سکھانے میں جو بال شانوں تک اُتر کر کمر تک اور کمر سے نیچے پہونچیں تو خوبصورتی میں ان کا جواب مشکل ہے، جواب ہے تو مُلّا غنیمت کا شعر ہے کہ ؎

شنیدستم کہ صیاد ہوس جوش ؛ برنگ زلف لیلےٰ دام بردوش

لمبے بال والیاں جب گردن و سر کی جنبش سے پیٹھ پیچھے کے بال سامنے کندھوں پر ڈال لیتی ہیں تو اس کا نقشہ کھینچنا مانی و بہزاد کے بس کا نہیں، میر حسن نے اس شعر میں اس کا نقشہ کھینچنے کا ارادہ کیا مگر رہ گیا ؎

غرض وہ مڑی جب دکھا اپنے بال ؛ کہ گویا کہ مارا محبت کا جال

اس میں مضمون پریشاں کی تشبیہہ خاصی نکل آئی، مگر یورپ اور امریکہ کے حسینوں نے لمبے بالوں کے جال کو جنجال سمجھ کر یہ جھگڑا ہی مٹا دیا کہ کانوں تک بال رہنے دیئے، کھلے بالوں میں جو آرام ہے وہ بندھے اور گندھے بالوں میں نہیں۔ ؎

غرض حسن کا اس کے ہے سب یہ بھید

جو چاہے کرے وہ سیاہ و سپید

ایک مضمون پریشاں ہی پر کیا منحصر میر صاحب کی ہر تحریر میں خواہ "پیرایۂ آغاز" "محشر خیال" اور "ہماری زبان" کے ماتحت لکھی گئی ہو یا کسی اور عنوان کے تحت میں قلمبند کی گئی ہو، ہر جگہ ایک ہی عالم نظر آتا ہے، محاوروں کی نشست، الفاظ کا دروبست زبان کا چٹخارہ اور شوخی سب میں ایک ہی طرح پائی جاتی ہے، ان سب چیزوں پر اُن کا اپنا طرز تحریر جس کے وہ خود بلا شرکت غیرے مالک تھے، سونے میں سہاگے کا کام دیتا ہے، ان کا کوئی سا مضمون اٹھا لیجئے، ہر مقام پر وہی انداز تحریر نظر آئے گا۔

عروس فصل را پیرایہ دادم ؛ ندیماں را قوی سرمایہ دادم

اس مضمون سے میں دیباچہ مضامین کا کام لیا چاہتا ہوں کہ اس پرچہ کا حال پہلے ہی سے معلوم ہو جائے، جس طرح طرز بزم آرائی سے مہمان اور تقریب مہمانداری کا حال کھل جاتا ہے۔ شاعروں سے مشاعرے کا حال، مرثیہ خوانوں سے مجلس عزا کا قوالوں سے حال قال کی رونق کی کیفیت روشن چوکی اور گانے بجانے کی آواز سے بیاہ شادی کی تقریب سمجھ میں آجاتی ہے، اسی طرح افراط تفریط اسباب مہمانداری سے مہمان کے مرتبہ کا قیاس ہو سکتا ہے، تکلف اپنی بزم آرائیوں کا ؛ دکھا دیتا ہے صورت میہماں کی

مضامین سے پہلے آپ پیرایۂ آغاز دیکھ لیں تو آپ کو زیادہ آرام ملے گا، ؎

سنت جانی کو مری دیکھ تو لیتے پہلے ؛ کیوں یونہی پھینک دیا توڑ کے تیر اپنا

پیرایۂ آغاز کی رونق پرچہ کے مضامین سے ہے اور مضامین کی آرائش پیرایۂ آغاز سے، جس طرح ہتھیاروں کے امتحان میں خنجر و تلوار کی باڑھ انگلیوں سے پہلے دیکھتے ہیں۔ مضامین کے پرکھنے کی کسوٹی گویا پیرایۂ آغاز ہے کہ لب یار سے پہلے لب ساغر کا مزہ لطف سے خالی نہیں۔ ؎

اندھیر ہے کہتے ہو کہ دل کس نے چرایا ؛ تحقیق کرو گیسوئے طرار سے پہلے

پیرایۂ آغاز کے تحت میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں

جس طرح تعبیر کے پہلے خواب کا بیان کرنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح صلائے عام کے ہر پرچہ کے مضامین کا ذکر پہلے ہی بیان

کر دینے کا دستور ہو گیا ہے اس صورت میں صلائے عام کا پہلا مضمون پیرایۂ آغاز سمجھا جاتا ہے جس طرح مسجد میں نماز سے پہلے اذان و دیر و کلنشت میں صدائے ناقوس اسی طرح مضامین کے لئے پیرایہ آغاز سمجھا جاتا ہے، جناب بیتاب عظیم آبادی کا شعر ہے۔ ؎

بجا رہے نہ مرے عقل و ہوش لے بیتاب
غضب کا مست مجھے پہلے ہی سبو نے کیا

"شرح ہنگامۂ ہستی ہے گذرگاہ خیال" کے عنوان سے میر صاحب نے دسمبر ۱۹۳۱ء کے صلائے عام میں تیرھویں صدی کا ایک مضمون نقل کیا ہے اس کا ایک حصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے،

"دنیا کی جتنی مشابہت میکدہ سے ہے اتنی کسی سے نہیں جس طرح مستوں کی کوئی حرکت سمجھ میں نہیں آتی، اس کی ساری باتیں نرالی دیکھیں، اس کا کارخانہ ہی مثل وضع مستاں عجیب ہے، ؎

مرنج اے شیخ از من گر سخن بے پردہ میگویم
کہ ایں بے پردہ گفتہا نہ تاثیر خرابات است

ذرا سر اٹھائیے تو ایک خمخانۂ بے ستون دیکھئے جسمیں ایک ساغر واژگوں رات دن چل رہا ہے، گردن جھکائیے تو زیر قدم ایک اور ہی عالم سکوت دیکھئے کہ اس طرف تو نعرۂ مستانہ ہے اُدھر چپ لگ رہی ہے، یہ اپنے حال میں مست ہیں تو وہ مدہوش پڑے ہیں، کسی کو کسی کی خبر نہیں، یہ اُن کی تو وہ ان کی نہیں سنتے، ساقی روزگار نے دونوں کو ایسی داروئے بیہوشی پلا دی ہے کہ وہ چپ ہو کر پڑ گئے اور یہ اپنی دھن میں بکنے لگے، یعنی جب وہ نہ خم پہونچے تو دُرد کی طرح بیٹھ گئے اور یہ سرجوش مے کی طرح اُبلا کئے جب تک یہ بھی انہی میں جا ملے ؎

جہاں نیست مستانہ در گفتگو　　زمیں خانۂ اوست ایں ہائے وہو

غرض یہ عالم ایک میکدہ ہے جس کا سرجوش سخن میں ہے جس کی بدولت ہر شخص اپنی اپنی دھن میں ہے، اس میں زبان کا ہلانا نعرۂ مستانہ کے برابر ہے۔

رنگینیٔ کلام بادۂ گلگوں سے بڑھ کر ہے، گلوئے خم جوشِ بیانوں کی آوازیں ہیں۔ جوشِ فصاحت میں مے پرتگال کی کیفیتیں ہیں، اسکی مستی سخن پرستی ہے، جس کے مرتبہ کو دنیا میں کوئی دولت نہیں پہونچتی یہی ایک دولت ہے جس کے سوا انسان کچھ نہ لے، یعنی اپنا بس چلے تو سب کو چھوڑ اسی کا ہو رہے یا یوں کہئے کہ اگر آرزو اور حصول آرزو میں فرق نہو، حوصلہ و زمانہ کا ساتھ ہو تو اپنی چلتے انسان اسے نہ چھوڑے یہ وہ دولت ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہیگی اس کا سرا ازل میں ہے تو کنارا ابد میں ہے۔

میر صاحب نے اپنی تحریر میں جسقدر محاورے صرف کئے اسکی نظیر اردو کے بہت کم انشا پردازوں کے ہاں مل سکے گی، اُن کی تحریروں کو پڑھ کر انواع و اقسام کے محاوروں کے صحیح استعمال کا طریقہ معلوم ہوتا ہے، انہوں نے نئی نئی ترکیبیں تراش کر جس طرح اردو کے خزانے کو معمور کیا ہے یہی ایک ایسی مہتم بالشان خدمت ہے کہ اردو اُن کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، میر صاحب نے جو لٹریچر پیدا کیا اصل میں وہ خاصہ کی چیز ہے، چنانچہ انہوں نے خود ہی بار ہا علی الاعلان اس کا اعلان کیا ہے، "افسانۂ ایام" نکلتے وقت آج سے لگ بھگ چالیس برس پیشتر تحریر فرماتے ہیں:" افسانۂ ایام نامی ایک پرچہ نکالا جاتا ہے جو اعلےٰ لٹریچر یعنی غایت فصاحت اور کمال انشا کا نمونہ ہے جس میں وسعت خیال اور ہر طرح کے اظہار کمال کا وہ اہتمام کیا گیا ہے کہ مضامین علمی و تحقیق فلاسفی اور الٰہیات و دینیات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہو سکے یعنی جو غرض "تیرھویں صدی" اور "زمانہ" نامی پرچوں سے تھی وہ نہ جانے پائے اور ساتھ ہی عمدگی مضامین میں ولایت کے اعلےٰ لٹریچر کے عمدہ پرچوں سے کم نہو اسی طرح آج سے پینتیس چھتیس برس اُدھر "ناصری" کے ...... میں لکھتے ہیں۔

مدت سے یہ شکایت تھی کہ اعلیٰ لٹریچر کا کوئی پرچہ نہیں نکلتا جس میں ہمارے ملک اور زبان کی ترقی کے پورے سامان ہوں شکایت مٹانے کے لئے "ناصری" نامی ایک پرچہ نصرت المطابع دہلی سے نکالا جاتا ہے، "صلائے عام" کا بھی یہی حال تھا، بلکہ صلائے عام میں یہ شراب دوآتشہ وسہ آتشہ ہو گئی تھی۔ "صلائے عام" سچ مچ

عوام کے لئے نہیں بلکہ یارانِ نکتہ داں کے لئے نکالا گیا تھا، افسوس کہ اسوقت میرے پیشِ نظر صلائے عام کے دو چار پرچوں کے سوا اور کچھ نہیں ورنہ میں.........

میر صاحب وضع زمانہ پر خامہ فرسائی فرماتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"زمانہ کو کسی کا تپاک منظور نہیں، کوئی آئے کوئی جائے اسے پروا نہیں، یہ صبح کو شام سے اور دن کو رات سے جدا کر دیتا ہے، بدن سے جان کو، چمن کو رنگ سے اور پھولوں کو خوشبو سے جدا کر دیتا ہے مگر ایک کا جانا دوسرے کے آنے کا پیش خیمہ ہے، خزاں کے بعد بہار کا انتظار کیا جاتا ہے اور انتظار کے بعد آمد یار کا لطف آتا ہے۔ ؎

بہارِ گل کو نہ رہنے دیا گلستاں میں
خزاں جو پھولی ہے جب جانیں خزاں ہو جائے

جب بزرگوں کے عرس میں ثواب ہے، تو بچوں کی سالگرہ میں کیا گناہ ہے؟ پیدا ہونے کے بعد مرنا ہے، اس لئے پیدائش مقدم سمجھئے کہ ہر انجام کے لئے آغاز ضرور ہے، جناب برق کا شعر ہے۔ ؎

اے برق اپنے جامۂ کہنہ کو سی تو لو   کیا جانے کس گھڑی خبر آئے بہار کی

آپ دیکھ رہے ہیں کہ زمانہ کا رنگ ایک وضع پر نہیں رہتا، غنچے کملاتے ہیں اور کھلتے بھی ہیں، دنیا میں غفلت بھی ہے اور ہوشیاری بھی ہے، یاروں میں اختلاط ہے تو بے اعتنائی بھی ہے جہاں حق ہے وہاں باطل بھی ہے، کوئی قبر ٹوٹی پڑی ہے تو کسی کی تربت پر پھولوں کی چادر پڑی ہوئی ہے، بیماری میں اگر مرنے کا اندیشہ ہوتا ہے تو شفا کی بھی امید ہوتی ہے، ورنہ کوئی بیمار جانبر ہوتا خاصکر مریضانِ محبت۔ ؎

تلوّن نے ترے مارا مریضانِ محبت کو
گھڑی بھر میں جگہ بدلی نظر بدلی زباں بدلی

عالمِ اسباب کا مدار ہی زمانہ کے الٹ پھیر پر ہے کہ اس کا کروٹیں بدلنا اس کی زندگی کا باعث ہے، سوتا آدمی جب کروٹ نہ لے تو موت کا گمان ہوتا ہے، بیمار کو جب ایک طرف پڑے پڑے دیر ہو جاتی ہے تو پاس والے کروٹ بدلوا دیتے ہیں، فصد میں جب تک خون کا رنگ نہ بدلے خون بند نہیں کرتے، شمع صبح کو بجھا دی جاتی ہے تو شام کو جلا دی جاتی ہے۔

شمع محفل کو تری قیس نے لیلےٰ جانا   صبح تک شام سے فانوس کو محمل سمجھا

میر صاحب میں ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ جہانتک زبان کا تعلق ہے، باعتبارِ موضوع ان کے تمام مضمونوں میں ایک ہی طرح کی ہمواری پائی جاتی ہے، کہیں ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک جگہ کچھ اور زبان لکھی ہے اور دوسری جگہ کچھ اور زبان ہے، مولانا شبلی کی تصانیف کو لیجئے اور بغور مطالعہ کیجئے، "شعر العجم" کی زبان اور "سیرت النبیؐ" کی زبان میں بیّن فرق نظر آئے گا، اگر کوئی یہ کہے کہ "شعر العجم" میں تو شاعروں کے حالات اور شاعری پر ریویو ہے تو میں عرض کروں گا کہ "سیرت النبیؐ" اور "الفاروق" ہی کو اٹھا کر دیکھ لیجئے جہانتک فنِ سیرت نگاری اور تاریخ کا تعلق ہے، باعتبارِ فن دونوں ایک چیز ہیں! پھر ان دونوں کی زبان میں ہمواری کیوں نہیں پائی جاتی؟ رتن ناتھ سرشار کو لیجئے! "فسانۂ آزاد" اور "سیر کہسار" میں جو زبان نظر آئے گی وہ "کامنی" "کڑم دھم" اور "پی کہاں" میں مفقود ہے، حالانکہ یہ سب ناول ہیں، پروفیسر محمد حسین آزاد کو لیجئے میں "آبحیات" کے مقابلے میں "نصیحت کا کرن پھول" پیش کرنا نہیں چاہتا کیونکہ شاید یہ کہا جائے کہ "نصیحت کا کرن پھول" لڑکیوں کے لئے لکھی گئی ہے، لہذا اس کی زبان "آبحیات" کی زبان سے مختلف ہونی چاہئے، میں کہتا ہوں کہ حضرت آبحیات کے مقابلے میں "دربارِ اکبری" کو رکھئے ایک میں شاعروں کا تذکرہ ہے اور دوسری میں اکبری نورتنوں کا ذکر، دونوں کی زبان ایک ہی ہونی چاہئے، پھر یہ بلندی و پستی کیسی؟ مجھے اس معاملے میں متقدمین میں میر امن و رجب علی بیگ سرور اور متاخرین میں میر محمد حسین جاہ لکھنوی، سید علی سجاد عظیم آبادی، مرزا رسوا لکھنوی، نواب نصیر حسین خیال، راشد الخیری اور موجودہ انشا پردازوں میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے نثار نظر آتے ہیں، کہ ان کی مختلف تحریروں میں بلندی و پستی نہیں پائی جاتی ہر مقام پر ایک ہی طرح کی ہمواری نظر آتی ہے اور بلاشبہ میر ناصر علی کو انہی ادیبوں کی صف میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔

عجب کا مقام ہے کہ لوگوں نے شبلی کے روزمرہ اور محاورہ پر اعتراض کرتے ہوئے اسے پورب کی زبان قرار دیا، سرشار نے جب "فسانۂ آزاد" لکھی تو اودھ پنچ نے شور مچایا کہ فلاں محاورہ بیگمیں نہیں لونڈیاں بولتی ہیں، حتیٰ کہ ان اعتراضات سے اردو کے عالیجاہ ادیب پروفیسر محمد حسین آزاد بھی نہ بچ سکے، میر ناصر علی نے ۸۶ برس کی عمر پائی، اور ہندوستان میں ساٹھ برس اپنی تیغ زبان کے جوہر دکھلاتے رہے اور صرف ایک دو نہیں بلکہ ہزاروں مضمون لکھ ڈالے مگر کبھی کسی کو جرات نہ ہوئی کہ ان کی زبان پکڑتا، میر صاحب جس اسٹائل کے مالک تھے وہ خود انہوں نے پیدا کیا تھا اور بہت کم ایسے صاحب طرز ادیب پیدا ہوئے ہیں کہ ان کے مضامین میں آورد اور تکلف کا شائبہ نہ پایا جائے اور میر صاحب کا شمار بھی انہی معدودے چند طرز ادیبوں میں ہے، ان کی کسی بھی تحریر کو اٹھا لیجئے بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سمندر ہے جو ایک ہی انداز پر بہتا چلا جارہا ہے، بناوٹ اور تصنع کا کہیں نام تک نہیں، میر صاحب خواہ فلسفیانہ و متصوفانہ نکات کی وضاحت کریں یا علمی و ادبی معارف بیان کریں ہر جگہ وہی بیساختہ پن اور روانی دکھائی دے گی اور قدم قدم پر روزمرہ و محاورہ کا چٹخارہ نظر آئے گا، شوخی و ظرافت ان کے گھر کی لونڈی تھیں، موت ہی کا مضمون کیوں نہ ہو اسے ایسے البیلے لفظوں میں ادا کرتے کہ موت بھی محبوبۂ جاں نواز معلوم ہونے لگتی۔

میر صاحب اردو فارسی اور عربی کے منتہی تھے، ان کے والد بزرگوار مولانا ابوالمنصور کا غدر سے بیشتر کے متقدر علماء میں شمار ہوتا تھا، انہوں نے یہ زبانیں پہلے اپنے والد ہی سے سیکھی تھیں، انگریزی میں ان کی تعلیم انٹرنس تک تھی مگر وہ آج کے انٹرنس پاس نہیں ستر برس پہلے کے انٹرنس پاس تھے، پھر مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے، نظر بریں انگریزوں کی ہم بزمی و ہم نشینی کے علاوہ انگریزی لٹریچر کے وسیع مطالعہ کی وجہ سے ان کی انگریزی لیاقت بڑی اچھی ہوگئی تھی، اعلیٰ انگریزی انشاپردازوں کی تحریریں اور انگریزی شاعروں کا کلام ان کی نظر سے گذر چکا تھا اور انگریزی کی وساطت سے وہ یورپ کی دوسری زبانوں کے اعلےٰ لٹریچر سے بھی پوری طرح واقف تھے، جہاں کہیں انہیں اچھی چیز نظر آتی وہ اسے اردو میں بیان کرتے وہ اتنے بڑے دیدہ ور تھے کہ دنیا کا کوئی حسن انکی نگاہوں سے نہ چھپ سکتا تھا، اگرچہ انہوں نے انگریزی کو کبھی انشاپردازی کا ذریعہ نہیں بنایا، لیکن جن لوگوں کو ان کے پرائیویٹ خطوط دیکھنے کا موقعہ ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ میر صاحب کتنی پاکیزہ انگریزی لکھتے تھے اگر کوئی شخص ان کے انگریزی خطوں کا انتخاب کرکے چھاپ دے تو یہ ہندوستان کی انگریزی انشاپردازی پر احسان ہوگا، بہر نوع وہ اردو کے اسقدر دلدادہ تھے کہ انہوں نے اسی ایک عروس کے ناز جھیلنے میں اپنی ساری زندگی ختم کردی۔

ہماری زبان میں بذلہ سنجی (   ) اور ظرافت (HUMOUR) کا عنصر بہت کم ہے، میر صاحب کی طبیعت میں فطرتاً یہ چیزیں رچی ہوئی تھیں اور انگریزی لٹریچر کے مطالعہ نے اس رنگ کو اور زیادہ تیز کردیا تھا، وہ ہر بات میں کوئی ایسی بات کہہ جاتے کہ پڑھنے والے کے لب پر بیساختہ ہلکی مسکراہٹ آجاتی۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"اردو میں اسی ملک اور اسی آب ہوا کے موافق خیالات ہیں میں زیادہ اثر ہوسکتا ہے، مشغلۂ عشق و محبت کی طرح زبان کے معاملے میں شیخ برہمن کا امتیاز نہیں، دیر و حرم کی بحث نہیں، اردو ادب کو ان جھگڑوں سے واسطہ نہ رکھنا چاہیئے لیلیٰ اچھی تھی تو دمن کیوں اچھی نہیں، شیریں کی تعریف منظور ہے تو ہیر کی تعریف بھی ضرور ہے۔ ؎

تصویر حسن رنگ بدلتی ہے جابجا   عذرا کہیں بنی تو کہیں ہیر بن گئی

ایک مرتبہ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی نے اپنے رسالے "دلگداز" میں دعوےٰ کیا کہ اردو نثر میں عاشقانہ مضامین کا موجد میں ہوں، "دلگداز" کا یہ نمبر کسی منچلے انصاف پسند کی نظر سے گذرا

اس نے فوراً "دبدبۂ آصفی" (حیدرآباد دکن) میں بانگ دہل اعلان
کیا کہ اس طرز کے موجد میر ناصر علی دہلوی ہیں اور اس رنگ کے
مضامین سب سے پہلے ان کے قلم سے "تیرھویں صدی" میں شائع
ہونے شروع ہوئے تھے۔

اگرچہ میر صاحب نے ردیف قافیہ اور وزن کی قید سے کوئی
شعر نہ کہا، لیکن اگر شاعری تخیل کی بلندی اور محاکات کی رنگ
آمیزی کا نام ہے تو شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اپنے رنگ میں اردو کے
ایک ایسے بلند شاعر تھے کہ ان کا "رنگ سخن" خود ان ہی کی ذات پر
ختم ہوگیا، ان کی نثر بلاشبہ شعر منثور ہے، جس منچلے انصاف پسند کا اوپر
ذکر ہوچکا ہے، اسی نے اسوقت "دبدبۂ آصفی" میں صاف طور پر
یہ بھی لکھدیا تھا کہ میر ناصر علی کے عاشقانہ مضامین کا رنگ ریاض
خیرآبادی نے جو ایک بچپن طبیعت نوجوان شاعر ہیں اڑایا اور انہی
خیالات کو شعر میں باندھنا شروع کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس
منصف مزاج نے یہ غلط بھی نہیں لکھا تھا، چنانچہ ریاض کو بھی اس سے
انکار نہیں تھا۔

شاد عظیم آبادی اور اکبر الہ آبادی میر صاحب کے بڑے
مداح تھے، یہ حضرات میر صاحب کو خط لکھا کرتے اور یہ جناب
ان خطوں کو "صلائے عام" میں چھاپا کرتے تھے، غرض دور آخر کے
تمام انشاپرداز یعنی آزاد، حالی، شبلی، سجاد حسین، علی سجاد عظیم
آبادی، نذیر احمد، وحید الدین سلیم، رتن ناتھ سرشار، مہدی
حسن افادی اور میر ناصر نذیر فراق وغیرہ میر صاحب کو اپنی صف کا
ایک ممتاز ممبر سمجھتے تھے، اسی طرح دور حاضر کے تمام چوٹی کے
انشاپرداز خواہ وہ بنگال و بہار کے ابوالکلام آزاد و سید سلیمان
ندوی ہوں، پنجاب کے سر عبدالقادر اور دلی کے حسن نظامی ہوں
یا یوپی کے نیاز فتحپوری!! سب کے سب میر صاحب کے قائل تھے
افسوس کہ گیسوئے اردو کے سنوارنے میں وہ کچھ ایسے محو ہوئے کہ
اُن کے دوسرے کمالات کی طرف کسی کی نظر نہ گئی، میر صاحب وہ
بزرگوار تھے کہ انہوں نے لال قلعہ کی بہاریں اور مغلوں کے
چل چلاؤ کا زمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، مزید برآں وہ غالب
مومن، ذوق، شیفتہ اور تفتہ کو ایک دو دن نہیں برسوں مشاعروں
میں سنتے رہے اور ان کی صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے تھے، پھر
مرزا داغ، راقم الدولہ ظہیر، محمد حسین آزاد، اور ڈپٹی نذیر احمد
ایسے بزرگوں کے ہم جلیس بھی رہ چکے تھے، میر صاحب اگر ایک طرف
گذشتہ ساٹھ ستر برس کی مجسم علمی و ادبی تاریخ تھے تو دوسری طرف نہیں
غدر دہلی اور اس کے متعلق ہزارہا ایسے واقعات یاد تھے کہ ان کے
بعد اب تاریخ غدر کے ان پریشان ورقوں کی چمن بندی مشکل ہی
نہیں بلکہ محال نظر آتی ہے، افسوس ہندوستان کسقدر بدنصیب ملک ہے،
کہ یہاں کسی باکمال انسان سے کوئی کام لینے والا بھی نظر نہیں آتا، اس
موقعہ پر میر صاحب کے مداح اور دوست سر جان تھامپسن آنجہانی
سابق چیف کمشنر دہلی کے ایک خط کا ترجمہ پیش کرتے ہیں، یہ خط مرحوم نے
میر صاحب کی وفات کے بعد لکھا تھا۔

"مجھے یہ معلوم کرکے انتہائی قلق ہوا کہ میرے قدیم اور پیارے
دوست خانبہادر میر ناصر علی کا انتقال ہوگیا، میر صاحب گذشتہ
تیس سال سے میرے شناسا تھے، جب ہم دلی میں اکٹھے نہ ہوتے
تھے، تو ہمارے درمیان خط و کتابت ہوتی رہتی تھی، مجھے ہمیشہ
اُن کے خطوں میں لطف آتا اور بات کرنے میں اور زیادہ مزہ
آتا تھا، تاریخی ذوق کے معاملے میں میر صاحب اور میں بڑی حد تک
ہم مذاق تھے، اگلی دلی کے متعلق ان کا علم حیرت انگیز طور پر وسیع تھا
میرا خیال ہے کہ اب ان کے انداز کا کوئی دوسرا آدمی باقی نہیں رہا
ہے، مجھ سے کبھی کسی ایسے شخص سے ملاقات نہ ہوئی جس میں معلومات
حاصل کرنے کا میر صاحب سے زیادہ شوق پایا جاتا ہو اور جو ایسی
اطلاعات حاصل کرنے کا دلدادہ ہو۔ جنہیں گردش ایام نے فراموش
کردیا ہے، یہ خیال میرے لئے سوہان روح ہے کہ اب میر صاحب سے
نامہ و پیام کا سلسلہ منقطع ہوگیا، تاہم میرے پاس "صلائے عام" کے
وہ تمام نمبر محفوظ ہیں جن میں میر صاحب نے تاریخی مضامین پر قلم اٹھایا
اور دلی کی قدیم سوسائٹی اور وہاں کے رسم و رواج قلمبند کئے، ان

مضامین کا اسٹائل میر صاحب کی طرزِ زندگی سے اسقدر ملتا جلتا ہے
کہ اب میں اُن کے پردے میں میر صاحب کا معنوی جلوہ دیکھا کرونگا"

جس طرح میر تقی کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بد دماغ اور مغرور
تھے، اسی طرح لوگ ان کی زندگی میں انہیں بھی بد دماغ اور
مغرور سمجھتے رہے، اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا، میرے
ایک عزیز دوست صاحب مولانا محمد علی مرحوم کے مشہور اخبار "ہمدرد"
میں کچھ لکھا کرتے تھے، وہ جب میر صاحب سے ملنے گئے تو اپنا
تعارف کراتے ہوئے کہیں ہمدرد سے اپنا تعلق ظاہر کر دیا۔ پس
پھر کیا تھا میر صاحب تو بھرے بیٹھے تھے، فوراً بھڑک اٹھے اور
کڑک کر فرمایا "محمد علی سے کہدینا کہ وہ خواہ مخواہ اردو کے پیچھے پڑا
ہوا ہے۔ اسے قیامت تک اردو نہ آئے گی، البتہ وہ انگریزی اچھی
لکھتا ہے، اگر کچھ لکھنا ہو تو انگریزی میں لکھا کرے"

سردار موہن سنگھ دیوانہ کا بیان ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ
میر صاحب سے ملنے دلی گئے تو میر صاحب نے یہ کہکر ملنے سے انکار
کر دیا کہ "ہماری زبان بگڑ جائے گی" اہل ہوش میر صاحب کی ایسی
باتوں کو سنتے اور خندہ پیشانی سے برداشت کرتے اور اسے ان کی نازک
مزاجی پر محمول کرتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ میر صاحب نہ تو بد
دماغ تھے اور نہ مغرور ان کی بد دماغی فی الواقع ان کی "نازک مزاجی"
اور اُن کا غرور اصل میں ان کی "وضعداری" تھی، اگر میر ناصر علی میں
یہ نازک مزاجی اور وضعداری نہ ہوتی تو نثر اردو کا دامن حسین
شاعرانہ نثر کے گلہائے رنگا رنگ سے خالی نظر آتا۔

میر ناصر علی کی وضعداری کا یہ عالم تھا کہ "صلائے عام" کے سرورق سے
لے کر مضمونوں کی سرخیاں تک ایسی ہوتیں کہ وہ صلائے عام کے سوا
اور کہیں نظر نہ آتی تھیں، حکومت کی طرف سے انہیں "خانبہادر" کا
خطاب دیا گیا تھا، ساری دنیا اپنے نام کے پہلے "خان بہادر" لکھا کرتی
ہے، لیکن میر ناصر علی اپنے نام کے پیچھے "خانبہادر" لکھا کرتے تھے اور صلائے
عام میں ہمیشہ ان کا نام "میر ناصر علی خان بہادر" چھپتا رہا، اکثر اصحاب سے
سنا ہے کہ میر صاحب ہر ماہ اپنی جیب خاص سے صلائے عام پر سو سو
روپے صرف فرمایا کرتے تھے، وہ اپنے رسالہ کا اشتہار کسی رسالے میں
شائع کرانا اپنی توہین سمجھتے اور پروپگنڈے کو مغربی تہذیب کا اوچھا
ہتھیار سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ عوام کیا معنی بہت سے خاص لوگ
بھی یہ معلوم نہ کر سکے کہ "صلائے عام" نامی کوئی رسالہ نکلتا بھی ہے یا نہیں
انکی یہ وضعداری اس حد تک بڑھی ہوئی تھی، کہ وہ خریدار بھی
دیکھ بھال کر ہی بنایا کرتے تھے،

چونکہ میر صاحب شاید اردو کے ازلی آشنا تھے اس لئے
وہ کسی قیمت پر یہ پسند نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص ان کے معنوی معشوق کا
چہرہ بگاڑ دے، وہ دنیا کا ہر گناہ معاف کر سکتے تھے لیکن اس گناہ کو
کبھی معاف نہ کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ اُن سے
ملتے ہوئے ڈرتے اور اچھے اچھے انشا پرداز اُن کے سامنے جاتے
ہوئے کانپتے تھے کہ مبادا دورانِ گفتگو میں منہ سے کوئی غلط لفظ یا
محاورہ نکل جائے اور پھر لینے کے دینے پڑ جائیں، چنانچہ میر صاحب کے
اس کیرکٹر کی جھلک اُن کے پورے لٹریچر میں موجود ہے، ایک مرتبہ
"دبدبۂ آصفی" میں لکھتے ہیں:-

"میں وہی ناصر علی ہوں جس نے "رسالہ تیرھویں صدی" نکالا تھا
مگر نوجوان نہیں رہا، اس وقت کا کوئی آدمی جوان رہا ہو تو میرا قصور
جوانی کے ساتھ وہ طبیعت بھی نہ رہی جس کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا
مشغلہ جاری تھا، لکھنے کی تو میں نے مدت سے قسم کھا رکھی ہے،
مگر پڑھنے کی عادت نہ گئی، میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ جس غرض سے
میں نے اردو میں لکھنا شروع کیا تھا، وہ غرض میری آرزو سے
زیادہ پوری ہو گئی، اب مجھ سے بہت اچھے اچھے لکھنے والے
نظر آتے ہیں جن کی نظم و نثر سے اردو میں جان پڑ گئی۔

درمستاں زدم تا حال ہشیاراں شود پیدا
نہفتم قدر خود تا قیمت یاراں شود پیدا

(از دبدبۂ آصفی۔ جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ)

جب مولوی عبدالسلام ندوی صاحب کا "شعر الہند" نامی تذکرہ
شائع ہوا اور خانبہادر مرحوم نے یہ سنا کہ اس تذکرہ میں ریاض خیرآبادی کو

بہت لے دے کی گئی ہے تو آپ نے "صلائے عام" میں تحریر فرمایا۔

"میں نے سنا ہے کہ "شعرالہند" نامی تذکرہ میں لسان الملک جناب ریاض خیرآبادی کے کلام پر کسی صاحب نے اعتراض کیا ہے تذکرہ نویسی کے لئے، میری دانست میں پہلی شرط یہ ہے کہ خود بھی شاعری میں ید طولےٰ رکھتا ہو، فارسی میں آذر کا آتشکدہ اس لئے لاجواب ہے کہ تذکرہ نگار بڑے مرتبہ کا شاعر تھا اسی طرح شعراء اردو کے تذکروں میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ (گلشن بے خار) زیادہ مقبول ہے کہ خود شیفتہ کے کلام کا کیا کہنا۔

شاعری کو طالبعلمی سے کیا غرض؟ مولانا جامی کے شعر پر مدرسہ کے کسی مُلّا نے اعتراض کیا۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ میرا شعر مدرسہ میں کون لے گیا؟ ؎

سجادہ خانقہ سے لبِ خم جو آ گیا
یہ کیا ہوا ریاض؟ یہ کیا دل میں آ گئی

میں نے "شعرالہند" ابھی نہیں دیکھا مگر اس بحث سے تذکرہ کے دیکھنے کا شوق ہے کہ ریاض کے کلام پر اعتراض از روئے سخن فہمی اور "از روئے سخن سنجی ہو تو اور بھی بہتر ہے" کس پایہ کے لوگ ہیں؟" (صلائے عام - جنوری ۱۹۲۹ء)

ستمبر ۱۹۲۳ء کے صلائے عام میں "فرمائشی مضمون" کی سرخی کے تحت میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"بعض اصحاب مجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ جس خاص موضوع پر مضمون لکھوانا پسند ہو وہ بتادو، ان سے عرض ہے کہ جو مضمون مجھے درکار ہیں یہ ہیں۔

(۱) اور زبانوں کی شاعری سے اپنی زبان کی شاعری کا مقابلہ اپنی سے مراد جس زبان کو آپ پسند کریں، اس طرح کہ فارسی کا عربی سنسکرت و ہندی سے یا عربی کا اور زبانوں سے یا ہندی کا اور زبانوں سے علیٰ ہذا القیاس۔

آپ کسی زبان کے وکیل بنجائیں اور اس کی طرف سے اور زبانوں سے مقابلہ کریں مثلاً آنکھ کی تعریف عربی میں شاعروں نے اس طرح لکھی ہے اور دیگر زبان والوں نے اس طرح تمثیل میں چوٹی کے شعر ہوں، معمولی کلام بیکار ہے۔

(۲) شعراز بان اردو میں یہ دیکھنا منظور ہے کہ ایک مضمون مثلاً حیا و شرم کا مضمون متقدمین نے یوں باندھا اور متاخرین نے یوں اساتذہ میں وہی مضمون ایک استاد نے اس طرح باندھا اور دوسرے نے اس طرح، اس میں ردیف و قافیہ کی پابندی مشاعرہ کے "مصرعہ طرح" کے انداز پر ضروری نہیں، ردیف و قافیہ و بحر مختلف ہو تو مضائقہ نہیں، صرف نفس مضمون واحد ہو یہ مضامین جس قدر تفصیل و طوالت سے لکھے جائیں اہل سخن کے کام کے ہیں، ان میں اختصار کی گنجائش نہیں"۔

خریداروں کے لئے ایک "اطلاع" مطبوعہ صلائے عام - اپریل ۱۹۲۹ء کا ایک شذرہ ملاحظہ ہو:۔

"صلائے عام کی قیمت پیشگی چھ روپے سالانہ ہے قیمت بذریعہ منی آرڈر عنایت فرمائی جائے مضمون نگار بھی صلائے عام کی قیمت سے بری نہیں، نہ یہ ضرور ہے کہ ہر مضمون خواہ مخواہ شائع کیا جائے۔ جامع اوراق کو مضمون میں کمی بیشی کا اختیار رہے جو مضمون شائع نہ ہو سکیں، ان کے واپس کرنے کا ذمہ نہیں اگر واپس منگانے کی ضرورت ہے تو محصول ڈاک آنا چاہئے۔ صلائے عام میں ہر طرح مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں زیادہ تر نثر کے اسوقت نثر کی زیادہ ضرورت ہے اور نثر بھی ایسی جس میں زبان کی خوبی و فصاحت کے ساتھ مضمون کی پاکیزگی و نازک خیالی ضرور ہو، یعنی ؎

"عروس جمیل در لباس حریر"۔

اسی پرچہ میں میر صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"میں دیکھتا ہوں کہ اکثر رسالے اور اخبار میرے پاس بغرض ریویو و تبادلہ آجاتے ہیں۔ تبادلہ کے لئے صلائے عام ہر پرچہ کے ساتھ ہر وقت حاضر ہے، مگر ریویو سے میں جی چراتا ہوں کہ صلائے عام نکالنے سے میری غرض یہ نہیں کہ میں بھی پانچویں سواروں میں گنا جاؤں، مجھے خبط ہے کہ ملکی و قومی ترقی کے لئے اپنی زبان کی ترقی کی سب سے

زیادہ ضرورت ہے، میری آرزو یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنی زبان پر توجہ دی جائے، اس غرض سے میں نے "صلائے عام" اچھی اردو لکھنے والوں کی نذر کر رکھا ہے اور بہت خوش ہوتا ہوں جب اردو کے نظم و نثر کے اچھے مضمون مل جاتے ہیں، ریویو کا میں نے طرز رکھا ہے کہ جس رسالہ کا ریویو لکھا جائے اس کی دو ایک خوبیاں "صلائے عام" میں نقل کر دیجائیں جس طرح رکابدار دیگ کے دو ایک چاولوں سے ساری دیگ کا حال سمجھ لیتے ہیں۔

"اس سے میری یہ مراد ہے کہ جس طرح جس بات سے میں خوش ہوا اور اصحاب بھی خوش ہوں گے"۔

ان تمام باتوں کے باوجود میر صاحب کی تحریروں میں ایک خاص نقص نظر آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یا تو اُن میں کسی مستقل موضوع پر سو دو سو صفحات مسلسل لکھنے کی صلاحیت نہ تھی یا اُن کی طبیعت طوالت سے گھبراتی تھی، میں جہانتک سمجھ سکا ہوں اُن کی انشا پردازی کا مقصد منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں نئے نئے اسلوب نگارش پیدا ہوں، لوگ الفاظ و محاورات کے صحیح استعمال سے واقف ہوں اور نوجوانوں میں اردو لکھنے پڑھنے کا شوق پیدا ہو، افسوس کہ آسمانِ اردو کا یہ درخشندہ ستارہ جون ۱۹۳۳ء میں ہمیشہ کے لئے دلی میں غروب ہوگیا میر صاحب ہماری زبان کے ایک صاحب طرز ادیب اور اس اگلی تہذیب کے ایک باوضع علمبردار تھے جس کا آخری جھلملاتا ہوا چراغ ۱۸۵۷ء کے تیز و تند جھونکوں کی تاب نہ لاکر ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں خاموش ہوگیا!!

حشر جذبات

(از سحر طراز حضرت ثاقب کانپوری)

اب نہ کر آمادہ رہنے دے رہائی کی ہوس
میں ہوں مجبور الم اب کیا کھلے گا یہ قفس

پا شکستہ اور دل میں آرزوئے کوئے دوست
آ رہی ہے دُور سے کانوں میں آواز جرس

کھنچ رہی ہے روح میری کیا کروں صیاد میں
دے رہا ہے درسِ اُلفت اس چمن کا خار و خس

تھا سہارا جن پہ جب آنکھیں انہوں نے پھیر لیں
کون ہوگا میرا اس دنیا میں پھر فریاد رس

ظلم کر لیکن نظر رکھ انتہائے ظلم پر
آہ پر مجبور ہو جائیں نہ پابند قفس

موت سے بد تر ہے اس جینے کا حاصل کچھ نہیں
اُن کے دامن تک نہ ہو جب آنسوؤں کی دسترس

وہ فضائے کیف پرور وہ چمن کی نزہتیں
اب نہ دیکھو خواب ایسا اے اسیرانِ قفس

یہ ہیں پابند قفس رہنے بھی دے اِنکو یہیں
اب کہاں جائیں گے چھٹ کر یہ اسیرانِ قفس

یہ غرور تمکنت ہستی کا ثاقب تا بکے
کیا رہے گا دہر میں اللہ بس باقی ہوس

ہندوستانی موسیقی

(محترمہ عطیہ بیگم کے قلم سے)

ہندوستانی موسیقی کے علاوہ چند ہی مضامین اور ایسے ہوں گے جو اسقدر تاریکی اور گمنامی میں پوشیدہ رہے، بڑی تحقیق و جستجو کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے لئے مواد کی کمی یا کال نہیں ہے، عہد خیالی اور گذشتہ افسانوی تیس چالیس صدیوں کے بڑے وقفوں میں اس بات کی کوششیں کی گئیں کہ اس مواد کو جمع کیا جائے، ترتیب دی جائے (موجودہ عمل کو باقاعدہ اصول پر چلایا جائے) اور موجودہ اصولوں کو یکجا کیا جائے، لیکن ذوق و شوق کی کمی کی وجہ سے عہد گذشتہ کے علم کی ساری دولت اب گرد و غبار کے انبار میں دبی پڑی ہے، جبتک کوئی انسانی قوتوں سے بالاتر قوت اس کو از سر نو پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گی اسوقت تک اس علم کے متعلق ہماری معلومات ہمیشہ ناقص اور غیر مسلسل رہے گی۔

ہندوستانی موسیقی کا علم اتنا پرانا ہے کہ اگر ہم اس کی اصلیت و ابتدا کا سہرا ابتدائی دیوتا کے سر باندھیں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا — اس کے تاریخی حالات معلوم کرنے کے لئے یورپ کے موجودہ اندازہ لگانے کے قاعدے کی رو سے ادب سنسکرت کو چار مختلف دور میں تقسیم کرنا ہوگا۔

(۱) عہد منتر از سنہ ۲۰۰۰ق تا سنہ ۱۵۰۰ق

(۲) عہد چاند از سنہ ۱۰۰۰ق تا سنہ ۸۰۰ق

(۳) عہد برہمن از سنہ ۸۰۰ق تا سنہ ۶۰۰ق

(۴) عہد سوتر از سنہ ۶۰۰ق تا سنہ ۲۰۰ق

یہ ہمیں ایک ایسے گذشتہ زمانہ میں لے جاتا ہے جہاں ممکن ہے کہ یہ معلوم ہو کہ وہ بہت ہی پرانا ہے لیکن اس سے یہ صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں موسیقی نہ صرف موجود تھی بلکہ اس نے ایک اعلےٰ معیار حاصل کر لیا تھا اور راگوں کا ناپ تول جو کہ اس علم کا لازمی اصول ہے اور موسیقی کے برسہابرس کے نتائج پر وید جاننے والے رشی عمل کرتے تھے اس لئے آریہ سب سے پہلی قوم ہے جس نے اس ہنر کو تقریباً پایۂ تکمیل کو پہونچا دیا، ارتقا اور اختراعات اور ایجادات اس زمانہ کے "سام وید" یعنی نظمیں جو کہ رگ وید کا ایک جزو ہے اور جو قربانی کے وقت پڑھا جاتا تھا اس کے اوزان کی مثال وہ خود اپنے آپ ویدوں کے منتروں کے گانے بجانے کا قاعدہ سام ستر میں دیا ہوا ہے جس میں دورِ حاضر کی موسیقی کی ساری خوبیاں اور نکات موجود ہیں، راگوں کے سرگم باقاعدہ دیئے ہوتے ہیں، جس سے وزن کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے اور پھر اس کے گانے کا بھی طریقہ لکھا ہوا ہے۔

اُدگاتری کو (سام گانے والا پجاری) جو کہ قربانی کے احکام پورے کرنے والا ہے اپنی آواز سریلی اور موثر ہونے کی دعا کرنے دو اور اس کو اُدگیتا (صاف ستھری اور سادی آواز) سے راگوں کے سرگم سیکھنے دو اور پھر اسی اُدگیتا سے جس میں راگوں کا جز خوب موجود ہے، رت و گ کی رسوم ادا کرو" یہ ایک مستند قول ہے۔

"سام وید چلا ہی۔ "سام ستر" تھا جو ایک رسالہ ہے اور سات بابوں پر مشتمل ہے جس میں وید گائے جانے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ الفاظ

حرکات اور آوازوں کے سروں، راگوں اور گٹکری بھرنے کے اصول بنائے گئے ہیں، موسیقی اور ویدوں کی تعلیم کو لازم و ملزوم بتایا گیا ہے جو کہ عبادت سے کسی طرح الگ نہیں کیجا سکتی، "ویدوں" کی نظمیں گائی جاتی تھیں، "اپ ویدوں" نے اس کو ایک ہنر بنا دیا اور رشیوں اور منیوں نے جو کہ پڑھے لکھے اور قابل لوگ ہوا کرتے تھے، اس کو اپنی تعلیم میں داخل کر لیا۔

اسی وجہ سے "گاندھر وید" کو عظمت و بزرگی کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس کو کس نے اور کب تصنیف یا تالیف کیا یہ خود ایک راز ہے، حالانکہ علم موسیقی کی ساری پرانی کتابوں کا انحصار مکمل طور سے یا جزوی اعتبار سے جہاں تک فنی اصطلاحات کا تعلق ہے گاندھر وید پر ہی ہے۔

گاندھر اور سام ویدوں کی تالیف سے پیشتر اس بات کا دھندلا سا سراغ ملتا ہے کہ آزاد اور طبعزاد رجحانات دنیائے موسیقی میں کارفرما تھے، اس کے بعد ایک ایسے طویل دور کا آغاز ہوتا ہے جبکہ وہ رجحانات جو ناقص و فضول تصور کر لئے گئے تھے، ان کو دھرم شاستروں کی رو سے پھر مفید و کارآمد ثابت کیا گیا۔ یہ دھرم شاستر مذہب کی متبرک کتابوں کے نام ہیں جن کو رشی منی لوگوں نے تالیف کیا ہے۔

اب وید کے عہد میں موسیقی نے فنون لطیفہ کی حیثیت اختیار کر لی، برہمنوں کے زمانہ سے صرف یہی پتہ نہیں چلتا کہ عہد گذشتہ میں صرف راگ، راگنیوں کے سرگم کا استعمال ہوتا تھا بلکہ ان کی آوازوں کی باقاعدہ علمی طریقہ سے تحقیق کی جاتی تھی، جب تک کہ ہم اس سے قبل کے زمانہ میں موسیقی کا ارتقا تصور نہ کریں یہ بات ناقابل فہم معلوم ہوگی۔

عہد برہمن کا "اوپانیشد" کا ادب و علم نافہم اشارات اور کنایات میں پوشیدہ ہے جس سے اس زمانہ کے ہندو مذہب کی روحانیت کی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے لیکن جب اشعار کا وہ جامہ جس سے مذہبیت اور روحانیت کا دھوکا ہوتا ہے، اتر جاتا ہے تب سُروں اور راگوں سے ان کا براہ راست تعلق وارتباط ظاہر ہو جاتا ہے، موسیقی کے "سرحِن" اور "گرم" وغیرہ اور انکی لطیف ساخت سروں کا شمار، ترتیب و رد و بدل اور ان کے وقفہ بتلاتے ہیں۔

ان میں ایسے گانے ہیں جن کا بھجن سے کوئی سروکار و تعلق نہیں ہے اور باقاعدہ بھجن اور گانوں کا تعلق اور نام دیوتاؤں کی نسبت سے ہے۔

"چندوگیہ" اور دوسری "اپانیشد" میں باوجود تمام چیزوں کو معدوم کرنے کے یہ بات صاف کہی گئی ہے، کہ ویدوں کے پڑھنے میں بہت ہی زیادہ معنی خیز اور فوق الفطرت "اوم" کو ضرور پڑھنا چاہئے، ویسے "اوم" ہے کیا؟ یہ سب پر چھایا ہوا ہے، سب سے زیادہ اہم ہے (سب سے زیادہ جاذب) اور سب سے زیادہ پاک و متبرک ہے۔

"رگ" تمام گفتگو کا ماحصل ہے اور "سام" "پرن" یعنی سانس ہے "رگ" اور "سام" مل کر "میتھون" — یعنی جوڑا بنتا ہے۔

"اُدگیتا" "سوارہ" ہے (یعنی صاف ستھری اور سادی آواز) اور "اُدگیتا" تمام ماحصلوں کا ماحصل ہے۔

"اوم" "اُدگیتا" ہے جو سب سے زیادہ بزرگ و برتر اور سب سے زیادہ قابل پرستش ہے، اس کی آواز دل کے اندر مع اپنے ساتوں سروں کے گونجا کرتی ہے، جو کہ خاموشی میں بھی موجود ہے، بزرگ و برتر ہے، اور پوشیدہ بھی ہے "برہمن" (یعنی قابل لوگ) بھی غیر ممتاز اور ناقابل امتیاز اسی طرح ہوتے جاتے ہیں، جس طرح شہد میں مختلف پھولوں کی مہک و خوشبوئیں معدوم ہو جاتی ہیں اور وہاں ان کو دائمی حفاظت اور "حیات ابدی" حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح "اُدگیتا" اور اس کی مختصر آوازیں "اوم" "موسیقی الفاظ اور راگوں کی ایک ترتیب ہے، گوتم بدھ کے عہد کی تمام تصانیف سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موسیقی، باجے، گانے اور ناچ سب جزو زندگی تھے، زندگی میں اختیار کرنے والے اخلاقیات کے اعلےٰ اصولوں کی تشبیہات ہمیشہ دوران گفتگو میں سروں اور راگوں سے

دی جاتی تھیں۔

ساتویں سے انیسویں صدی تک اس مضمون پر بہترین کتابیں دستیاب ہوتی ہیں، یہ ایک قابل تعریف بات ہے کہ منتقل مکانات اور پرامن حکومت کی غیر موجودگی میں بھی "پنڈتوں" نے اپنی زندگیاں، غیر فانی تاریخ مرتب کرنے میں اور عہد تاریخ سے پیشتر کی موسیقی کو آنیوالی صدیوں سے وصل کرنے میں صرف کردیں

بادشاہ خود علم موسیقی کے ماہر اور قدردان اور مربی ہوتے تھے اور یہ شہزادوں کی ابتدائی تعلیم کا ایک لازمی جز تصور کیا جاتا تھا، یہانتک کہ شاہی عورتیں اور شہزادیاں بھی سنگیت یعنی ناچ گانا اور بھاؤ بتانا خود اپنے "سنگیت شالا" (یعنی خانہ رقص وسرود) میں جوکہ خاص طور پر اسی مقصد کے لئے تیار کیا جاتا تھا اور محلوں سے ملحق ہوتے تھے، سیکھا کرتی تھیں،

"گاندھرویدٔ" (یعنی فن موسیقی) (بعد میں سارے دنیا پر اثر کرنے کے لئے مخصوص تھا) عہد "پنیتی" جوکہ لسانیات کا ماہر تھا، سے قبل ہی راگوں کا ایک باقاعدہ طریقہ سنہ ۳۵۰ ق م میں معلوم کرلیا گیا تھا اس کے ایک عرصہ کے بعد اسی اصول پر ایرانیوں، یونانیوں، عربوں اور سب سے بعد میں انگریزوں نے بھی اپنے اصول اور قواعد مرتب کئے،

جب "بہرام گور" نے جوکہ ایران کا شہنشاہ تھا، ہندوستانی گویوں کے کمالات کو سنا تو اس نے ان کو اپنے دربار میں مدعو کیا۔ تقریبًا دس ہزار "لوریس" (یعنی معمولی گویے' ہند کے بادشاہ "شانکا" نے ایران بھیجے وہاں بہرام گور کی کشادہ دلی سے ان کی حوصلہ افزائی کی گئی اور انکو سلطنت میں داخل ہونے کی بخوشی اجازت دیدی گئی۔

جسوقت یونان کے "ترپندا" نامی شہرہ آفاق بربط نواز (یعنی چنگ بجانے والے) نے راگوں میں "اے" اور "ای" داخل کئے اور فیثاغورث نے "بی" داخل کرکے دوہرے سروں کا سرگم سات سو سال قبل مسیح مکمل کیا تھا، اس سے پہلے ہندو دوہرے سروں کے سرگم ہندوستان میں مکمل کرچکے تھے، یہ سکندر اعظم ہی تھا جو دریا سندھ کے کنارے سے اپنے ساتھ راگوں کے سرگم اپنے ملک لے گیا تھا اور تاریخی اعتبار سے یونانی ہی وہ پہلی قوم ہے جس نے پرانی دنیا میں سب سے پہلے "مرچن" "یعنی چوتھائی سر کے سرگم سیکھے۔

ہندوؤں کا علم موسیقی جسکو علم موسیقی کا 'بابا آدم' کہا جاسکتا ہے، رفتہ رفتہ ایران میں داخل ہونے لگا، اس کے بعد یونان میں پھر عرب میں اور وہاں سے وہ پھر ہندوستان واپس لایا گیا اسطرح اسکو پھر پرانی طرز پر لایا گیا اور وہی آج ہندوستانی موسیقی ہے

ایک ہزار سال گذر گئے کہ مسلمانوں کے آغاز سے ہندوؤں کی تمام تخیلی ترقی مسدود ہوگئی لیکن انجام کار فاتح بادشاہوں نے ہندوؤں کے علم موسیقی کو ایک اعلےٰ فن ہی تصور کرکے اختیار نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنے زور آور اور تاکیدی حمایت اور راہ ورسم سے اصلی موسیقی کے کچھ خط وخال بھی تبدیل کردیئے، جنوبی ہند باہر کے اثرات سے محفوظ رہا اور خونی جنگوں نے آریوں کے جذبات اور احساسات کے مواد کو ضائع نہیں ہونے دیا اور شاستروں کی روایات کو قائم وبرقرار رکھا ہے وہ بہت ہی صحیح ہے اس لئے اس کو بتدریج کتابوں سے باقاعدہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔

شمالی ہند میں بڑی گڑبڑ ہو گئی ، موسیقی کو موجودہ دو اقسام میں تقسیم کردیا گیا، ہندوستانی یعنی شمالی اور کرناٹکی یعنی جنوبی یہی دو اسکول صدیوں اس ملک میں رائج اور قائم رہے ہیں اور خاص فرق ان کے دو مکمل آزاد "شدھ" یا ابتدائی سرگم میں پایا جاتا ہے، ہندوستانی کا انحصار "بلاول" کے سرگم پر ہے، اور کرناٹکی کا دارومدار کناگنجی کے سرگم پر ہے، ان دونوں میں سے شمالی موسیقی کی لطافت، کشش وجاذبیت کا اس موجودہ بگڑی ہوئی حالت میں بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

منو "تینا ڈریاس" کے مشہور دور حکومت میں اصلاحات اور فنون لطیفہ کو عروج کمال پر پہونچانے میں بہت ہی پرجوش کوشش کی گئی، اسی وجہ سے اس دور کی لاتعداد ہر قسم کی شاندار یادگاریں

بہادر، شریف، پرشوکت اور شاندار قوم کی جس نے فتح کیا، حکومت کی ترقی کی اور جس نے دائمی برقرار رہنے والی شان و شوکت حاصل کی برقرار ہیں اٹھارھویں صدی کے آخری نصف حصہ میں مسلمانوں کا تنزل ہو چلا تھا اور ملک پر انگریزوں کا اثر ہوتا جارہا تھا اور تمام ملکی صنعت وحرفت تباہ ہو چلی تھی، موسیقی بھی آہستہ مگر یقینی تباہی کے پنجہ میں آگئی تھی، یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان کا بہترین پکا گانا صرف نام کو باقی رہ گیا ہے۔

فنی اعتبار سے ہندوستانی موسیقی نہایت ہی عمدہ اور باقاعدہ طور پر مکمل ہے، جہاںتک سروں اور راگوں کا تعلق ہے اس میں پورے بائیس راگ ہیں، اس لئے سروں کو ان کی اصلی حالت میں باقاعدہ ادا کرنا جوئے شیر لانے سے کم دشوار نہیں ہے، جس کے لئے سالہا سال کی محنت و کاوش درکار ہے،

دس مختلف اقسام (نحت) میں پورے دو سو مختلف راگ ہیں اور قاعدہ کی رُو سے وہ دن اور رات کو اپنے اپنے وقت و محل کے لحاظ سے گائے جاتے ہیں، راگوں اور سروں کا اتار چڑھاؤ علم الحساب کی رو سے بہت ہی باقاعدہ ہے، یہ راگ یعنی سر جنگل میں ہوا کی سنسناہٹ، ستاروں کی رفتار، پانی کی روانی اور چڑیوں کے زمزموں اور چہچہوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔

عہد گذشتہ کے قانون ساز فطرت کو نظر غائر سے مطالعہ کرنیوالے طلبا ہوتے تھے، انہوں نے آوازوں کے پوشیدہ رازوں کو کھول کر منظرِ عام پر سب کے سامنے پیش کیا۔ اور انہوں نے بعض صاف اور نمایاں آوازوں کو باقاعدہ وقت و موسم کے لحاظ سے ترتیب دیکر انکو فطرت کے مطابق بنا دیا،

مغربی اور ہندوستانی موسیقی میں دو نمایاں فرق پائے جاتے ہیں، اول الذکر تو بالکل ایک کل کی مانند صرف وہی چیز دُہراتا ہے، جو اس سے پہلے کوئی پیدا کرچکا ہے مگر اس میں اس غریب استاد کو اپنی انفرادیت دکھلانے کا موقع نہیں ملتا، بس کل کی مانند ایک ہی چیز کو دہراتا رہتا ہے، لیکن ہندوستانی گویا راگ کے ڈھانچہ کو لے کر اس میں "تاؤس" مختلف الانواع تبدیلیاں پیدا کرتا ہے، اس میں طرح طرح کی دلکشی اور رنگینی بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کو خود اپنی ذہانت اور قابلیت کے اظہار کا موقع ملتا ہے اور گانے کے دوران میں وہ اسی وقت نئی نئی الاپیں اور اتار چڑھاؤ پیدا کرکے اپنی انفرادیت ظاہر کرسکتا ہے

یہی حال "تال" اور "سُر" کا ہے۔ مغربی ممالک میں برابر اتار چڑھاؤ کے لحاظ سے صرف ایک ہی قسم کی تال اور لے ہوتی ہے، جبکہ ہندوستان میں مختلف سروں کے اعتبار سے کئی قسم کی تال اور لے ہوتی ہے، جس میں گویئے کو یکایک بہترین اتار چڑھاؤ، لطافت و دلکشی پیدا کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے، قبل اس کے کہ تم ایک سُر یا راگ سے لطف اندوز ہوسکو وہ فوراً دوسرے پر پہونچ جاتا ہے اور اس طرح اس میں نہایت ہی لطیف دلکشی اور ہم آہنگی پیدا کردیتا ہے۔

ایک انجان اور ناواقف شخص کے لئے سروں کا یہ اتار چڑھاؤ، نزاکت و لطافت اور تانوں میں یہ کمی و بیشی لایعنی و فضول معلوم ہوتی ہے، اور مشکل سے قابلِ سماعت تصور کی جاتی ہے۔ وہ محض نغمہ میں ایک روانی چاہتا ہے، جو ایک دوسرے میں جذب ہوتی چلی جائے اور اس کو "فردوس گوش" بنا دے ؛

(ترجمہ) اثر۔ فتح پوری



نورجہاں اور جہانگیر کی داستانِ عشق

(از جناب مسٹر شہنشاہ حسین رضوی - ایم - اے - ایل ایل بی (علیگ) ایم - آر - اے - ایس ایڈووکیٹ لکھنؤ)

تاریخ ہند کے قرون وسطیٰ میں مہرالنساء نورجہاں[1] بیگم کی زندگی ایک عجیب وغریب داستان ہے۔

سلسلۂ خاندان

مہرالنساء کے اجداد دولت خراسان کے دامن سے وابستہ تھے، خواجہ محمد شریف اس کا دادا تاتاری سلطان بگلر بیگی والی خراسان کا وزیر تھا، سلطان کی وفات کے بعد اس کا لڑکا قازق خاں مسندِ حکومت پر متمکن ہوا، اس کی زندگی بھر قلمدان وزارت خواجہ ہی کے ہاتھ میں رہا، جب اس نے بھی داعی اجل کو لبیک کہا تو شاہ طہماسپ صفوی نے محمد شریف کو یزد کی وزارت عظمیٰ کے جلیل القدر عہدہ پر فائز کرکے خراسان سے منتقل کردیا، ۱۵۷۶ء میں خواجہ دنیا سے چل بسا، اس کا مرنا خاندان کے لئے قیامت ہوگیا۔ مہرالنساء کا باپ مرزا[2] غیاث الدین محمد المعروف بہ غیاث بیگ پہلے تو تقدیر سے نبرد آزمائی کرتا رہا لیکن جب ایران میں طالع نے یاوری نہ کی تو قہراً جبراً ترکِ وطن کی ٹھان کر ہندوستان کی راہ لی، اس کے ساتھ دو فرزند محمد شریف ابوالحسن، ایک دختر اور اس کی رفیقہ حیات تھی، جو بدنصیبی یا خوش نصیبی سے حاملہ تھی، اسوقت ایران وہندوستان کا راستہ بڑا پرخطر تھا، راہزنوں کی منظم ومسلح سپاہ بڑے سے بڑے کاروان صحیح وسالم نہیں گزرنے دیتی تھی، وہی ہوا، مرزا غیاث نے ابھی نصف مسافت بھی نہیں طے کی تھی کہ تمام مایہ بساط لٹ گئی، اور وہ نان شبینہ تک کا محتاج ہوگیا، قزاقوں نے رحم کھاکر صرف دو خچر چھوڑ دیئے تھے، جو اس لٹے ہوئے مختصر قافلہ کو قندھار تک لائے یہاں پہونچکر ایک بلند اختر دختر پیدا ہوئی جس کا نام مہرالنساء رکھا گیا، امیر قافلہ ملک مسعود تھا، اس نے ان ستم کشتوں پر ترس کھایا اور اس مہ پارہ جمیلہ کو اپنی ماں کی آغوش تربیت میں دے کر انکی ہر ضرورت کو اپنی ضرورت سمجھا، اور راستہ بھر ان کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دی۔

ایرانی احسان فراموش نہیں ہوتا۔ وہ اپنی محسن کی پرستش کرنے لگتا ہے، مرزا غیاث ملک مسعود کے احسانات سے فرش راہ تھا اور دونوں میں وہ پیمان مودت ہوگیا تھا جسکو صرف موت ہی توڑ سکتی تھی، ہندوستان پہونچکر ملک مسعود نے مرزا غیاث کو فتحپور سیکری میں شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے حضور میں پیش کردیا اب کیا تھا، قسمت جاگ اٹھی، مرزا غیاث فوراً شاہی خدمت پر مامور ہوگیا۔

خافی خان نے اپنی تاریخ میں مرزا غیاث کے دربار شاہی میں

---

[1] مہرالنساء نام نورجہاں خطاب جو نورالدین جہانگیر نے شادی کے بعد دیا تھا۔

[2] مرزا کا خطاب اولاً ارکان خاندان شاہی کے لئے مخصوص تھا، بعدہ سولھویں صدی عیسوی میں امراء کو بھی عطا ہونے لگا تھا۔ راجہ جے سنگھ کچواہہ کو "مرزا راجہ" کا خطاب تھا، مرزا کامران نے ایک کتاب "مرزا نامہ" لکھی ہے جسمیں مرزا کے خطاب کی تاریخ و استحقاقات پر مفصل بحث کی ہے دیکھو مرزا نامہ مترجمہ (انگریزی) مولوی ہدایت حسین۔ ماخوذ از

رسائی کا ایک دلچسپ واقعہ لکھتا ہے[۱]

بادشاہ نے ملک مسعود سے شکوہ کیا کہ وہ اس بار کوئی عمدہ تحفہ اس کے لئے نہیں لایا، ملک نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "خداوند میں اس مرتبہ زندہ تحفے اپنے ولی نعمت کے لئے لایا ہوں، جو آج تک ایران و توران سے نہیں آئے، اس کے بعد اس نے مرزا غیاث اور اس کے فرزند اکبر کو حضور میں پیش کر دیا۔

مرزا غیاث الدین محمد المعروف بہ مرزا غیاث

مرزا غیاث الدین محمد المعروف بہ مرزا غیاث جس کی زندگی میں مہر النساء کی ولادت سے ایک عجیب و غریب انقلاب پیدا ہو گیا تھا، خوشرو، خوشخو، خوشگو، خوش مقال، خوش تقریر اور خوش تحریر شخص تھا سنجیدگی و متانت اس کے کیرکٹر کی نمایاں خصوصیت تھی، اسکو کام کا بہت شوق تھا اور بیکاری سے بہت تنفر، جس کام کو کرتا انہماک سے کرتا اور جبتک اسکو ختم نہ کر لیتا چین نہ لیتا، اس کی جانفشانیاں کبھی رائگاں نہیں گئیں اور اس کے مدارج ترقی کو بالا کرتی رہیں، دمِ واپسیں تک وہ کامرانی کے ساتھ جد و جہد کرتا رہا اور مرنے کے بعد بھی اپنا نام چھوڑ گیا ۱۵۹۵ء میں وہ سہ صدی منصبداری اور صوبہ کابل کی عہدۂ دیوانی پر فائز تھا۔

مہر النساء کی ولادت

جیسا کہ سطور بالا میں اشارا کیا گیا ہے، مہر النساء کی ولادت ۱۵۷۷ء میں قندہار میں ہوئی تھی، اس حد تک تو مورخین یکزبان و متفق الخیال ہیں اس کے آگے افسانہ تراشی شروع ہوتی ہے۔

ڈو[۲] لکھتا ہے:۔

"بلاکش ماں باپ نے اپنے کلیجے پر پتھر رکھکر اپنے جگر کے ٹکڑے کو راہ میں چھوڑ دیا تھا کہ ناگاہ آسپر امیر قافلہ ملک مسعود کی نظر پڑ گئی اور اس نے دوڑ کر اسکو اپنی آغوش میں لے لیا۔"

خافی خاں اٹھارھویں صدی عیسوی میں لکھتا ہے[۱]

"جب مہر النساء پیدا ہوئی تو ماں نے رات کو اس کو سڑک پر پھینکدیا، صبح کو ملک مسعود نے اسکو دیکھ کر اٹھالیا اور اس کی تربیت اپنی ماں کے سپرد کی"۔

اس کے بعد الفنسٹن[۲] نے بھی اس قصہ کو باور کر کے حرف بحرف اپنی تاریخ میں چھپ کر دیا۔ موخرین نے متقدمین کی کورانہ تقلید کی اور ایک بے بنیاد انسانی فطرت کے خلاف واقعہ صحائف تاریخ میں جگہ پا گیا ——— ڈاکٹر بینی پرشاد[۳] نے کیا خوب استدلال کیا ہے:۔

"تعجب ہے کہ معاصر مورخین اس واقعہ کا کوئی تذکرہ نہیں کرتے، اولاً یہ امر نہ قرین قیاس ہے اور نہ مقتضائے فطرت، دوئم اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ نورجہاں کو راہ میں پھینکدیا گیا تھا تو بھی کوئی ماں اپنے پارۂ دل سر راہ نہیں پھینکے گی اور اگر چھوڑ بھی دے گی تو کسی محفوظ مقام پر"

مہر النسا اور جہانگیر کا افسانہ عشق

اب ذرا جہانگیر اور نورجہاں کا افسانہ عشق بھی چھیڑ دیجئے، افسانہ کیا ہے متضاد واقعات کا مجموعہ، خلاف قیاس و بے بنیاد واقعات کے تحریر کرنے کی ذمہ داری یوروپین مصنفین کے سر ہے، جنہوں نے معاصر مورخین کو نظر انداز کر کے بے سروپا قصے تراشے ہیں، اور ان کو نشر کر کے مغلوں کی تاریخ کے ایک درخشاں باب کو سیاہ کرنے کی ناپاک کوشش کی ہے۔

ڈو۔ نورجہاں کی زندگی پر اپنے مختصر تبصرہ میں رقمطراز ہے۔

"جوانی میں شہزادہ (سلیم) کو اپنے تیر نگاہ سے گھائل کیا لیکن اکبر نے شہزادہ کو جلانے کے لئے ایک ایرانی نوجوان شیر افگن کے ساتھ اسکی شادی کر دی جب سلیم سریر آرائے سلطنت ہوا تو اسی نے

---

[۱] خافی خاں صفحات ۲۶۵-۲۶۴

[۲]

[۱] عبد اللطیف، تاریخ پنجاب صفحات ۱۵۳ تا ۱۵۷

[۲]

[۳] بینی پرشاد۔ تاریخ عہد جہانگیر۔ باب پنجم

تدبیریں شروع کردیں اور آخر کار قطب الدین کے ہاتھ سے
اس کی زندگی کا خاتمہ کرادیا، مگر وارہ ری مہرالنساء کی
عالی ہمت، برسوں گذر گئے مگر وہ باوجود شاہی اصرار کے
اپنے بہادر شوہر کے قاتل کے ساتھ شادی کرنے سے
انکار کرتی رہی اور چار سال تک اس کے سوگ میں
بیٹھی رہی۔ لیکن وہ مجبور تھی اور آخر کار اسکو رضامند
ہونا پڑا، شادی ہوگئی اور شاہی محل میں داخل ہونیکے
بعد وہ اپنی ذہانت و قابلیت سے تمام مملکت پر حکمرانی
کرتی رہی"۔

پہلے اس اجمال کی تفصیل کیجئے، پھر دیکھئے کہ ڈویلااس کے دوسرے معاصرین نے کسقدر غلط بیانی سے کام لیاہے، یہ مسلمہ ہے کہ مہرالنساء کی شادی سترہ سال کی عمر میں ایک ایرانی نوجوان کے ساتھ ہوگئی تھی، اس نوجوان کا نام علی قلی استجلو تھا۔

علی قلی استجلو المعروف بہ شیرافگن

علی قلی شاہ اسمعیل ثانی الصفوی ۱۵۷۶ء - ۱۵۷۷ء کا سفرچی تھا، اپنے مربی کی وفات یا قتل [۵۱] کے بعد وہ جان لے کر بھاگا، اور ایک عرصہ تک خاک نوردی و بادیہ پیمائی کرتا قندھار ہوتا ہوا ملتان پہنچا اور کسی نہ کسی طرح رسائی حاصل کرکے عبدالرحیم خان [۵۲] خاناں کی اس سپاہ میں جو ٹھٹھہ کی مہم پر روانہ ہورہی تھی شامل ہوگیا، میدان کارزار میں علی قلی نے اپنی جرأت و دلیری سے بڑے کام کئے، اور خوب خوب جوہر مردانگی دکھلائے جس سے رئیس عساکر بہت خوش ہوا، اور اس نے اپنی عرضداشتوں تک میں اس نوجوان سرفروش کی بہت تعریفیں کیں اور منصب کے لئے سفارش کی ۱۵۹۳ء میں جب مہم سر ہوگئی اور لشکر ظفریاب واپس ہوا تو شہنشاہ کا کیمپ لاہور میں تھا، اس طرح خان خاناں کی وساطت سے علی قلی کو عمائد سلطنت وارکان حکومت کے حلقہ میں تعارف و تقرب حاصل ہوگیا، جس کا پہلا ثمر اسکو یہ ملا کہ مرزا غیاث کی مہوش دختر مہرالنساء کے ساتھ اس کا عقد ہوگیا۔ ۱۵۹۹ء میں جب شہزادہ سلیم میواڑ کی مہم پر بھیجا گیا ہے تو علی قلی اس کے اسٹاف میں تھا، شمشیر سے شیر کو دو کردینے کا شجیعانہ کارنامہ چار دانگ میں اس کی شہرت کا باعث ہوگیا، اور شہزادہ نے خوش ہوکر علاوہ خلعت و انعام و اکرام کے اس کو شیرافگن کا خطاب [۵۳] دیا۔

جب سلیم نے شفیق باپ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو شیرافگن اپنے آقا و مربی کے ساتھ تھا، مگر کچھ زمانہ کے بعد انجام سوچ کر سلیم کو چھوڑ کر شاہی عساکر میں شامل ہوگیا، سلیم نے سریرآرا ہونے کے بعد شیرافگن کی خطاؤں سے چشم پوشی کرلی اور اس کو بردوان میں عہدہ و جاگیر عطا کی [۵۴]۔

معویانہ سازش میں آلودگی

بنگال اس وقت بغاوت و سازش کا گہوارہ تھا اور بردوان اس کا مرکز، شیرافگن کی معویانہ سازشوں میں آلودگی یقین کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، چنانچہ جب اگست ۱۶۰۶ء میں راجہ مان سنگھ کا تبادلہ ہوا، اور مسند صوبہ داری قطب الدین کو ملی، تو شہنشاہی فرمان پہونچا کہ شیرافگن کو فوراً دربار میں حاضر کرو، اگر سرتابی کرے تو سرزنش کرو۔ قطب الدین نے بردوان پہونچتے ہی ۳۰ مارچ ۱۶۰۷ء کو شیرافگن کو طلب کیا، غالباً اس طلبی کی غرض اس کی گرفتاری تھی، شیرافگن صرف دو خدمتگاروں کو ساتھ لے کر گورنر سے ملنے آیا، لیکن جونہی کیمپ میں پہنچا شاہی سپاہ نے اسکو محصور کرلیا، شیرافگن خطرہ کا احساس کرکے غیظ میں آگیا اور شیر کی طرح گرجا۔

"قطب الدین یہ کیا بزدلی ہے"؟

قطب الدین جواب دینے آگے بڑھا ہی تھا کہ شیرافگن نے اپنی شمشیر آبدار کو نیام سے کھینچ لیا، اور ایسا جچا ہوا وار کیا کہ قطب الدین کی آنتیں نکل پڑیں۔ مجروح جاں بلب مگر بہادر گورنر نے آنتوں کو دونوں

---

[۵۱] شاہ اسمعیل ثانی کی وفات کا واقعہ پُراسرار ہے، کہتے ہیں کہ وہ مقتول ہوا۔
[۵۲] اکبر کا کوکا۔
[۵۳] جہانگیر مصنفہ ڈاکٹر بینی پرشاد
[۵۴] اقبالنامہ

ہاتھوں سے پیٹ کئے اندر کیا اور فوج کو للکار کر کہا۔
"کیا دیکھتے ہو اس نمک حرام کا کام تمام کرو"
سپاہی حکم کے منتظر نہ تھے بلکہ ان میں سے ایک کشمیری نوجوان جس کا نام انبا خاں تھا شیر افگن کے سر پر کاری ضرب لگا چکا تھا۔ حالانکہ شیر افگن نے بھی اس کا جواب ایک قاتل ضرب میں دیدیا تھا یہ خونی منظر بہت [illegible] قائم نہ تھا کیونکہ دوسرے لمحہ میں شاہی سپاہ ایک تن تنہا پر ٹوٹ پڑی تھی اور تلواروں سے اس کے جسم کا قیمہ کر رہی تھی، آناً فاناً میں علی قلی کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی مگر اس کو اپنے خون کا بدلہ فوراً مل گیا، انبا خاں اسی ضرب میں ٹھنڈا ہو گیا۔ قطب الدین بارہ گھنٹہ میں سسک کر مرا[1]

شیر افگن کی لاش بردوان میں سپرد خاک کر دی گئی، مزار ہنوز حوادث سے محفوظ ہے[2] جہانگیر کو اگر ایک طرف قطب الدین کی موت کا رنج ہوا اور ایسا رنج کہ اس کو الفاظ نہیں ملتے جس سے اپنے حزن و ملال کا اظہار کر سکے تو دوسری طرف علی قلی کی موت پر ضرور افسوس ہوا، نہ صرف اسوجہ سے کہ وہ بہادر تھا بلکہ اسوجہ سے بھی کہ شیر افگن نے اس کی ابتدائی عہد میں بڑی بڑی سرفروشیاں کی تھیں، حالانکہ اسوقت وہ سلطنت کا باغی تھا اور اگر زندہ گرفتار بھی ہو جاتا تو بھی شاید اس کی سزا موت ہی ہوتی۔

مہر النساء محلات شاہی میں

شیر افگن کی بیوہ مہر النساء اور اسکی دختر لاڈلی بیگم فوراً محل شاہی میں بھیجدیئے گئے اسوقت اعتماد الدولہ کا بڑا عروج تھا، جہانگیر نے ایک باغی اور اپنے بھائی اور رفیق کے قاتل کے پسماندگان کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی بلکہ مہر النساء کو اپنی ماں یعنی سلطان سلیمہ بیگم کی "پیش خدمت" کی خدمت سپرد کی، مگر مہر النساء کسی کی کیا خدمت کرتی؟ اسکو خدا نے ہندوستان کی ملکہ پیدا کیا تھا، وہی ہوا، مارچ ۱۶۱۱ء کی بہار میں جب آگرہ کے قلعہ معلےٰ کے اندر مینا بازار ہوا تو اتفاق سے شہنشاہ کی نظر اس پر پڑ گئی تیر نشانہ پر بیٹھ گیا۔ اس روز سے بادشاہ کو قرار کہاں؟ آخر کار مئی ۱۶۱۱ء میں عقد ہو کر رہا اور مہر النساء جو ایک حقیر منصبدار کی بیوہ تھی شہنشاہ نور الدین محمد جہانگیر کی ملکہ اور ہندوستان کے تخت و تاج کی مالک بن گئی۔[3]

چند غلط بیانیوں کی تردید

یہ واقعہ کہ جہانگیر اکبر کی حیات ہی میں مہر النساء پر فریفتہ ہو گیا تھا، اور مہر النساء نے اس کی محبت کو ٹھکرا کر مرزا غیاث سے یہ خواہش ظاہر کی تھی، کہ اس کی شادی شیر افگن کے ساتھ کی جائے، نیز یہ واقعہ کہ جہانگیر نے اس کا انتقام یہ لیا تھا کہ شیر افگن کو دغا سے قتل کروا دیا مگر نور جہاں چار سال تک راضی نہ ہوئی اور پھر آخر کار عقد پر آمادہ ہو گئی سراسر بے بنیاد ہے، اور معاصر مورخین کے کسی تذکرہ یا تصنیف میں نہیں ملتا، اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر جہانگیر کا دامن شیر افگن کے خون سے آلودہ ہوتا تو وہ تزک جہانگیری میں اس کا اعتراف نہ کرتا مگر یہ بھی یقینی ہے کہ وہ اس واقعہ کا تذکرہ تک نہ کرتا لیکن بایں ہمہ وہ ضمناً شیر افگن کے قتل کا تذکرہ کرتا ہے۔

اب معتمد خاں کو لیجئے۔ معتمد خاں کی تاریخ عہد شاہجہاں میں تکمیل کو پہونچی اور کامگار حسینی کا تذکرہ خود شاہجہاں کے حکم سے مرتب ہوا، نیز یہ دونوں نور جہاں کے خون کے پیاسے تھے جو ان کی مربی یعنی شاہجہاں کی حریف تھی، پھر حیرت ہے کہ اگر ان واقعات کی کچھ بھی حقیقت تھی تو متذکرہ بالا مورخین نے اپنی تصانیف میں ان کو کیوں نہ جگہ دی — عبد الحمید لاہوری اور عہد شاہجہانی کے دوسرے مورخین سب ہی نور جہاں کا

[1] یہ واقعہ خلاصۃ التواریخ (صفحات ۴۴۶ و ۴۴۷) مفتاح التواریخ صفحہ ۲۱۴ صفحہ ۱۵۔ اقبالنامہ صفحات ۲۳ و ۲۴ صفحات ۹۴-۹۶ و جہانگیر مصنفہ بینی پرشاد صفحات ۱۱۳ تا ۱۱۵ میں موجود ہے، البتہ شیر افگن کے قاتل کے نام میں اختلاف ہے جہانگیر انبا خاں لکھتا ہے معتمد خاں بیر خاں بتلاتا ہے اور کامگار احاطہ تھا مگر یہ مسلم ہے کہ تھا وہ کشمیری۔

[2] مآثر جہانگیر قلمی نسخہ خدا بخش لائبریری بانکی پور

تذکرہ کرتے ہیں لیکن کوئی دبی زبان سے یا اشارتاً و کنایتاً بھی نہیں لکھتا کہ نورجہاں کے شوہر کا قاتل خود جہانگیر تھا۔

اس موقع پر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ درباری وقائع نگار اور مورخین میں سے کسی ایک کی اتنی جسارت نہ تھی کہ وہ کوئی ایسا واقعہ لکھتا جس سے شاہی خاندان کے کسی رکن کے دامن پر کوئی بدنما دھبہ لگتا لیکن یوروپین مورخین کو کس کا خوف تھا، انہوں نے یہاں تک دروغ بافی سے کام لیا ہے کہ جہانگیر کو نعوذ باللہ من ذالک سوتیلی ماں کے ساتھ اور نورجہاں کو شہزادہ خرم کے ساتھ (سوتیلا فرزند) متہم کرنے میں تامل نہیں کیا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ وہ نورجہاں کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے ذرا بھی شائبہ نہیں دیتے کہ اس کے پہلے شوہر کے قتل میں خود شہنشاہ جہانگیر کی آلودگی تھی، ہاکنس[1] ترکی زبان بھی جانتا تھا اور وہ دربار میں شیر افگن کے قتل کے کچھ ہی زمانہ بعد داخل ہوا تھا، اس کے بعد منصبدار ہوا اور اعیان سلطنت میں تریب ہر ایک کی خدمت میں بارہا باریاب ہوا اور غالباً نورجہاں کی شادی کے کچھ عرصہ بعد چلا گیا۔ سر ٹامس رو[2] اور ایڈورڈ ٹیری[3] دربار میں کئی سال تک حاضر باشی کرتے رہے، یہ زمانہ نورجہاں کے عروج کا تھا، تعجب ہے کہ ان میں سے کوئی بھی جہانگیر کو شیر افگن کا قاتل نہیں ٹھہراتا، بری باتیں تو مشہور ہوتے ہیں یہ کیونکر قیاس کر لیا جائے کہ ملک بھر میں اس قتل کے متعلق کسی مقام پر سرگوشی تک نہیں ہوا ہے اور اصل واقعہ آج تک پردہ خفا میں رہا، لطف یہ ہے کہ سر ٹامس اور شیر افگن کا نام تک نہیں لیتا اور ٹیری صرف اسقدر کہتا ہے کہ

"جہانگیر نے نورجہاں کو خاک سے پاک کیا"

پی ڈیلا ویلی[4] جس نے ۱۶۲۳ء اور ۱۶۲۴ء میں سواحل نہر کا سفر کیا ہے، اپنے سفرنامہ میں نورجہاں کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں کرتا ہے۔

"نورجہاں ہندوستان میں پیدا ہوئی لیکن اس کے ماں باپ ایرانی تھے جو ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے تھے اور شاہی دربار میں وہ عروج پا گئے تھے کہ آخرکار اس کا باپ صوبہ داری کے عہدہ تک پہونچ گیا تھا پہلے اس کی شادی ایک ایرانی نوجوان سے ہوئی جو شاہی سپاہ نہیں تھا لیکن اس کے انتقال کے بعد اتفاق دیکھئے کہ شہنشاہ کی نظر اس مہ جبین بیوہ پر پڑ گئی اور وہ اسپر فریفتہ ہو گیا"۔

ظاہر ہے کہ سطور بالا کسقدر خلاف واقعہ ہیں۔

اسی ڈیلا آویلی نے نورجہاں کی شادی کا ایک مفصل واقعہ لکھا ہے لیکن خدا جانے اس کا ماخذ کیا ہے؟ وہ لکھتا ہے:۔

"جہانگیر نورجہاں کو حرم میں داخل کر لیتا مگر اس مکار عورت نے بڑی چال چلی اور بادشاہ کے دل پر اپنی عالی نسبی اور پاکدامنی کا نقش بٹھایا اور کہا کہ اگر جہاں پناہ کو واقعی مجھ سے محبت ہے تو مجھ سے عقد کر لیں کیونکہ میں ایک عزت دار گھر کی لڑکی اور ایک عزت دار شخص کی بیوہ ہوں، بادشاہ غصہ سے تھرّانے لگا اور اس کو اس عورت پر اسقدر طیش تھا کہ وہ کسی حلال خور کے ساتھ اس کا عقد کر دیتا مگر اس کے دل میں نورجہاں کی محبت کا تیر پیوست ہو چکا تھا، لہذا اس نے (اپنی خودداری کا مطلق لحاظ نہیں کیا) اور نورجہاں کے ساتھ عقد کر لیا۔

جہانگیر کے دور حکومت میں ایسٹ انڈیا فیکٹرس کے بیشمار خطوط ہندوستان سے انگلستان گئے ہیں جن میں تجارتی معاملات کے علاوہ ہندوسیات کی سیاسیات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے نورجہاں اور جہانگیر کے اکثر مراسلت میں تذکرے ہیں لیکن شیر افگن کے قتل کے متعلق کوئی اشارہ تک نہیں

سر ٹامس ہربرٹ[5] عہد جہانگیری کے اواخر میں ہندوستان آیا

۱۔ Hawkins
۲۔ Sir Thomas Roe
۳۔ Jerry: Voyage to East India
۴۔ Della Valley: Travels P. P. 53
۵۔ Sir Thomas Herbert

اور پٹر مونڈی[۵۱] جہانگیر کی وفات کے چند سال بعد فرانسس[۵۲] بنیر نے ایک نسل بعد ہندوستان کی سیاحت کی ہے اور دربار میں رہ کر اپنا سفرنامہ لکھا ہے جس میں نورجہاں اور جہانگیر کی زندگی پر مفصل تبصرہ کیا ہے مگر کہیں بھی شیرافگن کے قتل کا افسانہ درج نہیں۔

کسی ایک معاصر مورخ کا نام نہیں لیا جا سکتا جس نے جہانگیر کو قتل شیرافگن میں آلودہ کیا ہو، مورخین کا سکوت ہی اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اتہام سراسر بے بنیاد ہے، لیکن اگر اس اتہام کو بحث کی غرض سے صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہم کو اثباتی شہادت پر جرح و قدح کرنا پڑے گی اور واقعات و بیانات میں اختلاف دکھلا کر اس نظریہ کا تار و پود الگ کرنا پڑے گا۔

سب سے پہلی بات جو قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ مہرالنسا اور سلیم کی شادی میں کوئی چیز مانع نہ تھی نہ اکبر ہی اس رشتہ کا مخالف ہو سکتا تھا، کیونکہ مہرالنسا ایک عالی خاندان دوشیزہ تھی اور اس کے آبا و اجداد نہ صرف دربار مغلیہ میں بلکہ دربار صفویہ میں بھی جلیل القدر عہدوں اور خدمتوں پر فائز رہ چکے تھے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ مرزا غیاث کی دختر کی نسبت علی قلی کے ساتھ محض بادشاہ کے ایماء سے قرار پائی تھی تو یہ ناممکن تھا کہ اکبر اپنے فرزند و ولیعہد سلطنت کو کبیدہ خاطر کر کے اس کے رقیب کو اس کے اسٹاف میں مقرر کرتا نیز یہ بھی خلاف قیاس ہے کہ اگر مہرالنسا کا ذرا بھی خیال شہزادہ سلیم کے دل میں ہوتا تو وہ سریر آرائے حکومت ہو کر شیرافگن کی خطاؤں کو مطلق نظرانداز نہ کرتا اور اس کو فوراً قتل کرا کر اسکو پہلو نشین اور اپنی محبوبہ کو حرم میں داخل کر لیتا، علاوہ بریں نورجہاں کے کیرکٹر سے یہ بعید ہے کہ وہ اپنے شوہر کے قاتل کی بیوی بننا خوشی سے گوارا کر لیتی، وہ اپنی جان تک شیرافگن کی عزت پر قربان کر دیتی اور جہانگیر کی آرزوؤں کو پورا نہ ہونے دیتی، مہرالنساء کی محبت جہانگیر کے ساتھ مسلم ہے لیکن اس کی ابتدا مارچ ۱۶۱۱ء کے مینا بازار سے ہوتی ہے نہ کہ عہد اکبری میں شہزادہ کا کبوتر اڑا دینے سے[۵۳]۔ اور وہاں بھی گزرنے نہیں پاتے کہ اواخر مئی ۱۶۱۱ء میں تاریخ مغلیہ کا یادگار رشتہ ظہور میں آتا ہے۔

اکثر مصنفین نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ قطب الدین محض شیرافگن کے قتل کے لئے بنگال کا صوبہ دار مقرر کیا گیا تھا، یہ بھی سراسر غلط ہے اور بے بنیاد ہے، کیونکہ واقعات بتلائیں گے کہ قطب الدین کے تقرر سے پہلے راجہ مان سنگھ سابق گورنر بنگال اور بادشاہ میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا تھا، ایسا اختلاف کہ مان سنگھ اپنے تمام اثرات و قوتیں شہزادہ خسرو کو تخت نشین کرانے میں صرف کر چکا تھا، شہزادہ کی چہیتی بیوی شاہ بیگم کی

---

۵۱ Pator Mondy

۵۲ Francis Barnier Travels

۵۳ سلیم اور مہرالنسا کی محبت کا ایک عجیب و غریب افسانہ بہت عرصہ ہوا کہ میں نے رسالہ دارالعلوم فیض آباد ۱۹۱۷ء (یہ رسالہ اب باقی نہیں) میں پڑھا تھا وہ یہ تھا۔ کہتے ہیں کہ سلیم کو کبوتروں کا بہت شوق تھا، ایک روز وہ اپنی شہزادگی کے زمانہ میں کبوتر اڑا رہا تھا اور مہرالنساء جو اس وقت ایک سادہ لوح دوشیزہ تھی اسکی خدمت میں تھی، شہزادہ نے دو کبوتر مہرالنساء کو دیئے اور کہا کہ انکو پکڑے رہو۔ اتفاق کہ ایک کبوتر لڑکی کے ہاتھ سے اڑ گیا، لیکن اس کا اثر اس کے دل پر مطلق نہ ہوا اور وہ بے پروائی سے دوسرا کبوتر ہاتھ میں لئے کھڑی رہی، اب جو شہزادہ کی نظر پڑی تو دیکھا کہ ایک کبوتر غائب تھا، پوچھا کیا ہوا؟ کہا - "اڑ گیا" پوچھا "کیونکر اڑ گیا؟" لڑکی نے دوسرا کبوتر چھوڑ کر کہا - "یوں اڑ گیا"

مہرالنساء کی سادگی کی یہ ادا سلیم کے دل پر ایک نشتر کا کام کر گئی اور اسی دن سے وہ اسیر فریفتہ ہو گیا، جب شہزادہ کی وارفتگی کی خبر سلطان سلیمہ بیگم (مادر سلیم) کے کانوں تک پہونچی تو انہوں نے ایک دن بادشاہ کے بھی گوش گذار کر دیا، بادشاہ نے غریب لڑکی کی عزت کا خیال کرتے ہوئے اس کا عقد علی قلی کے ساتھ کر دیا۔

معلوم نہیں اس افسانہ کا ماخذ کیا ہے! مجھے تو یہ دہلی یا لکھنؤ کے آخری دور کی پیداوار معلوم ہوتا ہے، لکھنؤ کو فسانہ تراشی میں ید طولےٰ حاصل تھا کچھ عجب نہیں کہ یہ بھی اسی زمانہ میں تراشا گیا ہو ——

خودکشی کا بھی ذمہ دار مان سنگھ تھا، حالانکہ اکبر کی وفات کی صبح سلیم اور مان سنگھ بغلگیر ہوگئے تھے، لیکن دونوں کے قلب صاف نہ تھے اور کدورتیں جاگزیں تھیں، یہی وجہ تھی کہ جہانگیر مان سنگھ کے ہاتھ میں بنگال جیسے غدار صوبہ کی عنانِ حکومت رکھنا قرین مصلحت نہیں سمجھتا تھا اور اس کی جگہ ایسے شخص کو مامور کرنا چاہتا تھا جو اس کا معتمد ہو۔ قطب الدین سے بہتر کوئی اور شخص اس کی نگاہ میں بنگال کی صوبہ داری کے لئے موزوں نہ تھا۔ ممکن ہے کہ شیر افگن پر معاندانہ سازشوں میں شرکت کا شبہ بے حقیقت ہو، لیکن تعجب خیز بھی نہ تھا کیونکہ جیسا سطور بالا میں اشارا کیا جاچکا ہے بنگال بغاوت کا گہوارہ تھا اور بردوان اس کا مرکز۔ عثمان کی بغاوت کو ہنوز زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ دوسرا فتنہ بیدار ہوگیا تھا، ایسے ہنگام میں انسدادی تدابیر عین تدبر تھا، یہ واقعہ جس میں چند قیمتی جانیں کام آئیں محض قطب الدین کی ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ تھا، اگر قطب الدین شیر افگن کو محصور کئے جانے کا حکم نہ دیتا تو شاید کام سہولت سے نکل آتا، اور شیر افگن بغیر نکسیر پھوٹے گرفتار کرلیا جاتا، یا آگرہ واپس جانے پر آمادہ کردیا جاتا۔

مہرالنساء کا شوہر کے قتل کے بعد آگرہ بھیجا جانا خلاف توقع نہ تھا کیونکہ دربار میں اس کا باپ اور بھائی بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے، نیز مہرالنساء کا بیوگی کے عالم میں مریم زمانی کی پیش خدمتی پر مامور ہونا بھی مناسب تھا، کیونکہ محلاتِ شاہی کے اسٹاف میں عزت دار گھروں کی عورتیں رکھی جاتی تھیں۔

اس کے بعد بادشاہ کا مہرالنساء کے تیرِ نظر سے گھائل ہوکر اس سے شادی کرلینا بھی مطلق استعجاب خیز نہیں، کیونکہ اسوقت بھی وہ باعتبار اپنے حسن و جمال کے مغل شہزادیوں میں اپنا نظیر نہ رکھتی تھی

افسانوں کی ابتدا اور انکی نشر و اشاعت

دو پشتوں تک واقعات حقائق کے حدود میں رہتے ہیں لیکن اس کے بعد ایک رومان پیدا ہونا شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا غالباً محمد صادق تبریزی سے ہوتی ہے، خافی خاں سوجن رائے و نیز دیگر مورخین اسپر جلا کرتے ہیں اور آخرکار ایک افسانہ حسن و عشق مرتب ہوجاتا ہے، سنئیے تبریزی کیا کہتا ہے۔

"مہرالنساء اور شہزادہ سلیم ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ سلیم نے انفراط محبت سے دیوانہ وار دوڑکر گلے لگا لیا۔ مہرالنساء کو بہت ناگوار گزرا اور اس نے مریم الزمانی سے شہزادہ کی شکایت کردی جو شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے کانوں تک بھی پہونچی، شہنشاہ کو فرزند کی اس ناشائستہ حرکت پر بہت غیظ آیا اور اس نے مہرالنساء کی شادی علی قلی سے کردی، اس کے بعد سلیم نے قطب الدین سے اپنا راز بیان کیا اور اس کی مدد چاہی مگر علی قلی کو اس کی اطلاع ہوگئی اور وہ اپنی جاگیر کو روانہ ہوگیا، جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے محبت کی دبی ہوئی چنگاری کو پھر مشتعل کیا اور قطب الدین کو شیر افگن کے قتل پر مامور کیا، چنانچہ جب قطب الدین بردوان پہونچا اور اس نے شیر افگن کو طلب کیا تو گھر سے رخصت ہوتے وقت اس کی ماں نے بیٹے سے وصیت کی تھی کہ بیٹا دشمن کو مارکر مرنا، اس خونی معرکہ کے بعد شیر افگن زخموں سے چور چور گھر پہونچا اور مہرالنساء کو اسوجہ سے قتل کرنا چاہا کہ اس کی محبوبہ اس کے مرنے کے بعد حریف کی ہوسناکیوں کا آلہ نہ بن سکے، لیکن مہرالنساء کی ماں نے اسکو گھر میں آنے نہ دیا اور کہا کہ مہرالنسا نے پہلے ہی خودکشی کرلی، تم اپنے زخموں کی مرہم پٹی باہر ہی کرو، شیر افگن نے جب یہ سنا کہ اس کی پہلو نشین نے پیمانِ وفا کو پورا کردیا تو اسکی روح نہایت سکون و اطمینان سے پرواز کرگئی[1]..."

[1] خلاصۃ التواریخ مطبوعہ دہلی صفحات ۴۴۵ تا ۴۴۷۔

یہ افسانہ رفتہ رفتہ شہرت پاگیا، لیکن اس کا وجود سترھویں صدی عیسوی کے نصف اولین کے کسی تذکرہ میں نہیں پایا جاتا ہنوز سترھویں صدی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ہر تاریخ اور ہر تذکرہ میں اسکو جگہ مل گئی، راجپوت بھاٹوں[۱] نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور اس کو رنگین کرکے مہر تصدیق ثبت[۲] کردی، اطالوی وقائع نگار منوچی[۳] نے جس نے سترھویں صدی عیسوی کے اواخر میں اپنا تذکرہ لکھا ہے، اس افسانہ کو مفصل تحریر کیا ہے، اٹھارھویں صدی عیسوی میں اسپر اور حاشئے چڑھے، یہانتک کہ حقیقت ہزاروں پردوں میں مستور ہوگئی۔ ڈو آئی[۴] صدی کا مصنف ہے، انیسویں صدی میں الفنسٹن[۵] نے خافی خان پر اعتبار کرکے یہ افسانہ نقل کیا ہے، اس کے بعد پھر کوئی تصنیف ایسی نہیں جس میں اس کی جگہ نہ ہو۔

محاکمہ لیکن اگر معاصر مورخین کے تذکروں پر تحقیقی نظر ڈالی جائے تو جہانگیر و نور جہاں کے کردار آئینہ ہوجاتے ہیں اور ہم اس نتیجہ پر پہونچکر رہیں گے کہ شیر افگن کے قتل میں جہانگیر کے ہاتھ ہرگز رنگین نہیں ہوئے اور نور جہاں اور جہانگیر کی محبت ہمیشہ سے بے داغ تھی ::

غزل

(از جناب روشن دین صاحب تنویر)

پھر کوئی ایسا مرے واسطے جام اے ساقی — لڑکھڑاتا ہے جسے پی کے حرام اے ساقی

چودہ سو سال ہوئے ہم نے یہ خم چھوڑ دیا — اب نہ لے بادۂ شیراز کا نام اے ساقی

تیرے میخوار کی اک لغزش مستانہ سے — ٹوٹ سکتا ہے ستاروں کا نظام اے ساقی

ماہ ہنگامۂ شب مہر ہے ہنگامۂ روز — تیرا ہنگامۂ قلقل ہے مدام اے ساقی

تو اسے فصل خزاں کہتا ہے یا فصل بہار — باغ میں ہو نہ سکا گل کا قیام اے ساقی

بے سبب تو نہیں یہ چرخ کہن کا آشوب — ہے تری آنکھ کا وہ بھی تو غلام اے ساقی

رات بھر کے ہیں تری بزم کے ہنگامے بھی — میرے دل میں ہے مۓ عیش دوام اے ساقی

پیچ در پیچ ہے افسانۂ اندوہ حیات — کوئی سلجھا نہیں سکتا یہ تمام اے ساقی

اس تنگ و تار زمیں اک میرا حرم ہے ساکن
ورنہ بتخانے ہیں سب محو خرام اے ساقی

---

۱ Blockman Bards ۲ The Rajput Khayat Khalodi quotes by L. P. Tessitori Pages No 496, 497, 524, 525 in The Bardic and Historical Survey of Rajputana J.R.A.S.B. Vol XV 1919 no 1. PP 56-58 ۳ manucci Pages No. 161, 162 ۴ Dow ۵ Elphinstone

مزاحیہ:-

آئینی کارروائی

(حاجی لق لق کے قلم سے)

ریل میں ٹکٹ کے بغیر سفر کرنا اخلاقاً بھی جرم ہے اور قانوناً بھی لیکن پیسہ پاس نہ ہو اور سفر ضرور کرنا پڑے تو کیا کیا جائے؟ بعض لاری والے تو بڑے نیکدل واقع ہوئے ہیں۔ کہ انہوں نے لاری کے باہر لکھ رکھا ہے۔ "ناداروں کے لئے مفت" لیکن ریل والوں کے دل میں رحم پیدا نہیں ہوتا، اور وہ ایسا نہیں کرتے، کہ کم از کم ادیبوں اور شاعروں کے لئے تو سفر مفت ہو جائے، کیونکہ خوشحالی سے ان لوگوں کا ہمیشہ لٹھم لٹھا رہتا ہے، اور وہ مستحق ہیں کہ ان کے تمام کام کسی خیراتی فنڈ سے چلتے رہیں۔

ہم نہ کوئی بڑے ادیب ہیں نہ شاعر، لیکن چونکہ کبھی ہمارا شمار بھی اسی گئے گذرے طبقے میں ہوتا ہے اور اگر افلاس و تنگدستی شاعر یا ادیب ہونے کی سند ہے تو یوں سمجھئے کہ ہم اس شعبہ کے "ولایت پاس" ہیں؛

ہماری اسی اعلےٰ ڈگری کا احسان تھا، کہ جب ہم تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے تھے، تو ہماری جیب میں نہ ٹکٹ تھا نہ سگرٹ اور وہ تو خدا ذبلدار بنائے ہمارے دیہاتی ہم سفر کو کہ جن کے پاس چمڑے کا حقہ اور سستی کے بلغ کا تمباکو تھا ورنہ ہمارا سفر اس طرح کٹتا کہ گویا ہم کسی عبادت گاہ میں بیٹھے ہیں؛

ہمارا دیہاتی رفیق بڑا باتونی تھا، پہلے تو وہ اپنی فصلوں کی تباہی اور پٹواری کے مظالم بیان کرتا رہا، پھر دفعتاً بولا "آپ کیا کام کرتے ہیں؟ اب ہم نہ پٹواری نہ ضلعدار نہ انسپکٹر آبکاری نہ چوکیدار، ہم نے گھبراہٹ میں کہدیا کہ ہم شاعر ہیں، دیہاتی نے فوراً سوال کر دیا، کہ شاعر کیا ہوتا ہے؟ ہم نے کہا کہ جو شعر کہتا ہے یعنی بیت دیہاتی کی باچھیں کھل گئیں اور اس نے ذرا آگے بڑھ کر کہا" آپ سائری ہیں سائری، پھر تو مزا ہی آگیا، ذرا ہیر وارث شاہ تو سنایئے؟" ہم نے عرض کیا کہ ہمیں ہیر یاد نہیں، چودھری بولا، "نہ سہی، مرزا صاحباں ہی کے دو بول سنا دیجئے" ہم نے حقے کا کش بھرتے ہوئے جوابدیا،

"دیکھو چودھری جی ہم اردو میں شعر کہتے ہیں"۔ چودھری سوچ میں پڑ گیا اور ایک لمحہ کے بعد بولا۔

"گاڑی میں کہنے کا کیا حرج ہے؟"

ہم نے ابھی اس کا کچھ جواب نہ دیا تھا کہ سامنے کی کھڑکی سے ایک ٹی ٹی صاحب ڈبے میں گھستے نظر آئے اور ان کے دیکھتے ہی ہمارا رنگ فق ہو گیا، ٹی ٹی نے ایک سرے سے ٹکٹوں کا معائنہ شروع کر دیا اور ہم فوراً حقہ چھوڑ کر اپنی نشست پر دو زانو بیٹھ گئے اور نیت باندھ کر ہم نے چار رکعت نماز وقت نماز عصر شروع کر دی۔

ٹی ٹی ٹکٹیں دیکھتا ہوا ہمارے پاس سے گزر گیا اور ہمیں اسوقت خیال آیا کہ ہمارا منہ قبلہ رو ہونے کی بجائے مشرق کی طرف ہے، ہم نماز پڑھتے گئے اور اتنی آہستگی کے ساتھ کہ گویا ایک ایک لفظ کے مزے لے رہے ہیں، چار رکعتیں ختم ہو گئیں اور ہم نے جب دائیں

طرف سلام پھیر کر بائیں کندھے والے فرشتے کو "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا، تو دیکھا کہ ٹی ٹی سامنے کھڑا ہے، اس نے دیکھا کہ ہم سلام پھیر چکے ہیں، تو ہماری طرف بڑھا، ہم تاڑ گئے کہ وہ سب مسافروں کی ٹکٹیں دیکھ چکا ہے اور صرف ہمارا ہی منتظر ہے، ہم نے فوراً کانوں تک ہاتھ لے جا کر اللہ اکبر کہا۔ اور "چار رکعت نماز وقت فالتو" شروع کر دی ابھی دو رکعتیں ختم ہوئی تھیں کہ ایک اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری اور ایک دو لمحے کے بعد پھر چل دی، ہم مطمئن ہو گئے، کہ ٹی ٹی یہاں اتر کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا ہوگا، لیکن جب ہم نے سلام پھیرا، تو دیکھا کہ ٹی ٹی اب بالکل ہمارے پاس کھڑا ہے، ہماری نماز ختم ہوتے ہی اس نے کہا۔ "مولوی صاحب ٹکٹ" یہ سنکر ہم نے پھر نماز شروع کر دی، لیکن ٹی ٹی بھانپ گیا کہ مولوی صاحب بے ٹکٹ ہیں، اس لئے اس نے ہماری کنپٹی کو ہاتھ لگا کر کہا "ٹکٹ دکھا کر باقی نماز پڑھ لیجئے گا۔"

بس ہمارے لئے اتنی بات کافی تھی، ہم نے فوراً ہاتھ چھوڑ کر شور مچا دیا کہ اس بابو نے ہمارے مذہبی فرض کی ادائیگی میں مداخلت کی ڈبے کے اور مسلمان بھی یہ سنکر بھڑک اٹھے اور مسافروں میں جوش سا پھیل گیا، اتنے میں گاڑی ایک بڑے اسٹیشن پر ٹھہری، جہاں پلیٹ فارم پر دو تین سو مسلمان کسی لیڈر کو وداع کرنے کے لئے آئے ہوئے تھے، ہم انہیں دیکھ کر ڈبے سے باہر نکلے اور بابو بھی ٹکٹ کا مطالبہ کرتا ہوا ہمارے ساتھ آیا، وہ ہم سے ٹکٹ طلب کرتا تھا اور ہم اپنی رٹ لگائے جاتے تھے، کہ کافر نے ہماری نماز میں خلل ڈالا، ہمارے ہمسفر بھی پورے جوش کے ساتھ ہماری تائید کر رہے تھے، اس پر پلیٹ فارم کے مسلمان بھی بھڑک اٹھے اور ہندو ٹکٹ کلکٹر کو اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گھس کر اپنی جان بچانی پڑی، لیکن مسلمانوں میں اب کافی جوش پھیل چکا تھا اور ہمارے واویلا آگ پر تیل کا کام کر رہی تھی مسلمان شور مچا رہے تھے، کہ بابو کو باہر نکالو، ہم اس کو جان سے مار دیں گے، لیکن پولیس نے اسے کسی دوسرے دروازے سے باہر نکال دیا تھا، مسلمان ہماری قیادت میں اسٹیشن کے باہر میدان میں پہنچے اور وہاں ایک جلسہ شروع ہو گیا، جس میں کئی اصحاب نے تقریریں کیں اور اسٹیشن ماسٹر کے خلاف قرار داد میں منظور کر کے مطالبہ کیا گیا کہ وہ ٹی ٹی کو مسلمانوں کے حوالے کرے، ہم نے بھی ایک تقریر کی جس میں کہا۔ کہ ہم اپنے مذہبی شعائر کی بے حرمتی پر موت کو ترجیح دیں گے، ہمارے ایک ایک جملے پر نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوتے تھے اور "زندہ باد" کی صداؤں سے آسمان گونج اٹھتا تھا۔

ابھی جلسہ ہو ہی رہا تھا کہ سامنے سے پولیس کے قریباً پچاس مسلم جوان آتے ہوئے نظر آئے، انہوں نے جلسہ سے تو کچھ تعرض نہ کیا، لیکن اسٹیشن کو چاروں طرف سے گھیر لیا، اس کے بعد ایک صاحب پولیس کے انسپکٹر کے ہمراہ جلسہ گاہ میں آئے اور معلوم ہوا کہ وہ ڈپٹی مجسٹریٹ ہیں آپ نے ایک مختصر سی تقریر کر کے مسلمان کو صبر و حوصلہ کی تلقین کی اور کہا کہ اگر آپ کے مذہب کی توہین کی گئی ہے تو آپ آئینی کارروائی کیجئے، ملزم کو قانون سزا دے گا، یہ کہکر آپ نے اہل جلسہ سے منتشر ہو جانے کی درخواست کی، جو قبول کر لی گئی۔

مسلمان منتشر ہو گئے اور ہمیں ایک صاحب تانگے میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے، جہاں آدھی رات تک گرمجوش مسلمان آتے رہے۔ اور مناسب کارروائی کرنے پر بحث ہوتی رہی۔

اگلی صبح ہمیں جو شرارت سوجھی تو ہم اپنے میزبان کا حجامت بنانے کا چھوٹا آئینہ لے کر سٹی مجسٹریٹ کے عدالتی کمرہ کے سامنے جا بیٹھے اور جب مجسٹریٹ صاحب نے آ کر عدالت شروع کی تو ہم نے آئینہ کو سورج کے سامنے ایسے زاویہ پر رکھ کر ہلانا شروع کر دیا کہ سورج کی شعاعیں مجسٹریٹ کے چہرے پر عکس انداز ہوں، جب ہم نے آئینے کو دو چار بار حرکت دی۔ اور ہر بار صاحب موصوف کی آنکھیں چندھیا گئیں تو اس نے شور مچا دیا، چپراسی، چپراسی، دیکھو یہ باہر کون شرارت کر رہا ہے، چپراسی باہر آیا اور ہمیں دیکھ کر پولیس کو پکارنے لگا، پولیس کے ایک سپاہی نے آ کر ہمیں بازو سے پکڑ لیا اور کمرے میں لے جا کر سٹی مجسٹریٹ کے پیش کر دیا، مجسٹریٹ نے پوچھا۔ "تم یہ کیا کر رہے تھے؟" ہم نے کہا۔ "آئینی کارروائی" پھر پوچھا۔ "اس سے تمہارا مطلب؟"

ہم نے آئینہ اس کے سامنے رکھ کر کہا۔ "یہ آئینے کی گھروالی یعنی

آئینی ہے، ہم جب فوج میں تھے، تو میدانِ جنگ میں اسی قسم کی آئینی کے اشاروں سے گفت و شنید کیا کرتے تھے، کل آپ نے مسلمانوں سے کہا تھا، کہ آئینی کارروائی کرو، اس لئے یہ آپ کے حکم کی تعمیل ہے، ہم اس شیشے کے ذریعے جو اشارہ آپ تک پہنچا رہے تھے وہ رومن کے حروف تھے، بی، اے، بی، یو یعنی بابو ہم ریل کے بابو کے متعلق انصاف چاہتے ہیں"۔

مجسٹریٹ نے یہ سنکر نہایت سنجیدگی سے کہا "تمہیں توہین عدالت کے جرم میں صرف تنبیہہ کی سزا دی جاتی ہے، اگر پھر کبھی ایسی کوئی حرکت کی تو سخت سزا دی جائے گی۔

ہم یہ سزا کا حکم سنکر عدالت سے نکلے ہی تھے، کہ مسلمانوں کا جم غفیر عدالت کے باہر موجود پایا، خدا جانے انہیں ہمارے عدالت میں پیش کئے جانے کا علم کس طرح ہو گیا کہ وہ پھولوں کے ہار لے کر ہمیں جیل پہنچانے کے لئے آ گئے، ہم نے انہیں حقیقت حال سنائی اور وہ ہمیں جلوس کی شکل میں شہر کی طرف لے چلے۔

جلوس جامع مسجد میں پہنچا اور وہاں دھواں دھار تقریریں ہوئیں، جن میں اس بات پر زور دیا گیا کہ اسٹیشن کے سامنے ستیہ گرہ کی جائے، لیکن اسی شام کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی طرف سے منادی کرا دی گئی کہ ریلوے اسٹیشن سے ہر طرف پانچ پانچ سو گز کے فاصلے کے اندر کسی ہجوم کا داخلہ تا حکم ثانی ممنوع ہے

اس منادی کا اثر یہ ہوا کہ رات کو مسجد میں پھر ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں یہ قرار پایا کہ کل صبح سول نافرمانی کی جائے، اور پہلے جتھے کی قیادت کے لئے تبرکاً ہماری ذاتِ گرامی تجویز ہوئی۔

رات جب ہم سوچنے بیٹھے کہ پہلے جتھے کے قائد کا حشر کیا ہوگا، تو جیل کی کوٹھری، قید خانے کی سلاخیں، لاٹھی چارج فائرنگ، بندوق، مشین گن یہ تمام چیزیں ہمارے تصور میں پھرنے لگیں، اور ہم بے چین ہو گئے، سونا چاہتے تھے لیکن نیند نہ آتی تھی، آخر آدھی رات کے قریب اٹھے اور چپکے سے بھاگ نکلے، ہم پیسے کے بغیر کس طرح اپنے شہر پہنچے؟ یہ ایک جداگانہ داستان ہے، لیکن اس کے بعد ہم نے اپنے محسنوں کے شہر میں قدم نہیں رکھا۔ اور اس مضمون کے پڑھنے سے پہلے انہیں پتہ لگ سکا ہوگا، کہ ان کا "مفرور رہبر" کون تھا۔ کیونکہ ہم نے وہاں اپنا نام فرضی بتایا تھا:

....

تم کو معلوم نہیں؟

(از جناب سعادت علی صاحب)

رات کو چرخ پہ دیکھا ہے ستاروں کا سماں؟
ان میں دیکھی ہے تڑپ؟
یہ مرے قلب کی دھڑکن ہے، مرا سوزِ نہاں
اُن کی دنیا میں چھپا!
تم کو معلوم نہیں!

تم نے دیکھی ہے کبھی ساغرِ رنگیں میں شراب؟
اس میں دیکھی ہے جھلک؟
یا گلستاں میں کبھی دیکھا ہے رنگین گلاب؟
خون ہے دل کا مرے!
تم کو معلوم نہیں!

مضطرب موجوں کا دریا میں وہ پُرجوش خرام
تم نے دیکھا ہے کبھی؟
لبِ ساحل سے ہر اک موج کا وہ رقصِ دوام
مرے جذبات ہیں وہ!
تم کو معلوم نہیں!

تم نے دیکھا ہے ہواؤں کا کبھی رقص و سرود؟
ان کی آواز سنی؟
میرے جذبات سے معمور ہے بس ان کا وجود
ان کا ہنگامہ تمام!
تم کو معلوم نہیں!

دیکھتے ہو کبھی آئینے میں آنکھوں کا خمار؟
ایک پوشیدہ سرور؟
ان میں مضمر ہے مری بس مری الفت کی بہار
میری الفت کا ظہور!
تم کو معلوم نہیں!

(مسلسل)

شاہراہِ کامیابی

از جناب ریاض حسین صاحب بی اے ہیڈ ماسٹر ہائی سکول لائل پور

زندگی کا راستہ پہاڑ کی چڑھائی کی طرح کٹھن ہے، اس کی بلند چوٹی ہمیں دور سے اپنی طرف بلا رہی ہے، مگر وہاں تک پہنچنے کیلئے کوئی سیدھی سی آسان شاہراہ نہیں ہے، ہم وہاں پہنچنا چاہیں تو پہنچ سکتے ہیں، صرف صبر و استقلال کے ساتھ، حزن پسینہ ایک کرکے تکان سے چور چور ہوکر، مگر با اینہمہ خوش و خرم!

لاکھوں انسان ان بلندیوں پر نظر ڈالتے ہیں، ان پر چڑھنے کی زحمت کا اندازہ لگاتے ہیں، اور پھر چونکہ وہ اس زحمت کو برداشت کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے، ان بلندیوں پر پہنچنے کی خواہش کو ہی ترک کر دیتے ہیں۔

ہمیں رشک آتا ہے ان مقدس مردوں اور عورتوں کے گروہ پر جو فلاح و کامرانی کی نورانی بلندیوں پر پہنچنے میں کامیاب ہو چکے ہیں، ہم پورے یقین کے ساتھ عزم کرتے ہیں، کہ ہم بھی ان کے نقش قدم پر چلیں گے، ہم بھی آخران کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوں گے، ہم بھی ان کی غیر معمولی قابلیت سے متاثر فضا میں زندگی کا سانس لیں گے اور ان کی نور و فلاح کے جلال کی تنویر میں اپنے دن بسر کریں گے۔

ہاں ہم بھی بلند مرتبوں پر فائز ہوں گے، ہماری آرزوؤں کا مرکز بھی وہی آفتاب سے منور چوٹیاں ہیں، ہم بھی اعلےٰ روحوں کے طلسمی حلقہ میں شامل ہوں گے، ہم بھی تحسین خلق کی خوشگوار دھوپ تھوڑی دیر تاپیں گے اور ہم بھی اپنے ناموں کو کامیابی و کامرانی کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر کندہ کریں گے۔

یہاں کوئی وظیفے نہیں ملتے، دنیا کسی کو مفت ٹکٹ نہیں دیتی، ابدی زندگی پانے والی ہستیوں کے درمیان ہمارے لئے جگہ نکل سکتی ہے، اجرام سماوی میں ایک خاص سورج پیدا کیا جا سکتا ہے جو ہمارے عظمت و جلال کو منعکس کر سکے، مگر منزلِ کامرانی میں امتیازی جگہ پانے کے لئے کچھ خرچ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

شہرت و ناموری کی طرف جانے والا راستہ محنت و مشقت کا راستہ ہے، جب ہم پیڈروسکی جیسے پیانو کے دیوتا کی سامعہ نواز موسیقی کو سنتے ہیں، تو ہم مسحور ہو جاتے ہیں، جب اس کی طلسمی انگلیاں پردہ ہائے ساز سے نوا ہائے رنگین پیدا کرتی ہیں تو ہمارا دل دھڑکنے لگتا ہے، ہمارے جسم میں کپکپی پیدا ہو جاتی ہے، ہم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، ہم ہنستے ہیں، ہم روتے ہیں، ہم پکار اٹھتے ہیں۔ کہ اس فوق البشر ہستی کا اعجاز حاصل کرنے کے لئے ہم سب کچھ دینے کو تیار ہیں، ہم کہتے ہیں اس کی قابلیت خدا داد ہے، مگر خود پیڈروسکی سے پوچھو، تو وہ خداداد قابلیت کا ذکر تک نہیں کرتا، بلکہ یہی کہتا ہے کہ کس طرح کئی کئی گھنٹے تک تھکی ہوئی کمر، دکھتی ہوئی پیشانی اور ٹھٹھری ہوئی انگلیوں سے پیانو بجانے کی مشق کرتا رہا اور تکان سے چور چور ہو کر بھی اس اعجاز کو حاصل کرنے کی قیمت ادا کرتا رہا۔ اس کی خداداد قابلیت کا راز زیادہ تر محنت و مشقت کرنے کی طاقت میں مضمر ہے۔

محنت و مشقت ہی قابلیت پیدا کرتی ہے

ایڈیسن کے کارنامے ہمارے تخیل میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ اگرچہ ہم ابھی تک پوری طرح نہیں سمجھ سکے، کہ اس جادوگر نے ہمارے واسطے کیا کچھ کیا ہے، پھر بھی ہم اس کے احسانوں کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کی حیرت انگیز قابلیت کے ہر ساعت ممنون ہیں۔

مگر کیا ہم نے کبھی یہ بھی خیال کیا کہ وہ کیا قیمت تھی جو اسے ادا کرنی پڑی، تاکہ عظمت و جلال کی ان کٹھن بلندیوں پر پہنچ سکے جنہوں نے اس کو ابدالآباد تک نوع انسان کے محسنوں کا سرتاج بنا دیا ہے، یہ کوئی آسان اور ہموار رستہ نہ تھا بلکہ اس راہ میں بھوک، قربانی، ان تھک کوشش اور شبانہ روز محنت کے سنگہائے گراں حائل تھے، اسے کام کرنا پڑتا تھا، جب دوسرے کھیل رہے ہوتے اسے موجدانہ سرگرمی اور جوش سے مشقت کرنی پڑتی تھی، جب دوسرے خواب استراحت کے مزے لے رہے ہوتے، اسے اپنے جسم کو آٹھ کی بجائے چار گھنٹے سونے کا عادی بنانا پڑا، تاکہ باقی چار گھنٹے اپنے کام کی قربانگاہ پر صرف کر کے نوع انسانی کو فائدہ پہنچائے

الغرض کامیابی و کامرانی کی دلکش و رنگین داستان اصل میں محنت شاقہ کی غیر دلچسپ کہانی ہے، بڑے بڑے موجد بے انتہا جفاکش اور محنتی ہوئے ہیں، انہوں نے جو جو کام اپنے لئے منتخب کئے بس ان کاموں کے واسطے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، جو لوگ شہرت و ناموری کے آسمان پر آفتاب و مہتاب بن کر چمکے ہیں، ان کے سوانح حیات کا خلاصہ ایک لفظ مشقت میں لکھا جا سکتا ہے۔

اس موضوع پر لکھنا چاہیں تو ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، مگر ہم چند عہد حاضر کی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں،

لوتھر بربانک وہ ساحر جس نے فی الواقعی ریگستانوں کو ضیا بانوں میں بدل دیا مسلسل محنت و مشقت کرتا رہا، تاوقتیکہ اسے پیام اجل نہ آ پہنچا، اس کی محنت کا حال سنکر انسان دنگ رہ جاتا ہے، وہ ہزاروں پودے علیحدہ علیحدہ اگاتا تھا، انہیں سے ہر ایک کی غور و پرداخت کرتا، ایک نئی اور بہتر قسم کا پودا پیدا کرنے کی خواہش کے سبب وہ ہزاروں پودے لگاتا۔ تاکہ ان تمام میں سے بہترین پودا حاصل کر سکے اس پودے کو وہ ایک دوسرے پودے کے ساتھ پیوند کرتا۔ جو اور کئی ہزار پودوں میں سے منتخب کیا ہوتا اور سالہا سال کی لگاتار محنت کے بعد اس کی کوششیں بار آور ہوتیں اور بربانک دنیا کو ایک نئی قسم کا بہترین اور مکمل صورت کا پودا دینے کے قابل ہوتا۔

لارڈ شیل نے سر والٹر ریلے کی قابلیت کا اعتراف ان چند لفظوں میں کیا "مجھے معلوم ہے کہ وہ بے انتہا محنتی آدمی ہے"۔

کہتے ہیں کہ چارلس ڈکنز اپنی کتابوں پر اسقدر محنت کرتا تھا، کہ تھک کر چور ہو جاتا، ہم اس کی تصانیف پڑھتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں، لیکن ہم اس محنت شاقہ کا اندازہ نہیں لگاتے جو ان کے تیار کرنے میں برتی گئی۔

تھاناٹوپسز جو ولیم کلن برائنٹ کی تصنیف ہے، کے مطالعہ کرنے میں بہت تھوڑا وقت لگتا ہے، لیکن کہتے ہیں کہ مصنف نے اس کتاب کو سو مرتبہ لکھا اور پھر کہیں طابع کے حوالے کی۔

ان مثالوں سے ہمیں اس ضرب المثل کی صداقت کا پتہ لگ سکتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کامیابی کے لئے خداداد قابلیت ایک حصہ اور نو حصہ عرقریزی پر مشتمل ہوتی ہے"

مارٹن لوتھر کلیسا مشہور و معروف مصلح اپنے اندر کام کرنے کی حیرت انگیز طاقت رکھتا تھا، اس نے کلیسائے اعظم کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا، جو اس وقت روئے زمین پر سب سے زیادہ طاقتور نظام تھا، وہ امرا کے درمیان سیاسی جوڑ توڑ کرتا رہا، اس نے انجیل کا ترجمہ جرمنی کی زبان میں کیا، اس نے سیکڑوں رسالے لکھے، دینیات کی کتابیں تصنیف کیں، وعظ کہے، لیکچر دیئے، لوگوں کو تعلیم دی، ہزاروں سے ملاقاتیں کیں اور ان سے تبادلہ خیالات کیا، اس کی کامیابی کا راز بھی اسی کام کرنے کی قوت میں مضمر تھا۔

کامیابی میں تخیل کا حصہ

لیکن لاکھوں انسان غلاموں کی طرح محنت کرتے ہیں، پھر بھی وہ

کامیابی کی بلندیوں پر نہیں پہنچتے وہ گوبر کے کیڑوں کی مانند ہیں مشقت کرتے ہیں، مگر ان کی نگاہیں ہمیشہ پستی کی طرف لگی رہتی ہیں، ان کے دلوں میں اعلےٰ خیالات پیدا ہی نہیں ہوتے، ان کے پہلو میں ترقی کی آرزوئیں گدگداتی ہی نہیں، شاندار خواب ان کے گوشت پوست میں زندگی کی روح نہیں پھونکتے، وہ غیر دلکش اور تاریک مایوسی کی حالت میں محنت کئے جاتے ہیں، ان کے لئے کام ایک شاندار کارنامہ ہونے کی بجائے ایک منحوس لعنت ہے، ان کی مشقت ایک ناگزیر بدی ہے، گویا یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ روٹی کما کر اپنا پیٹ بھرتے اور کسی چھت کے نیچے اپنا سر چھپا سکتے ہیں۔

آج کا کام تو محض زینہ ہونا چاہئے جو کل کے برتر اور زیادہ مفید کام کی طرف رہنمائی کرے، آج کا کام اچھی طرح سرانجام دو، مگر اپنے آپ کو اسی میں کھو نہ دو، یہ سمجھو کہ آج کا کام اگر بخوبی ہوگیا تو یہ آنے والے زیادہ شجاعانہ کام کے لئے محض تیاری ہے۔ دوسرے لفظوں میں اپنے لئے کوئی منتہائے مقصد بنائے رکھو اور تمہارا ہر کام اس مقصد عزیز کے حصول میں تمہارا ممد و معاون ہو، اپنے کام کو بہتر طریقہ پر، زیادہ قابلیت کے ساتھ اور جلدی ختم کرنے کے طریقے تلاش کرو، قیمتی کارکن وہ ہوتا ہے، جو ان تھک ہمت کے علاوہ موجدانہ تخیل بھی رکھتا ہو، وہ ایک مختار عام ہے، جس کو ترقی دیجاتی ہے کہ شاندار کامیابی کی مملکت میں ہزاروں چیزوں پر حکمرانی کرے پس تخیل، تصور، خواب اور موجدانہ گرمیٔ عمل کو اپنے روزانہ کام میں استعمال کرو، پھر تمہاری محنت موجب مسرت ہوگی، اور ہر معمولی کام پیغام امید ہوگا۔

وحدت مقصد

عظمت و کامیابی کے راستہ کے لئے وحدت مقصد کی شرط لازمی ہے، صرف وہی شکاری بطخ کا شکار کرتا ہے جو اندھا دھند آسمان کی طرف بندوق چلانے کی بجائے صرف ایک ہی بطخ کو نشانہ بناتا ہے، عقل کی ہمہ گیری اور مقصد کی وسعت شاندار چیزیں ہیں، لیکن شاندار کامیابی حاصل کرنے والے لوگ وہی ہیں جو ایک اعلےٰ مقصد کو حاصل کرنیکی آرزو کے جوش سے معمور تھے، پولوس نے کہا۔

میں تو یہی ایک کام کرتا ہوں۔

شیکسپیر نے ڈرامے لکھے، اس نے سیاسیات میں حصہ نہیں لیا۔ وہ کاروباری لحاظ سے بھی چنداں کامیاب نہ تھا، فن موسیقی میں بھی وہ شہرہ آفاق نہیں ہوا، مگر اس نے دنیا کے بہترین ڈرامے لکھے، کیونکہ اس نے اپنی پوری توجہ اسی ایک کام پر مبذول کردی، اور اپنی ہر کوشش کو اسی ایک مقصد پر مرکوز رکھا، ہم تنگ دامانی کی تلقین نہیں کررہے، ہمیں تنگ دل اور ایک ہی لکیر کے فقیر اشخاص کے افسوسناک انجام کا بخوبی علم ہے، مگر عام دلچسپیوں، وسیع علم اور تہذیب و شائستگی کے پس منظر کے ہوتے ہوئے بھی جو آدمی بلند مدارج پر پہنچنے کا خواہاں ہے اسے اپنی تمام تر ہمت اپنے پیش نظر کام پر مرکوز کردینی چاہئے، کوئی شخص کبھی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کرسکتا، اگر وہ ایک ہی کام کو باحسن وجوہ کرنے کی زبردست آرزو سے بیقرار نہیں اور اپنے آپ کو اسی پاک اور خداداد فرض کی بجا آوری کے لئے وقف نہیں کردیتا۔ ایک شخص میرے پاس آیا اور خواہش کی کہ میں اس کے لئے کوئی روزگار تلاش کرنے میں مدد دوں، وہ کئی زبانیں بول سکتا تھا، خاصی اچھی طرح کئی قسم کے آلات موسیقی بجا سکتا تھا، سٹیج پر کئی چھوٹے چھوٹے پارٹ ادا کرچکا تھا کسی حد تک تقریر بھی کرسکتا تھا، لیکن کوئی ایک ایسی بات نہ تھی جو وہ نہایت ہی احسن طریقہ پر کرنے کے قابل ہوتا جو لوگ عظمت کی بلندیوں پر پہنچ چکے ہیں، وہ ہر فن مولا نہیں تھے، بہت سے علوم و فنون کے ساتھ کچھ کچھ واقفیت خوبی کی بات ہے، بشرطیکہ ہم کسی ایک میں پورے طور پر طاق اور ماہر ہوں۔

کوئی قابل انسان اپنے آپ کو بہت سی باتوں میں نہیں الجھاتا وہ اپنی تمام مساعی کو ایک مرکزی مقصد کے ارد گرد مجتمع کرتا ہے، باقی تمام باتیں اس کے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

لذت، آرام، ذاتی غرض اور نفع سب چیزوں کو بالائے طاق رکھدیا جاتا ہے، اُن ہزاروں دلکشیوں اور ترغیبوں کی طرف سے منہ موڑ لیا جاتا ہے، جو پیش نظر کام سے باز رکھنا چاہتی ہیں، خواہ طوفان آئیں

خواہ سکون، جہاز کو آگے ہی آگے چلایا جاتا ہے، خواہ تلاطم خیز موجیں اُٹھ رہی ہوں، خواہ کامل سکون چھا رہا ہو، خواہ جل پریاں بلا رہی ہوں، مگر وہ شخص ان سب سے بے پروا اپنے مقصد پر نظریں جمائے اپنی منزلِ مقصود یعنی کامیابی کی بندرگاہ کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے

ولیم جیمز جو ایک ممتاز ماہرِ نفسیات تھا کہتا ہے:۔

"اگر تم کسی مقصد کے لئے کافی توجہ دو، تم یقیناً وہ مقصد حاصل کر لوگے، اگر تم دل سے چاہتے ہو کہ امیر بنجاؤ، تم امیر بنجاؤ گے، اگر تمہاری خواہش ہے کہ عالم بنجاؤ، تم یقیناً عالم بنجاؤ گے، اگر تم نیک بننے کے آرزومند ہو، تم ضرور نیک بنجاؤ گے"۔ یہ سب کچھ اس امر پر موقوف ہے کہ ہم اپنے اندر ایسی زبردست خواہش پیدا کریں کہ ہماری تمام کوششیں اسی ایک خواہش کے حصول کے لئے وقف ہو جائیں نیز وہ کہتا ہے۔ "صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ تمہارے اندر اسی چیز اور صرف اسی چیز کی زبردست خواہش ہو، یہ نہ ہو کہ اس کے ساتھ سیکڑوں اور چیزیں بھی ہوں، جن کا اس چیز سے تو کوئی تعلق نہو۔ مگر ان کی بھی زبردست خواہش تمہارے دلوں میں موجزن ہو"۔

یہ راستہ ایسا ہے جس میں مشکلات بھی بے شمار ہیں، بغیر انتہائی جدوجہد کے ہم چوٹی پر کبھی نہیں پہنچ سکتے بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدائی اور انسانی ہر مخالف قوت ہمارے مقابلے پر صف بستہ ہے وہی وقت ہے، جب ہمیں لڑتے ہوئے آگے بڑھنا چاہئے، ہمارا سر خون آلودہ ہو مگر مغلوب اور خمیدہ نہ ہو،

ملٹن اندھا تھا، مگر اس نقص کو اس نے غیر فانی کامیابی کے حصول کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا، اس زبردست خامی کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ کام کرتا گیا، مشکلات پر غالب آتا گیا، اور انجام کار زندۂ جاوید ہستیوں میں جگہ حاصل کر لی۔

ڈاکٹروں نے ڈیوڈ لونگسٹن کو بہتیرا سمجھایا۔ کہ اب وہ امن و سکون کی زندگی بسر کرے، تکان اور محنت سے پرہیز کرے اور اپنی زندگی کے باقیماندہ چند سال ہنگاموں کے بغیر بسر کر دے، کیا اس قسم کی حوصلہ شکن باتوں نے اس سیاہ اعظم کی بیتاب روح کو سکون آشنا کر دیا، کیا اس نے اپنے معالجوں کا فتوےٰ سن کر اعتراف شکست کر لیا، نہیں۔ وہ پھر افریقہ کے تیرہ و تار جنگلوں میں گھس گیا، ان علاقوں کی سیاحت کی جہاں کسی سفید فام انسان کے قدم نہیں پہنچے تھے، دریائے نیل کا منبع دریافت کیا اور اس طرح افریقہ میں آمد و رفت کی راہیں کھولدیں،

اسی کی ان تھک کوششوں کا نتیجہ تھا، کہ اس کی موت کے بعد دس سال کی مدت میں اس تاریک براعظم نے اتنی ترقی کی، جو وہ اس سے پہلے بیس صدیوں میں کبھی نہ کر سکا تھا۔

ایک دفعہ جب زندگی کا مقصد بنالو، تو پھر اگر عظمت و کامرانی کی بلندیوں پر چڑھنے کی خواہش ہو، تو اس راستے سے قدم ہرگز نہ ہٹاؤ، مشکلات کے آتے ہی مقصد کو چھوڑ دینا اور ایک بات سے دوسری بات کی طرف رُخ پھیر لینا ایسا ہی ہے کہ تم اپنے پیدائشی حق کو روٹی کے ٹکڑے کے عوض بیچ دو، دقتیں اور مشکلات تو اس لئے آتی ہیں، کہ ہم کو طاقتور بنائیں، بڑے بڑے انسان زہرہ گداز مشکلات کے درمیان ہی پیدا ہوتے ہیں۔ دکھ مصیبت اور مایوسی کی بھٹی میں ہی فتحمند انسان ڈھلتے ہیں۔ بظاہر ناقابلِ تسخیر مشکلات پر فتح پا لینے سے ہی کھیل میں لطف آنے لگتا ہے، کامیابی کی مسرت حاصل ہوتی ہے اور فتحمندی میں شان پیدا ہوتی ہے، اپنی بدبختیوں کا ماتم نہ کرو، بلکہ ان کے لئے خدا تعالےٰ کے شکر گزار ہو، وہ تمہاری کامیابی کا ذریعہ اور منشور ہیں، بشرطیکہ تم بے خوف و خطر لڑتے ہوئے بڑھتے جاؤ:

(ترجمہ)

(مترجمہ۔ بی ملر)

حسیات

از خاں اصغر حسین خاں صاحب نظیر لودھیانوی

اُن سے مجھے ملا دیا چرخِ فریب کار نے
رنگِ جہاں بدل دیا گردشِ روزگار نے

تیغِ نگاہ کر گئی کوثر و انگبیں کا کام
مجھ کو دوائے ہوش دی دیدۂ میگسار نے

ملکِ خزاں مرے لئے ارضِ بہار بن گیا
لالہ و گل اُگل دیئے دشت کے خار خار نے

موجِ تپاں مرے لئے ساحلِ امن بن گئی
درسِ سکوں دیا مجھے شعلۂ بیقرار نے

شامِ الم پہ چھا گیا صبحِ نشاط کا سماں
دورِ طرب دکھا دیا دیدۂ اشکبار نے

خالقِ بے نیاز کا مجھ پہ یہ لطفِ خاص ہے
باغ لگائے برق نے پھول دیئے شرار نے

سایۂ تیغ سے ملا لطفِ حیاتِ جاوداں
مجھ پہ بڑا کرم کیا حسنِ جفا شعار نے

مے سے ملا ملالِ غم نغمے سے حسرت و الم
نورِ دروں دیا مجھے رندِ سیاہ کار نے

طالعِ بد نے پیش کی شہرتِ خسروی مجھے
گنجِ گراں بہا دیا دامنِ تار تار نے

خاک نے سیم و زر دیا آگ نے تختہ ہائے گل
صلح سے آشنا کیا عقلِ ستیزہ کار نے

مجھ کو نظیر درد نے حرزِ شفا عطا کیا
راحتِ وصل بخش دی زحمتِ انتظار نے

کلامِ فرحت

از جناب گنگا دھر ناتھ فرحت بی اے، ایل ایل بی، وکیل کانپور

محفلِ حسنِ یار میں، پھولوں کے جلوہ زار میں
لٹ گئی آبروئے دید، آج بھری بہار میں

عشق کا راز ہے نہاں، دیدۂ اشکبار میں
گوہرِ اشک بھر گئے، دامنِ حسنِ یار میں

آگ سی ہے لگی ہوئی، دامنِ قلب زار میں
کوندرہی ہیں بجلیاں، جلوۂ حسنِ یار میں

ایک نگاہِ ناز سے، چھیڑیئے پھر حیات کو
میرا سکونِ زیست ہے، آپ کے اختیار میں

رحمتِ کارساز کا، دل کو یقین ہو گیا
ذوقِ گناہ بڑھ گیا، قلبِ گناہگار میں

جام و سبو کا ڈھیر ہے، اہلِ نظر کے سامنے
شانِ شکستِ توبہ ہے، توبۂ بادہ خوار میں

واہ رے رعبِ حسنِ یار، اشک سمٹ کے رہ گئے
حالتِ دل نہ کہہ سکا، کوششِ اختصار میں

موجِ طلاطم آفریں، تہ میں لئے ہے اک سکوت
روحِ سکوں پذیر ہے، قلب کے انتشار میں

روح تری ہے دل ترا، جان تری ہے، میں ترا
کس کی بنا پہ ہو غرور، ہستیٔ مستعار میں

واہ رے آبِ ضوفگن، موج پہ موج موجزن
کھیل رہی ہیں بجلیاں دامنِ آبشار میں

فرحتِ خستہ و خراب، آہی گیا کشاں کشاں
عشق کی بارگاہ سے، بزمِ جمالِ یار میں

گاما۔

موجودہ زمانے کا سب سے زبردست پہلوان

(جیک کوفوڈ کے قلم سے)

موجودہ زمانے کا سب سے بڑا پہلوان معلوم کرنے کے لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسے شخص کو جس نے نہ کبھی شکست کا منہ دیکھا ہو، اور نہ کبھی ایسے مقابل کا سامنا کیا ہو جسنے پیٹھ نہ دکھائی ہو، پہلے ہی علیحدہ کر دیا جائے اور وہ شخص جیک ڈیمپسے یا ٹائی کوب یا جم تھورپ میں سے کوئی نہیں ہے۔

وہ ایک ہندوستانی شخص گاما ہے جو ایک کشتی باز ہے اگرچہ اس کا قد صرف ۵ فٹ ۹۔ انچ ہے لیکن وزن میں ۲۶۰ پونڈ ہے۔ اور جسم میں موٹاپے کا نام نہیں ہے اس کا تمام کا تمام جسم مضبوط اور گٹھے ہوئے اعصاب کا مجموعہ ہے، لیکن باوجود اپنے مربع ڈیل ڈول کے وہ بلی کی طرح پھرتیلا ہے، جب کسی شخص میں بن مانس کی طاقت، تیندوے کی پھرتی اور زود فہم دماغ ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اس پر فتح حاصل کرنی تقریباً ناممکن ہو جاتی ہے گاما میں یہ سب خوبیاں بدرجہ اتم ہیں، اس کے شانے پیرانہ سالی کے بوجھ سے دبے ہوئے ہیں۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ ہے اور پینتیس سال سے وہ ہندوستان یعنی اس ملک کا جہاں دنیا کے بڑے سے بڑے پہلوان تربیت پاتے ہیں مایۂ ناز پہلوان ہے۔

گاما کی عمر نے اس پر مطلق اثر نہیں کیا ہے، اس کی جلد رنگے ہوئے چمڑے جیسی ہے اور ایک بہت بڑی مونچھ اس کے بالائی ہونٹ پر انگڑائی لے رہی ہے اور اس کے دودھ سے سفید دانتوں کو نمایاں کرتی رہتی ہے، اس کے چہرہ پر کوئی جھرّی نہیں ہے اور اس سے طمانیت ٹپکتی ہے، اس کے باوجود جب کبھی مقابلہ ہوتا ہے سکون غائب ہو جاتا ہے اور اس کے چہرے پر حیوانوں کی سی تندی کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں اور اس کے دل میں جلد سے جلد فتح حاصل کرنے کا خیال شعلہ کی طرح بھڑک اُٹھتا ہے اور تین ہزار سے زیادہ مقابلوں میں کسی نے اسے نیچا نہیں دکھایا۔

جہانتک پہلوانی کی عمر کا تعلق ہے وہ بوڑھا اور بہت بوڑھا ہے لیکن اس کے باوجود وہ امریکہ کے اکھاڑوں میں پہلوانی کرنیوالے موجودہ لونڈے پھونڈے نوجوانوں میں سے کسی ایک یا سب کو نہایت آسانی سے چت لٹا سکتا ہے، وہ کچھ عرصہ پہلے بھی ایسا کر سکتا تھا کیونکہ جیک کرلے نے اضلاع متحدہ آنے پر اسے ایک لاکھ ڈالر دینے کا ذمہ لیا تھا لیکن گاما نے انکار کر دیا تھا کیونکہ وہ ہندوستان چھوڑنے کیلئے آمادہ نہ تھا، لیکن پٹیالہ میں سٹینس لاس زبسکو کے ساتھ کشتی لڑ کر اس نے ثابت کر دیا کہ اس قسم کے سفر کا نتیجہ کیا ہوتا۔

اس میں شک نہیں کہ پیپے جیسے جسم والا پولی جو فلاسفی کا ماہر اور ایک درجن زبانوں کا اُستاد تھا، دنیا کے بہترین کشتی بازوں میں سے تھا، اس میں نہ صرف طاقت تھی بلکہ گذشتہ سالوں کا تجربہ لئے ہوئے منصوبہ ساز دماغ بھی تھا، اسے گاما کا کوئی ڈر نہ تھا، اور نہ کسی اور کا تھا، دس ہزار ڈالر پیش کئے جانے پر وہ کشتی کے لئے ہندوستان گیا اور اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ وہ ثابت کر دے گا کہ مغرب کو مشرق پر فوقیت حاصل ہے۔

ہندوستان میں کشتی لڑنے کا فن دوسری جگہوں کی نسبت مختلف ہے، مقابل ایک دوسرے کو پکڑ لیتے ہیں لیکن ایک حلقہ میں نہیں بلکہ ایک اکھاڑے میں اور دونوں ننگے پاؤں ہوتے ہیں تاکہ مضبوطی سے پاؤں جما سکیں۔ یہ طریقہ زبسکو کے لئے نیا تھا لیکن اس پر بھی اس کا حوصلہ بلند تھا۔

کشتی شروع کرنے کے لئے اشارہ کر دیا گیا، گاما کود کر آگے بڑھا اور زبسکو نے اس کے قوی ہاتھوں کو اپنے جسم پر محسوس کیا، اس وقت وہ دنیا کے نہایت ہی ہیبتناک بازوؤں کی گرفت میں تھا۔ چشم زدن میں وہ اتنا کمزور ہو گیا جتنا کہ ایک بچہ وہ ہل نہ سکا، وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

پھر اس نے ایک پٹخنی کھائی اور وہ چاروں شانے چت زمین پر آ رہا اور اس میں اتنی ہی دیر لگی جتنی کہ اس میں تقریباً دس سکنڈ کے مختصر عرصے میں سب کچھ ہو گیا۔

اس نے تلملا کر بند ڈھیلے کرنے چاہے مگر دیو ہیکل بازو اس کے گرد اس مضبوطی سے لپٹے ہوئے تھے کہ وہ ایک فالج زدہ انسان کی طرح وہیں پڑا رہا، اور گاما کوئی خاص زور نہیں لگا رہا تھا، اب جبکہ کشتی ختم ہو گئی تو اس نے اپنی بھاری مونچھ کے نیچے دکھائی دینے والے دانت یونہی زبسکو پر رکھدیئے اور زبسکو جو اپنے آپ کو طاقت میں کسی سے کم نہ سمجھتا تھا ہل بھی نہ سکا۔

جب اس کامیابی کا سہرا گاما کے سر بندھا تھا تو اسوقت وہ اتنا بوڑھا تھا جتنے کہ ڈیمپسے اور ٹلڈن اب ہیں، لیکن پھر بھی ایسے شخص کو جکڑ لینے کے لئے جسے مغربی دنیا کا مانا ہوا کشتی باز سمجھا جاتا تھا، کافی مضبوط تھا۔

یہ فوقیت اسے پچیس برس سے حاصل ہے، اس نے ہندوستان کے تمام طاقتور آدمیوں کو نیچا دکھایا اور ہندوستان وہ ملک ہے جہاں کشتی کا فن ترقی کرتے کرتے ایسے منتہائے کمال کو پہنچ گیا ہے کہ جہاں اور کوئی نہیں پہنچ سکا۔ کئی سال گذرے وہ بوڈاپسٹ کے ایک اکھاڑے میں شریک ہونے کے لئے گیا، یورپ، جاپان، افغانستان، ترکی، اور ہر اس ملک کے جس کا آپ نام لیں، دیو ہیکل پہلوان وہاں جمع ہوئے

گاما نے اپنے متعلق کچھ نہ کہا اور اسے ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ جو کچھ اس نے کیا تھا سب کو معلوم تھا، کوئی اس کے مقابلے میں نہ آتا تھا، اُن کی بڑی بڑی ڈینگیں اور شہرت دینے والے شاندار کارنامے ان کے کسی کام نہ آئے، اس کی طاقت کوئی انسانی طاقت نہ تھی بلکہ کسی دیوتا یا جن کی قوت تھی، کیونکہ جب اس نے ایک مرتبہ ان پر ہاتھ ڈالا تو باری باری سب کو مقابلے کے لئے بلایا۔ کسی نے اس کا جواب نہ دیا، گاما آگے بڑھا اور کہا کہ میں اس اکھاڑے کے دس بہترین آدمیوں سے باری باری کشتی لڑنا چاہتا ہوں، اور سب کو ایک گھنٹے کے اندر اندر گرانے کا وعدہ دیتا ہوں، اس طرح آسے ہر ایک کو ۶ منٹ میں گرانا تھا، اس کا بالکل یہی مطلب تھا کہ ڈیمپسے کو باری باری، ولکرڈ، کارپنٹیر، فرپو، ٹیونے، برنین، شارکے، مسکے، گنسوٹ سمتھ میم اور سوڈن برگ سے ایک ہی اکھاڑے میں لڑے یا یہ کہ لوئی جان اپنے زمانے کے دس بہترین پیشہ ور چوگان کھیلنے والوں کے ساتھ کھیلے، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان حالات میں ڈیمپسے یا جان کو کیا موقع مل سکتا تھا۔ اسپر یہ کہ گاما کی طرف سے یہ دعوت محض اتفاقی تھی، جو نامنظور کر دی گئی، اور کوئی اس کے مقابلے کے لئے تیار نہ ہوا۔

اُسنے تین ہزار کشتیاں لڑیں ہر ایک میں فاتح رہا تین ہزار اور ان میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس میں اُس نے اپنے مقابل کو چت نہ لٹایا ہو، ان لوگوں میں جاپان کے دیو ہیکل پہلوان بھی شامل تھے جو دنیا کے سب سے بڑے کشتی باز سمجھے جاتے ہیں اور جن میں سے بعض کا وزن پانچ سے چھ سو پونڈ تک تھا اور قد تقریباً ۷ فٹ تھا۔

پس مقابل پر پورا پورا قابو رکھنے کے لحاظ سے گاما کا درجہ اول ہے مجھے اور کوئی پہلوان یاد نہیں پڑتا، جس نے بچپن یا سالخوردہ و آزمودہ کار ہونے کی صورت میں کسی سے منہ کی نہ کھائی ہو، لیکن اس ہندوستانی پہلوان نے کبھی ناکامیابی نہیں دیکھی، اس کا ایک بھائی ہے جو اس سے ۲ - انچ لمبا اور وزن میں ۳۰ پونڈ زیادہ بھاری ہے۔

مشرقی ماہرینِ فن کا بیان ہے کہ وہ گاما کے بعد دنیا کا بہترین کشتی باز ہے، ابھی تک اُس نے کبھی اپنے بڑے بھائی کو نہیں گرایا۔

ہم اسی کو تعجب خیز سمجھتے ہیں کہ کوئی کوب، ٹلڈن یا میکنمارا متواتر ۲۰ برس تک مقابلہ کی آگ میں کھیلتے رہے، لیکن یہ صورت بالکل نرالی ہے مگر ہاں ذرا ٹھہریئے اور غور کیجئے کہ اسوقت جبکہ یہ لوگ ابھی طفلِ مکتب تھے، گاما ایک درخشندہ ستارہ تھا اور ابھی تک اپنے فن میں ماہر ہے، اس کی پینتیس ۳۵ سالہ عملی زندگی کسی کھیل میں بھی اپنی تمثیل نہیں رکھتی، اور پھر اس صورت میں کہ پینتیس سال تک کامیابی کا سہرا پیشانی کو چومتا رہا ہو، قطعاً کوئی ایسی مثال نہیں مل سکتی۔

کسی کھیل میں کھلاڑی کا اندازہ لگانے کے لئے داؤ کا معیار ایک بنیادی اصول ہے، اس کی تشریح ان مثالوں سے ہو سکتی ہے کہ جان چوگان کھیلتے وقت کس کمال سے گیند کو مارتا ہے اور ٹلڈن ٹینس کی گیند کو کس زور سے پلٹتا ہے کہ سنسناتی ہوئی جاتی ہے اور کوب گیند کو لائن پر رکھنے کے لئے کس پھرتی سے ایک سکنڈ سے بھی کم عرصے میں چھلانگ لگا لیتا ہے۔

آپ کشتی کی صورت میں داؤ کا وہ لحاظ نہیں رکھتے جو اور کھیلوں میں، لیکن یہاں اس کا بھی لحاظ لازمی ہے اور گاما نے زبسکو کے ساتھ مقابلہ کر کے اس بات کو ثابت کر دیا۔

بھاری جسم والا پول محتاط اور اتنا چست تھا کہ وہ دوسرے اُستادانِ فن کی خطرناک گرفت میں نہ آ سکا تھا، لیکن ہندوستانی پہلوان کا داؤ اسقدر مکمل اور نپا تُلا تھا کہ اس سے پہلے کہ زبسکو کو یہ معلوم ہو کہ کیا ہو رہا ہے اس کے آہنی ہاتھوں نے اُسے جکڑ لیا۔

بلاشبہ گاما اپنے زمانے کا سب سے بڑا پہلوان ہے۔

(ایم عنایت اللہ بی اے۔ انبالوی)

(ترجمہ)

ملّاجی کا مکتب

(از جناب مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب)

ملاجی کو دیکھتے ہی سب نے مل کر السلام علیکم کا ایک نعرہ ضرور مارا اور انہوں نے اس کا جواب اس طرح کھینچ تان کر دیا کہ گویا کوئی بدّو نخلستان میں کھڑا ہوا اونٹوں کے بچوں کو پانی بلا رہا ہے۔

ملاجی کا کسیرو کی طرح چھلا ہوا سر، غلافی آنکھیں، آنکھوں میں دنبالہ دار سرمہ، لمبی داڑھی کچھ سرخ، کچھ سپید اور کچھ کالی خاصی قوس وقزح کا نمونہ بنی ہوئی تھی، ملاجی نے ہمیں دیکھتے ہی پہچان لیا پہلے تو مسکرائے پھر فرمایا کہ "بیٹا، شیرینی نہیں لائے؟" ہم نے کہا کہ "جی نہیں" اماں جان نے کہا ہے "کہ کل لے جانا"، ملاجی نے کہا کہ "اچھا بیٹا! پھر کل ہی پڑھائی بھی شروع کر دینا، آج ایک طرف بیٹھ کر یہاں کی پڑھائی کا طریقہ دیکھ لو"، اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، ہم نے کہا "مناسب ہے" اور کھسک کر ایک طرف بیٹھ گئے۔

اس کے بعد ملاجی نے اٹھ کر ایک محراب کا پٹ کھولا اور کچھ عملی تعلیم دینے کا سامان نکالا، اس میں ایک تو چوب دستیوں کا سیٹ تھا جو پانچ یا چھ چھوٹی چھوٹی لکڑیوں پر مشتمل تھا اور ایک تسموں کا سیٹ تھا جو سب چھوٹے بڑے ملا کر تعداد میں تقریباً چھ یا سات تھے، ان میں ایک تسمہ تقریباً دو فٹ کا تھا، دوسرا تین فٹ کا، چوتھا چار فٹ کا تھا، دوسری ایک اور چھوٹی سی شے تھی جو ڈفلی یا دف کے قبیل سے تھی، پھر دو رسیاں کچھ سنگریزے اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں تھیں جن کو ملاجی نے اپنے سامنے اس طرح چن دیا تھا جس طرح مداری تماشا کرنے سے پیشتر تمام سامان اپنے آگے جما لیا کرتا ہے۔

ملاجی کی بعض اشیا پر خیال ہوتا تھا کہ وہ شاید فیروبل کے تحائف ہیں بعض پر گمان ہوتا تھا کہ وہ ڈاکٹر مونٹسوری کے تعلیمی آلات ہیں جو حواس کی تربیت کے لئے ملاجی نے جمع کر لئے ہیں اور بقیہ یعنی ڈف، کنکر، رسی اور تسموں وغیرہ پر شبہ ہوتا تھا کہ وہ شاید الفرڈ بینے کے تیار کئے ہوئے آلات ہیں جو بچوں کی ذہنی پیمائش کرنے کے لئے فراہم کئے گئے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ سامان نہ تو محصلات کی ناپ تول کرنے کے لئے تھا اور نہ ذہنی پیمائش کے لئے بلکہ وہ تمام آلات جسمانی اصلاح کرنے کے لئے تھے یعنی اگر کوئی لڑکا نزدیک ہے اور زیادہ طاقتور ہے تو اس کے لئے چھوٹی چوب دستی استعمال کی جاتی تھی، ذرا کمزور ہے تو تسمہ سے مرمت کی جاتی تھی، ذرا دور ہے تو بڑی چوب دستی یا بڑا تسمہ اور اگر بھاگ رہا ہے تو سب سے آخری نمبر کی بڑی چوب دستی یا بڑا تسمہ استعمال کیا جاتا تھا اور جب وہ مکتب سے نکل کر صحن تک پہنچ جاتا تو ڈف بجا دیا جاتا تھا، تاکہ "الارم سگنل" کا کام دے اور تمام مکتب کے لڑکے بہ یک وقت اٹھ کر اس کے پیچھے دوڑیں اور ڈنڈا ڈولی کر کے اسے مکتب میں ادھر اٹھا لائیں، پھر تو جسمانی حواس ناپنے کے دوسرے آلات استعمال کئے جاتے تھے، یعنی زنجیر اور لکڑی کا کندا، زنجیر کا سرا ٹانگ میں باندھ کر کندا کاندھے پر دھر دیا جاتا تھا اور وہ حضرت دو چار گھنٹے تک گدھے کی طرح لدے ہوئے سیدھے کھڑے رہتے تھے، کبھی دیوار سے پیٹھ کا سہارا دے کر ذرا جھکا کر کھڑا کر دیا جاتا تھا اور وہ کرسی بنے ہوئے دو ایک گھنٹے تک اسی طرح کھڑے رہتے

تھے، کبھی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو چارپائی کے پایوں کے نیچے
دبا کر پٹی پر کسی مسنڈے کو بٹھا دیا جاتا تھا، کبھی ہاتھوں کو پاؤں میں سے
نکال کر دونوں کان پکڑوائے جاتے تھے اور لیول قائم رکھنے کے لئے
ان کی پیٹھ پر پانی سے بھرا ہوا بدھنا یا ایک تختی رکھدی جاتی تھی، اس
طرح وہ حضرت گھنٹے دو گھنٹے تک مرغ بنے ہوئے کھڑے رہتے تھے
اور کبھی رسّی سے دونوں ہاتھ باندھ کر ان کو ٹاٹ پر اس طرح کھینچدیا
جاتا تھا کہ نہ تو ان کے پاؤں زمین پر پوری طرح ٹکے رہتے تھے، نہ ادھر
رہتے تھے، غرض یہ کہ ایسے بہت سے طلسم اور ٹوٹکے موجود تھے جن سے
لڑکوں کی کھال نرم کر دی جاتی تھی، اور ٹیڑھا راستہ چلنے والوں کو
جنتر میں کھینچ کر تکلے کی طرح سیدھا کر دیا جاتا تھا، بظاہر ملاجی نہایت
بردبار، سلیم الطبع اور رحمدل واقع ہوئے تھے اس لئے ہم نے دیکھا
کہ تعلیمی آلات جانے کے دوران میں ہمارے ملاجی کے لڑکے گھر میں سے
نکل کر مکتب میں نازل ہوگئے، یہ لونڈے تعداد میں شاید بارہ تھے جو
چار نفر فی استانی ماں کے حساب سے اس دنیا میں تشریف لائے تھے
وہ ملاجی پر گدھ کی طرح گرے، کسی نے ان کی مونچھوں کے بالوں کا
جائزہ لے لیا، کسی نے داڑھی کو مٹھیوں میں بھر بھر کر ناپنا شروع کر دیا
کوئی پیٹھ پر جونک کی طرح چمٹ گیا، کسی نے ان کی کھوپڑی کا رقبہ نکالنا
شروع کر دیا، کوئی پیٹ سے بندر کی طرح لپٹ گیا اور کوئی ان کی گود
میں قلابازیاں کھانے لگا، ملاجی کی یہ محبت اپنی اس لمیٹڈ کمپنی اینڈ
سنز تک ہی محدود تھی مگر جو بچے کہ پڑھنے آتے تھے ان کے متعلق بجز چند موقعوں کے
ملاجی اس اصول پر عمل کرتے تھے کہ "جور استاد بہ ز مہر پدر" وہ چند موقعے
عید، بقرعید، محرم اور شب برات کے تھے کہ ملاجی لڑکوں سے میٹھی میٹھی
باتیں کیا کرتے تھے، کسی سے کہتے تھے، کہ "دیکھو بیٹا! ہم نے مفلس، نادار
یتیموں اور اسیروں کے لئے بیت المال کھولا ہے، بکرا ذبح ہوتے ہی
کھال خود لا کر یہاں پہنچا دینا" کسی سے کہتے تھے کہ "بیٹا! ذرا حلوا زیادہ
لانا، ہمارے گھر میں رات کو مردے کثرت سے آئیں گے" غرض یہ کہ
اسی طرح مختلف موسموں پر مختلف موسمی فرمائشیں اور میٹھی میٹھی باتیں کرتے
اور جہاں شب برات وغیرہ ختم ہوئی اور ملاجی ترش رو اور کڑوے ہو جاتے
تھے، ہاں تو ملاجی نے وہ تمام جسم کے رقبہ ناپنے کے آلات سامنے چن دیئے
اور اپنا حلق ذرا صاف کر کے بلند آواز میں بسم اللہ پڑھی، پھر کیا تھا،
مکتب کے لونڈوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر بے تحاشا چلانا شروع کر دیا،
ہم نے دیکھا کہ ایک لڑکا بغدادی قاعدہ لئے ہوئے سامنے آیا، قاعدہ تو
چھوٹا سا تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ اسے پڑھاتے وقت چھٹی کا دودھ یاد
آجاتا ہے، اس قاعدہ کے مصنف نے اس میں دنیا بھر کے طریقے بھر دیئے
ہیں، یعنی طریق الصوت بھی ہے، طریق تہجی بھی ہے، طریقہ راست بھی
ہے، طریقہ بالواسطہ بھی ہے، طریقہ رسکنائی بھی ہے اور طریقہ تراکزی بھی ہے
صرف شرط یہ ہے کہ پڑھانے والا استاد اور تجربہ کار ہو تو یقین کامل ہے
کہ بچہ ایک مہینے کے اندر باہر ہی معلم الملکوت کے بھی کان کترنے لگتا ہے۔

ہم نے دیکھا کہ اس میں کل لے دے کے ۲۸ حروف اور شاید
دس بارہ تختیاں ہیں مگر ان کا تلفظ کرتے وقت کبھی تو ملاجی کا سینہ پھول کر
لقا کبوتر کی طرح دہرا ہو جاتا تھا، کبھی جوش میں آکر وہ اپنا پوٹا زمین پر
ٹیک دیتے تھے، کبھی آنکھیں بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو جاتی تھیں،
کبھی گلے کی رگیں پھول کر الگ حرکت کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں،
اور کبھی وہ ناک ہی ناک میں غُنغنا کر حرف اس طرح ادا کرتے تھے کہ گویا
کوئی استاد ستار کے تار پر سے پر کھینچ کر مینڈ کاری کر رہا ہے، کبھی کہتے تھے
کہ دیکھو یہ حروف صفیرہ ہیں چڑیا کی طرح آواز نکالو، کبھی کہتے تھے کہ یہ
حروف حلقی ہیں، حلق سے ادا کرو، مگر لڑکوں کی سمجھ میں خاک بھی نہ آتا تھا
وہ لڑکے صرف "دیکھو لو لو" کے اصول پر ان کا منہ تکتے تھے اور اسی طرح
منہ بنا بنا کر چڑاتے رہتے تھے، اس پر ہمارے ملاجی کبھی ڈانٹ ڈپٹ کرتے
کبھی چوب دستی چلاتے اور کبھی تسمہ کو استعمال فرماتے رہتے تھے، ملاجی کے
نعروں اور بچوں کی آوازوں سے ہمارے کانوں کے پردے پھٹے گئے
تسموں اور چوب دستی کی چیرہ دستیوں سے جی دہلنے لگا اور ہم پریشان
تھے کہ کب چھٹی ملے اور کب ہم اپنے گھر چل دیں، مگر ملاجی ہم سے بھی
زیادہ کائیاں تھے، وہ آج کل کے جدید استادوں کی طرح نہ تھے کہ لڑکے
درجہ میں بیٹھے ہوئے دوسرے کاموں میں مشغول رہیں اور ماسٹر صاحب کو
خبر تک نہ ہو، ہمارے ملاجی کی توجہ لفظوں کے مخرج کی طرف بھی رہتی تھی،

تلفظ کرتے وقت آنکھیں بند بھی رہتی تھیں مگر نظریں کو یوں کے سوراخوں میں سے نکل کر دنبالہ دار سرمہ کے خطوط سے گذرتی ہوئی بچوں کے دلوں کا بھید لیتی رہتی تھیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ زبان چلنے سے اول ہاتھ اور ہاتھ چلنے سے پیشتر آنیں نمبر کا تسمہ یا نچی چلنا شروع کر دیتی تھی، جس نمبر کا لڑکا جس سزا کا مستحق ہوتا۔

خدا خدا کر کے ظہر کا وقت آیا اور ملاجی نے نماز شروع کر دی ہم بھی پر تول رہے تھے اور بڑی دیر سے منہ میں گھنگنیاں بھرے ہوئے بیٹھے تھے، موقع پایا تو ذرا اٹھ کر ایک لڑکے سے اس ڈف کی حقیقت پوچھنے لگے، ہم نے دیکھا کہ ملاجی رکوع میں گئے اور دونوں ٹانگوں کے بیچ میں سے سر نکال کر ہم کو باتوں میں مصروف دیکھا تو وہیں سے للکار کر فرمایا کہ "او نیٹے لونڈے میں نے تجھے دیکھ لیا ہے۔ نماز سے فراغت کر لوں تو دیکھ پھر تیری کیسی گت بناتا ہوں" یہ سنکر ہمارے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے، ذرا سنبھلے تو ساڑھے چھ فٹ والے تسمہ، ڈف، ڈنکا ڈولی اور اس زنجیر والے لکڑی کے کندے کا خیال آیا تو بس ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی، پھر وہاں سے جو جھو ہوتے ہوئے نو سیدھے گھر میں آکر دم لیا۔ اماں جان سے چمٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، اور توبہ کی کہ آئندہ سے پھر کبھی مکتب نہ جائیں گے، یا تو کسی مدرسہ میں شریک ہو جائیں گے یا وہی لنگور کی دم والا قاعدہ پڑھتے رہیں گے ؛

سب رس

پریزیڈنٹ اتاترک

پریزیڈنٹ کمال اتاترک یا غازی مصطفےٰ کمال کی موت ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا سے ایک ایسا عظیم الشان سپاہی، سیاستدان اور لیڈر اٹھ گیا ہے جو نہ صرف جدید ترکی کا بانی بلکہ اس کا "تعمیر کنندہ" بھی تھا۔

۱۹۱۹ء میں مصطفےٰ کمال نے ایشیائے کوچک کی بچی کھچی فوج کی کمان ہاتھ میں لے کر تحریک قومی کا آغاز کیا، اس وقت سے لے کر اب تک ترکی کی تاریخ خود مصطفےٰ کمال کی زندگی کی تاریخ بنی رہی، ان کی جرأت اور جذبۂ حب الوطنی نے انہیں ایک یاس انگیز قسمت آزمائی پر مجبور کر دیا۔ حالانکہ ظاہر تھا کہ فاتح اتحادیوں کے متکبرانہ مطالبات کا مقابلہ ایک چھوٹی سی تباہ حال قوم جو اول اول مختلف فرقوں میں منقسم تھی کس طرح کر سکتی تھی۔

ایک کامیاب سپاہی بنجانے کے بعد اتاترک ایک بہادر طاقتور فہیم اور دور اندیش سیاستدان اور مصلح ثابت ہوئے، انہوں نے ترکی کو نہایت کامیابی کے ساتھ ترقی اور جدید تنظیم کے زینے پر پہنچا دیا۔ یہ حقیقت پسند بہادر اپنے آپ کو خوش فہمیوں میں مبتلا رکھنے کا عادی نہ تھا۔

اتاترک نے اپنی قوم کو صرف یورپین قوموں کا ہم پلہ ہی نہیں بنایا بلکہ جو "خارجی پالیسی" وہ اختیار کر لیتے تھے یا جس خارجہ حکمت عملی کی بعض اوقات وہ رہنمائی کرتے تھے اسکی بنا پر ترک قوم بھی مغربی قوموں کے با اثر زمرے میں شمار ہونے لگی۔ اور ترکی کے "پرانے دشمن" اسکے "نئے دوست" بن گئے، سوویٹ روس سے ترکی کے خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کی دانشمندانہ حکمت عملی برطانیہ سے ترکی کے دوستانہ تعلقات کا دوبارہ قیام، یونان سے جو کبھی ترکی کا ایک موروثی دشمن تھا، ایک معاہدہ کے ذریعے پر خلوص اتحاد اور ریاستہائے بلقان اور مغربی ایشیا کی حکومتوں سے خوشگوار معاہدے ایک زبردست دانشمندی تھی۔ چنانچہ اتاترک کے زیر اہتمام ترکی کی سیاسیات کو روز افزوں کامیابی ہونے لگی، اسی باہمی ارتباط کی بنا پر مونٹریکس کانفرنس منعقد ہوئی اور اس کانفرنس میں جو گفت و شنید ہوئی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی نے جو کچھ جنگ میں کھویا تھا وہ اسے واپس مل گیا۔

نئے یورپ نے جنگ اور انقلاب کی ابتری کے پردے سے جن لیڈروں کو نمودار ہوتے دیکھا ہے، ان میں سے کسی نے اتاترک سے زیادہ

ترکوں کا مذہب

(تاثرات پروفیسر محمد ہارون خاں صاحب شروانی، علی گڑھ)

مغرب کی نماز "ینی جامع" میں پڑھی جو ایک عظیم الشان مسجد غلطہ پل کے کنارے پر ہے گو اس کے نام کے معنی "نئی مسجد" کے ہیں لیکن اسے دراصل سولھویں صدی کے اواخر میں سلطان احمد خاں ثالث کی ماں، ولیدہ سلطانہ نے شروع کیا تھا اور تعمیر ساٹھ برس تک برابر جاری رہی تھی، اس مسجد میں مغرب کے وقت تقریباً سو نمازی ہوں گے، سب کے سب یورپی لباس پہنے یورپی صورت والے لوگ تھے، بعض ننگے سر نماز پڑھ رہے تھے۔ بعض کی جیب میں کپڑے کی ایک چھوٹی سی ٹوپی تھی اور یورپی ٹوپی اتار کر اسے پہن لیتے تھے، صرف اذان اور اقامت ترکی زبان میں ہوئی جس کا پہلا لفظ یاد رہ گیا ہے، یعنی بجائے اللہ اکبر کے "تنری بیوک" پکارا جاتا تھا، جس کے لفظی معنی "اللہ بڑا ہے" کے ہیں، خود نماز کلیتہً عربی زبان میں ہوئی۔

ہر امام کو یورپی کپڑوں پر ایک سیاہ عبا اور سر پر لال ٹوپی، ہر ایک کو سفید عمامہ نماز کے وقت باندھنا لازم ہے، حال میں قانون منظور ہوا ہے کہ مذہبی پیشواؤں کو خواہ یہودی ہوں یا عیسائی یا مسلمان اپنی عبادت گاہ سے باہر تمام یورپی لباس پہننا لازم ہے، لیکن جب وہ عبادتگاہوں کے اندر داخل ہوں اسوقت وہ اپنا مذہبی لباس پہن سکتے ہیں اور مسلمان پیش امام کیلئے اوپر لکھا ہوا لباس نماز کے وقت ضروری قرار دیا گیا ہے، نماز نہایت خوش الحانی کے ساتھ عربی میں ہوئی اور فرضوں کے بعد امام اور اکثر مقتدیوں نے اپنی اپنی جیبوں سے تسبیحیں نکالیں اور بآواز بلند ایک ساتھ تسبیح فاطمہ کا عربی زبان میں ورد کیا، اس کے بعد سنتیں پڑھ کر لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

۲۳۔ جون کو (جسے ترکی زبان میں حزیران کہتے ہیں) بایزید گیا جسکا نام سلطان بایزید ثانی (۱۴۸۱ء تا ۱۵۱۲ء) کی خوبصورت مسجد کی وجہ سے رکھا گیا ہے، مسجد کے عین مقابل اس عمارت میں جس میں عثمانی دور میں فوج کا دفتر تھا، اب استنبول یونیورسٹی کے دفاتر اور شعبہ جات طبعیات و کیمیا ہیں، مسجد کے پہلو ہی میں کتاب خانہ عمومیہ ہے جسکے مدیر حضرت محمد اسمٰعیل آفندی کے نام میرے دوست ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے از راہ عنایت مجھے تعارف نامہ لکھ دیا تھا۔ آفندی پرانی وضع کے ایک معمر بزرگ ہیں، سن تقریباً ۷۵ یا ۸۰ سال کا بلکہ اس سے بھی زیادہ کا ہوگا۔ نہایت ہی خلق سے ملے، کڑوا ترکی قہوہ پلایا اور بہت دیر تک باتیں کرتے رہے، فارسی عربی بالکل مادری زبانوں کی طرح بولتے ہیں لیکن یورپی زبانوں میں سے صرف تھوڑی بہت فرانسیسی سمجھ لیتے ہیں بول نہیں سکتے، استنبول عربی فارسی ترکی کتابوں سے بھرا پڑا ہے اور بیسیوں کتب خانے ہیں جنہیں ان زبانوں کے دُر یتیم بھا نظر آتے ہیں، کتب خانہ عمومیہ میں بھی ایک نایاب علمی ذخیرہ ہے لیکن یہ ادارہ ابھی تک پرانے دھرے پر چل رہا ہے اور مدت سے فہرست کتب کی تجدید نہیں ہوئی ہے بلکہ خود آفندی کا کمرہ بے ترتیب حالت میں پڑا ہوا تھا، بہر حال حضرت کے ملنے سے طبیعت میں ایک طرح کا علو پیدا ہو جاتا ہے۔

یہاں سے یونیورسٹی کے کتب خانہ میں گیا، یہ نہایت اچھی حالت میں ہے اور اسمیں بھی عربی، فارسی، ترکی کتابوں کا ایک نفیس ذخیرہ ہے، اس کے مدیر فہمی قرلطے نہایت خندہ پیشانی سے ملے، جنگ عظیم میں ترکی فوج میں تھے، بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو گرفتار ہو گئے اور بلاری (احاطہ مدراس) میں قید ہو گئے، طعنتہً ذکر کرتے تھے کہ زمانہ نظر بندی میں انہیں کتابیں تو کتابیں اخبار بھی پڑھنے کو نہیں ملے، یونیورسٹی کے کتب خانہ میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ کتابیں ہیں، کیا کیا جلدیں اور کیا کیا نفیس مخطوطات ہیں، یہ سب خزانہ دوسرے

(بقیہ پریزیڈنٹ اتاترک)

اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں کی اور ان میں سے کسی کو اتاترک سے زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں ہوا، اتاترک ترکوں کو مصروف ماتم کر گئے ہیں، لیکن آج شاید ترکوں کو یہ جان کر تسلی ہو سکتی ہے کہ ہمارے ملک میں ترکی کے تمام پرانے مخالفین اس کے دوست بن چکے ہیں ہم جو اسے ایک خوفناک دشمن سمجھ کر بھی اس کے ثناخواں تھے۔ وہ دلی صدمہ محسوس کر رہے ہیں، جو اس عظیم الشان آدمی کی موت سے ترکی اور یورپ کو پہنچا ہے۔

(ٹائمز آف لنڈن)

آہنی دروازے میں مقفل ہے اور حکم ہے کہ جسے دکھائیں مدیر خود دکھائیں۔

مغرب کی نماز مسجد سلطان احمد میں پڑھی جسے "نیلی مسجد" بھی کہتے ہیں اور جسے سلطان احمد خاں اول نے ۱۶۱۱ء میں بنایا تھا، یہ ایک عظیم الشان مسجد ہے اور اس کے گنبد کو جو آیا صوفیہ کے گنبد سے بڑا ہے چار عظیم الجثہ ستون اٹھائے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک کا محیط ۸۰ فٹ یعنی تقریباً تیس گز ہے، استنبول کی یہی مسجد ہے جس میں چھ منارے ہیں حکومت کی طرف سے دو امام اور دس موذن نوکر ہیں، یہ مسجد اسی مقام پر واقع ہے جہاں کسی زمانہ میں رومی شہنشاہ بیزنطہ کا محل تھا، اس کے بائیں طرف آیا صوفیہ اور بالکل مقابل وہ جگہ ہے جہاں کسی زمانہ میں ہپوڈ روم یعنی گھوڑ دوڑ کا میدان تھا اور جہاں ابتک مشہور آفاق تین تاریخی منارے نصب ہیں جنہیں دیکھنے کے لئے مورخ دور دراز مقامات سے آتے ہیں، ایک ستون ۳۵۰۰ برس قدیم مصری منارہ ہے، دوسرا وہ ستون ہے جس پر یونان قدیم کی فالگیر دیلفی کا نشان نصب تھا اور تیسرا وہ جس کی مرکزیت آخری مرتبہ نوسو برس پہلے ہوئی تھی، تاریخ میں ان تینوں ستونوں کی انتہا درجہ کی اہمیت ہے، ساڑھے تین ہزار برس پہلا منارے پر جو مصری حروف کندہ ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا کل کے کھدے ہوئے ہیں، ان ستونوں کو شہنشاہ تھیوڈوسیس نے مصر سے لاکر ۳۹۰ء میں موجودہ مقام پر نصب کیا تھا، دیلفی والا ستون ۴۷۹ ق م میں تیار ہوا تھا، اور تیسرا دسویں صدی عیسوی کے وسط میں یہاں سے واپسی میں اسٹیشن سرکیی کے قریب قدیم بیزنطینی فصیل اور رومن کا دروازہ دیکھا جو تقریباً تیرہ سو برس پرانا ہے۔

۲۴ جون کو جمعہ کا دن تھا لیکن تمام بازار اور یونیورسٹی وغیرہ کھلے ہوئے تھے چنانچہ میں نے یونیورسٹی میں جاکر کتاب نہج المسلوک کا مطالعہ کیا یہ سمجھ میں مشکل سے آتا ہے کہ بجائے جمعہ کے اتوار کو کیوں تعطیل ہونے لگی ہے، دریافت پر معلوم ہوا کہ چونکہ تمام یورپی ممالک میں بنک کا کاروبار اتوار کے دن بند ہوتا ہے، اس لئے اگر جمعہ کو تعطیل رہتی تو اس میں دقت پیش آتی، لیکن یہ ممکن تھا کہ بنکوں کو خاص طور پر اتوار کو بند کیا جاتا، اب صورت یہ ہے کہ دوپہر کو جمعہ کی نماز کے وقت حسب معمول دو گھنٹہ کی چھٹی ہوتی ہے، اور بجائے جمعہ کے اکثر ادارات بازار بنکیں، مدرسے، غرض سب چیزیں حکماً ہفتہ کے دن بارہ بجے بند ہو کر پیر کے دن صبح کے وقت کھلتے ہیں، تعلیمی ادارات مثلاً کتب خانوں میں سے بعض جمعہ کو بعض اتوار کو بند رہتے ہیں، تاکہ کوئی نہ کوئی ایسا ادارہ کھلا رہے اور لوگ مطالعہ میں مسلسل مصروف رہ سکیں، ترک بلاشبہ مسلمان ہیں اور ایک حد تک غلو کے ساتھ اسلام کے نام لیوا ہیں اور یہ بھی ماننے کے لئے تیار ہوں کہ ملک کے محل وقوع اور دنیوی ضروریات کے اعتبار سے اسکی ضرورت ہے کہ انہیں بالکل یورپی سانچے میں ڈھال دیا جائے لیکن یہ سمجھ میں آنا دشوار ہے کہ کیوں پبلک زندگی میں مشرقیت کو بالکل ہی خیرباد کہنے کی ضرورت ہے جمعہ کی نماز میں نے جامع ہی میں پڑھی، میں سمجھتا ہوں کہ کم از کم دو ہزار مرد عورتیں ہونگی اذان تکبیر ترکی میں، خطبہ عربی اور ترکی میں اور نماز کلیتہً عربی میں ہوئی، عورتوں کیلئے پیچھے صف بندی ہوتی ہے، اور نماز کے وقت یہ یورپی ٹوپی کے بجائے سر پر سیاہ رومال باندھ لیتی ہیں جو آگے تک پڑا ہوتا ہے، شام کے وقت بزنطینی فصیل کے آخری دروازے جسے اخیر قپیو کہتے ہیں کا معائنہ کیا، استنبول کا یہ حصہ نہایت دلچسپ ہے، اس لئے کہ ایک طرف تو اس سے قدیم بی زنطہ کی یاد تازہ ہوتی ہے اور دوسرے یہاں بیچارے غریب ترک کم و بیش اپنی پرانی طرز معاشرت کے ساتھ رہتے ہیں، مثلاً یہاں کے بعض مکانات کی کھڑکیوں میں پردے کے لئے ابتک لکڑی کی جالیاں لگی ہوئی ہیں، گو ظاہر ہے کہ پردہ مفقود ہے اور عملاً مفقود ہے، ۲۵ جون کو یونیورسٹی جاکر مطالعہ کیا، نہج المسلوک ختم کی اور سید علی ہمدانی کی قلمی کتاب ذخیرۃ الملوک کے ابواب جو سیاسیات کے متعلق تھے دیکھے۔

ہمارے ہوٹل سے دو بڑی بڑی لاریاں بھری جا رہی تھیں، دریافت پر معلوم ہوا کہ ترکوں نے چند خیراتی انجمنیں بنائی ہیں جن کا منشا یہ ہے کہ کسی چھٹی کے دن غریب عورتوں مردوں بچوں کو شہر سے باہر جانے اور خوشی و خرمی کے ساتھ تعطیل بسر کرنے کا موقع ملے، یہ لاریاں کھانے پینے کی چیزیں، پیسٹری، چائے، قہوہ، برف وغیرہ سے بھری ہوئی جا رہی تھیں، ڈھائی تین سو غرباء مدعو تھے، دوسرے دن تعطیل تھی لہذا منشا یہ تھا کہ چوبیس گھنٹے ہنسی خوشی سے بسر ہوں اور لوگ کم از کم اس مدت کے لئے اپنی غربت اور افلاس کو بھول جائیں۔

شام کو حضرت رسول اکرم صلعم کے علمبردار حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مقبرے کی زیارت کی ۶۶۷ء میں معاویہ بن یزید کے زمانہ میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا جو حملہ ہوا تھا اسمیں شہید ہوئے تھے، کہتے ہیں کہ ۸۰۰ برس تک کسی کو معلوم نہیں تھا، کہ وہ کس مقام پر شہید ہوئے ہیں اس لئے کہ ۱۴۵۳ء تک تو یہاں عیسائی شہنشاہوں کی حکومت تھی اور انہیں کیا ضرورت تھی کہ جستجو کرتے، محمد ثانی نے جب اسی سنہ میں قسطنطنیہ فتح کیا تو انکے ایک ساتھی خواجہ شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں بشارت ہوئی کہ حضرت ایوب فلاں جگہ مدفون ہیں، چنانچہ سلطان نے ان کا مقبرہ بنوایا اور ایک مسجد تعمیر کی، اس مقبرے کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان قبرستان بن گیا ہے جو میلوں پھیلا ہوا ہے اور اسمیں ترکی کے بعض برگزیدہ شخص دفن ہیں، مثلاً امیر البحر حسین پاشا، محمد پاشا سقولو کسی زمانے میں صدر اعظم تھے، سلطان عبدالحمید خاں مرحوم کی والدہ، سلطان محمد خامس ادھم پاشا فاتح مہم ۱۸۹۷ء وغیرہ بے شمار سربرآوردہ لوگ یہیں سپرد خاک ہیں، سلطان سلیم خاں ثالث نے اپنے پیشرو محمد فاتح کی مسجد کو بحال رکھا، لیکن اسے ایک نئی بڑی مسجد کے اندر لے لیا، چنانچہ مسجد کے اندر ایک دوہری مسجد محراب گنبد ہر چیز سمیت آگئی جو عجوبہ ہے، قبرستان میں متعدد قبریں دیکھیں جن پر کتبوں کی زبان عربی و ترکی اور حروف لاطینی تھے، یہی کیفیت مشہور آفاق زارو آغا کی لوح کی بھی تھی جسے چند سال ہوئے ۱۶۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

حضرت کا مزار شہر کی قدیم بیزنطینی فصیل سے باہر "شاخ زریں" کے کنارے پر اس چشمہ کے قریب واقع ہے جسے یورپ کا میٹھا پانی" کہتے ہیں اور اس مزار کی وجہ سے قصبہ کا نام ہی "ایوب" پڑ گیا ہے، استنبول سے ہم کشتی پر "ایوب" جا رہے تھے، راستہ میں ایک ترکی افسر سے ملاقات ہوئی، ترکی کی زندگی کی یوروپیت دیکھ کر بعض امور کے متعلق:

خانقاہ کو چلو!

(از جناب :- قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مترجم "مصری افسانے")

آہ وہ بدقسمت نوجوان، جس کو میں نے کل صبح، کلب کے ایک گوشہ میں آرام کرسی پر لیٹے دیکھا! اس کی حسین پیشانی پر رنج و غم کی بدلیاں چھا رہی تھیں اور اس کی گردن سینہ پر اس طرح جھکی ہوئی تھی گویا اس کا دل اڑ جانا چاہتا ہے اور وہ اپنے دونوں پہلوؤں کی پوری طاقت سے اسے روکے ہوئے ہے۔ میں نے اس سے پوچھا، اے دوست کیا بات ہے؟ اس نے جواب دیا۔ کچھ نہیں۔ میں نے کہا تم مجھ سے اپنے دل کی بات چھپاتے ہو، اگر تم مجھے پہچانتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ اس نے جواب دیا۔ جب سے میری آپ سے ملاقات ہوئی ہے آپ کو خوب پہچانتا ہوں۔ مگر بات یہ ہے کہ میں نے خدا سے عہد کر رکھا ہے کہ میں اپنا درد اسی سے بیان کروں گا جس سے دوا کی امید ہو اور مجھے یقین ہے کہ دنیا میں میرے درد کی دوا نہ آپ کے پاس ہے اور نہ کسی دوسرے انسان کے پاس۔

میں نے کہا۔ تم مجھے تھوڑی دیر کے لئے ڈاکٹر ہی فرض کر لو۔ ڈاکٹر اگرچہ بہت کم مریض کا مرض دور کرتا ہے، مگر اکثر اوقات اس کی تسلی و تشفی تو کر ہی دیتا ہے۔ اسی طرح اگر میں بھی تمہارے مرض کا علاج نہ کر سکوں۔ تو کم از کم تسلی و تشفی تو کر ہی دوں گا۔ دیکھو! جب پانی زیادہ جوش مارنے لگتا ہے تو اس میں پھونک مارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ وہ دیگچی کو اڑا لے جائیگا۔

میری یہ گفتگو اس نے توجہ سے سنی، اور میرے استدلال کو اس نے تسلیم کر لیا۔ اور مجھے اپنی داستان سنانی شروع کی۔ جسے جابجا ٹھنڈی سانسیں اور گرم آنسو قطع کر کر دیتے تھے۔ اس نے کہا:۔

کئی سال گزرے، میرے والد مرحوم نے میری شادی ایک ایسی جاہل و نادان لڑکی سے کر دی جو شادی کا مفہوم بیوی کہلانے کے سوا کچھ نہ سمجھتی تھی اور انکو فخر تھا کہ انہوں نے میری شریک حیات ایک پروردۂ ناز و نعمت، صاحب جاہ و ثروت، شریف و نجیب خاتون منتخب کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ میری بیوی بہت بڑی جائیداد کی مالک تھی۔ مگر شاید وہ بھول گئے کہ میں نے زندگی کی اس نئی منزل میں، ایک سوداگر کی حیثیت سے جس کا مطمح نظر روپیہ کمانا ہو قدم نہیں رکھا تھا، بلکہ ایک شوہر کی حیثیت سے جس کا مقصود ایک رفیق زندگی کی تلاش تھی، جو حوادث روزگار کے وقت غمگسار و چارہ ساز ہو اور سکون و اطمینان کے زمانہ میں دلدار و دلنواز۔ میں ایسی بیوی کا کیا کرتا جو خود اپنے بچہ کو دودھ بھی نہ پلا سکے، اور تبدیل لباس میں بھی دوسروں کی محتاج ہو۔ وہ دولتمند سہی مگر اس کی دولت تو خود اس کے لئے بھی کافی نہ تھی۔ انسانی زندگی کی غیر محدود ضروریات میں سے ہر ضرورت کی تکمیل کے لئے اس کو ایک مستقل خادمہ درکار تھی۔ اس سے اسے ہر وقت نوکرانیوں اور سہیلیوں کی فوجیں گھیرے رہتی تھیں۔ پھر چونکہ وہ بدقسمتی سے حسین نہ تھی۔ اس لئے اسے ہر مہینہ ایک گرانقدر رقم مصنوعی حسن و جمال کی خریداری پر صرف کرنا پڑتی تھی۔

میں اس پر بھی صبر کر سکتا تھا اگر وہ مجھے میرے حال پہ چھوڑ دیتی مگر افسوس کہ اس نے میرے قدموں کی ہر حرکت اور میری نگاہوں کی ہر گردش پر سنسر قائم کر دیا تھا اور اس کی بدگمانی کی یہ حالت تھی کہ اگر میں کسی وقت اپنی زندگی کی ناکامی پہ آہیں کھینچتا تو وہ انہیں عشق کی آہیں قرار دیتی اور اگر اپنے عیش کی تلخی پر آنسو بہاتا تو وہ انہیں محبت کے آنسو گمان کرتی۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ میرے اعمال و افعال کے

محاسبہ کا دفتر اس وقت کھولتی جب میں مطالعہ کتاب یا محاسبۂ نفس میں مشغول ہوتا - اب اگر میں خاموش رہتا تو میری خاموشی کو وہ اپنی توہین سمجھتی اور اگر میں اسے جواب دیتا تو میرے جواب سے وہ مشتعل ہو جاتی - اس کا خیال تھا کہ کتاب اس کی سب سے بڑی رقیب ہے اور مصنفین نے کتابیں محض اس سے اپنی دشمنی کا انتقام لینے کے لئے تصنیف کی ہیں -

غرض وہ یہ سمجھتی تھی کہ خدا نے اسے محض اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ عمر کی ہر منزل میں ایک کھلاڑ بچی بنی رہے اور میں اس کا کھلونا - نہ میں پڑھوں، نہ لکھوں، نہ اپنے نفس کے حقوق ادا کروں، نہ زندگی کے فرائض انجام دوں - بلکہ ہر وقت اس کی ان مسلسل تقریروں کی طرف ہمہ تن گوش بنا رہوں - جو سہیلیوں کی تعریف و تنقیص یا لباس و زیور کی تقریظ و تنقید پر مشتمل ہوتی تھیں - اگر میں اس کی اس خواہش کو پورا کرتا تب تو ٹھیک ٹھیک تھا - ورنہ وہ ایک لمحہ میں خونخوار شیرنی بن جاتی، اور پھر جگر خراشی و دلآزاری کا کوئی پہلو نہ چھوڑتی -

ان حالات میں میں اس کی رضامندی کی مصیبتوں اور ناراضی کی تکلیفوں سے لبریز زندگی کے ایسے جہنم میں کروٹیں بدل رہا تھا جس سے میں موت کی آغوش کو ہزار درجہ بہتر سمجھتا تھا - جب میں نے دیکھا کہ پانی سر سے گذر گیا ہے، اور کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی - تو میں نے اسے طلاق دیدی - اب میری نگاہوں میں کوئی چیز شرافت سے زیادہ ذلیل اور دولت سے بڑھ کر حقیر نہ تھی

میں نے کہا "لیکن اے دوست! پھر تم اب کیوں رنجیدہ ہو؟" اس نے جواب دیا "جی ہاں میری داستان کا ایک حصہ ابھی باقی ہے — جاہل و کندۂ ناتراش بیوی سے چھٹکارا پانے کے بعد، میں نے تعلیم یافتہ و مہذب بیوی کی تلاش شروع کر دی - کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میری نئی ازدواجی زندگی، جس کا افتتاح میرے اپنے ہاتھوں ہونا تھا - میرے لئے پیام عیش و راحت ثابت ہوگی اور گزشتہ رنج و کلفت کی تلافی ہو جائے گی -

اتفاق سے میرے پڑوس میں ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال بزرگ وارد ہوئے - میری ان سے راہ و رسم ہو گئی - اس دوران میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک حسین و جمیل لڑکی جو تعلیم و تہذیب کے زیوروں سے بھی آراستہ ہے - ان کے گھر کی زینت ہے - اس علم کے بعد میں نے اس لڑکی سے تعلقات پیدا کیے - (اور یہ ایک ایسے گھر میں جو تمدن جدید کی روشنی سے منور ہو کچھ مشکل نہ تھا) چنانچہ جو کچھ میں نے سُنا تھا اسے صحیح پایا اور لڑکی نے بہت جلد میرے دل میں گھر کر لیا -

میں نے ان صاحب کو لڑکی کے لئے پیام بھیجا جو خوشی قبول کر لیا گیا - اس کامیابی نے مجھے خوشی میں دیوانہ بنا دیا اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میں اپنی امیدوں کے آسمان میں ایک چمکتا ستارہ دیکھ رہا ہوں جس نے میری زندگی کی تاریکیوں کو جگمگا دیا ہے اور مجھے یقین ہو گیا کہ ظالم زمانہ نے اپنے ان گناہوں کے کفارہ کا ارادہ کر لیا ہے جن کا میری سابقہ ازدواجی زندگی کو برباد کرکے اس نے ارتکاب کیا تھا - میں نے خوشی خوشی محفل شادی کے انتظامات شروع کر دیئے اور وسیع پیمانہ پر اس تقریب سعید کو انجام دینے کا ارادہ کر لیا -

شادی سے ایک دن پہلے، جب کہ میں آنے والی راحتوں کا عالم تخیل میں مزا لوٹ رہا تھا، ڈاکیہ آیا، اور اس نے مجھے ایک لفافہ دیا - آہ! اس لفافے نے میری عیش و عشرت کی خیالی دنیا کو درہم برہم کر دیا - لیجئے یہ ہے وہ لفافہ، ملاحظہ فرمایئے - اس میں میرے المیہ کا آخری باب ہے -

---

یہ کہکر نوجوان نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میری طرف ایک لفافہ بڑھایا - میں نے نوجوان سے لفافہ لے لیا اور اسے کھولا تو اس میں ایک پیکر جمال لڑکی کا فوٹو تھا جو ایک مست شباب نوجوان کے ہم آغوش تھی اور ایک خط تھا - جس کا مضمون یہ ہے :-

جناب مکرم - مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے —— کے لئے

اس کے باپ کے پاس پیام بھیجا تھا۔ اور وہ پیام منظور بھی کر لیا گیا ہے اور عنقریب اس کی آپ سے شادی ہو جانے والی ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ اس لڑکی کے متعلق سخت مغالطہ میں مبتلا ہیں وہ آپ کے علاوہ ایک دوسرے نوجوان کو اپنا دل دے چکی ہے۔ اب یہ ناممکن ہے کہ وہ آپ کی ہو کر رہے۔ لہذا اپنے فیصلہ پر دوبارہ غور کیجئے۔ اور اس سے ہاتھ دھو لیجئے۔ اگر آپ کو میری اطلاع کی تصدیق، اور اس نوجوان کی شخصیت کی تحقیق مطلوب ہو تو منسلکہ فوٹو ملاحظہ فرمائیں۔ ——— دستخط

اس خط کو پڑھ کر اور فوٹو کو دیکھ کر، میرے بدن میں کپکپی پیدا ہو گئی اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ لیکن میں نے پوری کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالا اور لفافہ اس نوجوان کو واپس دیتے ہوئے کہا:۔

اے دوست! ایک بدکار لڑکی کے جال میں پھنسنے سے پہلے تمہیں اس کی اصلیت معلوم ہو گئی تو یہ رنج کی کیا بات ہے؟ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس نابکار کی یاد میں آنسو بہانے کی بجائے اس کی صورت پر تھوکتا اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا کہ اس نے مجھے ایک مرتبہ ہلاکت کے غار میں گرنے کے بعد دوسری مرتبہ اس میں گرنے سے بچا لیا۔ رہا شادی کا معاملہ۔ سو اس کے متعلق میری اپنی رائے تو یہ ہے کہ اب اس خیال کو چھوڑ دو اور کسی خانقاہ کی راہ لو اور "ہملٹ" کے ہمزبان بن کر دوسروں سے بھی کہو کہ "خانقاہ کو چلو، خانقاہ کو چلو۔"

(مصطفیٰ لطفی المنفلوطی المصری)

نربدا

اثر خامہ جناب علامہ سید سلیمان ندوی

نربدا۔ اے نربدا۔ اے جادۂ بحرِ عرب
گرچہ تو ہندی ہے، لیکن زادۂ بحرِ عرب

ہاں گذشتہ کارواں کا تو نشانِ راہ ہے
ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے

جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز
تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز

ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو
چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو

رشتۂ ہند و عرب تجھ سے ہُوا تھا استوار
تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے اسکی یادگار

آج کس کو یاد ہے وہ داستان پاستان
تیرے ساحل پر جب اترا تھا عرب کا کاروان

تیرا ہر قطرہ حیاتِ نو کا اک تازہ پیام
اس تنِ آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام

تو ہے دریائی پری یا شاہدِ عالم ہے تو
اس سمندر کے گلے میں شہرگِ اعظم ہے تو

اے بھروچ! اے خاتمِ انگشت رودِ نربدا
عہدِ ماضی کی تری عزت رہے باقی سدا

توتیائے چشم زائر آج تیری خاک ہے
تیرا ساحل یادگارِ اُمتِ لولاک ہے

حدیثِ غنچہ

چھیڑ دیا بہار نے پردۂ چمن کے ساز کا — موج ہوا میں کیف ہے نغمۂ جاں نواز کا
نکہتِ باغ روح بخش زینتِ باغ دلفریب — سنبلِ باغ مشکبو نرگسِ باغ دیدہ زیب
شاخِ شجر کا برگ برگ بن گیا مطربِ چمن — پھولوں کی ڈالیوں میں ہے حسنِ عروسِ گلبدن
بامِ فلک پہ ماہ کے ابر کی شال دوش پر — شوخیاں کھیلتی ہوئیں اس کے لبِ خموش پر
جھونکوں سے بادِ سرد کے آتشِ گل فزوں ہوئی — کثرتِ برگ و بار سے شاخِ شجر نگوں ہوئی
گوشۂ صحن باغ میں دھیمی سی اک صدا ہوئی — یعنی شگوفے کی صبا آکے گرہ کشا ہوئی

روحِ حیات تھی رواں گرمیٔ جستجو کے ساتھ — دل میں تھا شوقِ انبساط جاتا رہا وہ بو کے ساتھ
حسرتیں بن کے بوئے گل دوشِ صبا پر اُڑ گئیں — پتیاں سوکھ سوکھ کر شاخ پر اس کی مڑ گئیں
حسن و جمال و رنگ و بو ہو گئے جب سپردِ خاک — پھاڑ کے دامنِ قبا کر لیا اس نے سینہ چاک
اس کے مآلِ حسن پر آہ ذرا نظر نہ تھی — دہر میں کیا ہے رمزِ زیست اسکی اُسے خبر نہ تھی

کشمکشِ حیات کا لطف ہے انتظار میں — لیتا ہے شوق کروٹیں عالمِ اضطرار میں
ہوتی ہے سیرِ چشم شوق جلوۂ بے نقاب سے — رہتا ہے حشر آرزو دل میں بپا حجاب سے
ولولۂ جہاں کشا جرأتِ دہر آفریں — غلغلۂ فلک رسا گریۂ سحر آفریں
حسن کی دلربائیاں عشق کی جاں نثاریاں — جذب کی بیقراریاں عقل کی پردہ داریاں
عشوۂ جاں ستاں کی یاد غمزۂ ناروا کی دھن — اور دلِ غم پرست کو ناوکِ دلربا کی دھن
حسرت و آرزوؤں کا ایک ہجوم دلنشیں — عزم کی جاں سپاریاں یاس کی وہ "نہیں نہیں"
خلوتِ شب میں آہ وہ ہجر کی دلگدازیاں — وصل کے انتظار میں شوق کی دل نوازیاں
لطفِ حیات الغرض ضبط کی کوششوں میں ہے — جذبۂ شوق کی کشش ہجر کی کاوشوں میں ہے

ہیں تری نامرادیاں وجہ ترے ثبات کی
اور حصولِ مدعا موت ہے حیات کی

(محمود اسرائیلی)

چاند کی سمت میں نہ دیکھونگا

اِس طرح روٹھ کے گئی ہو کیوں
ہجر کا داغ دے گئی ہو کیوں
اور سکوں دل کا لے گئی ہو کیوں
چاند کی سمت میں نہ دیکھونگا

کیفِ جذبات میں کچھ ایسا بہا
ہوش دنیا و دیں کا بھی نہ رہا
بھول جاؤ، غلط کہا جو کہا
چاند کی سمت میں نہ دیکھونگا

چاند کو دیکھ کر ہوا میں تباہ
کھو گئے رہنما و منزل و راہ
چاند کی سمت دیکھنا ہے گناہ
چاند کی سمت میں نہ دیکھونگا

میرے دل کو نہ اور تڑپاؤ
ہوں پشیمان، رحم فرماؤ
مسکراتی ہوئی چلی آؤ
چاند کی سمت میں نہ دیکھونگا

(ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے)

دل کی داستان

دل کہاں کہ اب تجھ سے دل کی داستاں کہیئے
اور اگر نہ تو مانے، تجھکو بدگماں کہیئے

تو نے جو کہا سب کچھ ہے مرے سر آنکھوں پر
تجھ سے کچھ نہیں پنہاں، تجھ کو رازداں کہیئے

حسن نے روش بدلی، لطف پر ہوا مائل
اِس کو بھی محبت کا ایک امتحاں کہیئے

مجھ کو اپنی قسمت پر ناز جتنا ہو کم ہے
تو نے حالِ دل پوچھا، تجھ کو مہرباں کہیئے

بارور ہوا آخر نخلِ آرزو میرا
گلستانِ ہستی کا تجھ کو باغباں کہیئے

جس کو عندلیبیں بھی آج تک نہیں سمجھیں
غنچہ کو حقیقت میں رازِ گلستاں کہیئے

اے ضیا محبت میں خامشی روا کیوں ہو
دل کی داستاں سنیئے، دل کی داستاں کہیئے

(ضیا فتح آبادی۔ ایم۔ اے)

فریب خوردۂ رنگینیٔ حنا ہوں میں

(از جناب محمد مصطفٰے خان صاحب مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی لکھنؤ)

رہِ وفا میں کچھ اس طرح کھو گیا ہوں میں
کہ لوگ کہتے ہیں خضرِ رہِ وفا ہوں میں

جو اشک خوں تری فرقت میں رُو رہا ہوں میں
فریب خوردۂ رنگینیٔ حنا ہوں میں

بتاؤں کیوں میں تمہیں کس کو چاہتا ہوں میں
تمہیں سا ہے وہ حسیں جس پہ مرمٹا ہوں میں

دل و جگر نے دیا ساتھ خون رونے میں
رہیں منّت ارباب باصفا ہوں میں

خیالِ عارض و گیسو و چشم جاناں میں
طلسم کی نئی دُنیا بسا رہا ہوں میں

جو شمع حسن ہو تم میں ہوں مثلِ پروانہ
بنا جفا کی ہو تم بانی وفا ہوں میں

مری اُمیدیں ہیں وابستہ میری نیست کیسا
شکستہ دل کا خود اپنے ہی آسرا ہوں میں

بتوں کے عشق نے کوئی بُرا اثر نہ کیا
چلا تھا کعبہ کو بتخانہ آگیا ہوں میں

کسی کی تیرِ نظر کا اگر ہدف نہ ہُوا
تو کس مرض کی پھر اس دہر میں دوا ہوں میں

مرا جگر ہے ۔ مرا دل ہے ۔ میری ہمت ہے
کہ تجھ سے رسمِ محبت نباہتا ہوں میں

ترا اگر نہ ہُوا میں ۔ تو میرا ایماں ہے
کسی کا بھی نہ زمانے میں مصطفٰے ہوں میں

"غزل"

از جناب محمد اعظم علی صاحب اعظم ابن جناب حاجی محمد مصطفٰے خان صاحب مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

اُسکے رُخ پر نقاب کا عالم
پرتوِ آفتاب کا عالم

زندگی کیا حباب کا عالم
دہر کیا ہے سراب کا عالم

دیکھ تو لو کبھی نگاہوں سے
دلِ خانہ خراب کا عالم

زلفیں بکھری ہوئی ہیں عارض پر
چاند پر ہے سحاب کا عالم

کسی پہلو نہیں قرار مجھے
اب یہ ہے اضطراب کا عالم

جب بھی روئے بہا دیئے دریا
ہے یہ چشمِ پُر آب کا عالم

رُخ پہ زلفیں ہیں اسطرح گویا
ابر میں ماہتاب کا عالم

دلکو تسکین اُسنے دی پھر بھی
ہے وہی اضطراب کا عالم

اُسکی زلفوں کو جب سے دیکھا ہے
بڑھ گیا پیچ و تاب کا عالم

ہے یہ کیا بزمِ عالم فانی
اک پریشان خواب کا عالم

ذرے ذرے میں ایک پردہ ہے
اُف یہ تیرے حجاب کا عالم

یاد ہے یاد ہے مجھے اعظم
کیسی مستِ شباب کا عالم

"ناز بر نیاز"

زائرِ حرم: حمید صدیقی لکھنوی

کشاکشِ غمِ دنیا سے بے نیاز کیا — بڑا یہ تونے کرم اے نگاہِ ناز کیا

پھر اسکو دولتِ کونین کیفر ورکیا — جسے عطائے محبت نے سرفراز کیا

یہ سب تمہاری نگاہِ کرم کا صدقہ ہے — کہ دل نے دردِ محبت سے ساز باز کیا

بڑھا یہ جوشِ محبت اُبل پڑیں آنکھیں — سب آنسوؤں نے عیاں دردِ دل کا راز کیا

نہ امتیازِ خودی ہے نہ بیخودی باقی — یہ سحر تونے عجب چشمِ نیمباز کیا

تسلیوں سے بڑھی اور دل کی بیتابی — علاج درد کا کیا خوب چارہ ساز کیا

نیازِ عشق سے کچھ اور نازِ حسن بڑھا — ستم کیا کہ جو دستِ طلب دراز کیا

بنی ہے سرمۂ چشمِ نیاز مندِ وفا — کہ خاک جسکو کہ پامالِ پائے ناز کیا

کہاں یہ عنصرِ خاکی کہاں یہ جوہرِ روح — تری نگاہِ توجہ نے سرفراز کیا

خوشا کہ اشکِ جگر غمازِ رازِ عشق بنے — زہے کہ دل کہ جسے آشنائے راز کیا

خدا بھلا کرے اُس نغمۂ محبت کا

حمید جسنے مجھے محوِ سوز و ساز کیا

"سوز و ساز"

زائرِ حرم: حمید صدیقی لکھنوی

کشتۂ تیغِ نگاہِ ناز ہوں — اہلِ دل میں قابلِ اعزاز ہوں

چھیڑتے تو ہو مگر یہ جان لو — درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہوں

اُس سے کہتا ہے ہر اک تارِ نفس — تو سراپا نغمہ ہے اور میں ساز ہوں

حاملِ بارِ امانت اور میں — اللہ اللہ میں امینِ راز ہوں

ناز کے قابل ہی میری زندگی — بسملِ تیرِ نگاہِ ناز ہوں

نزع کا ہنگام ہے کچھ بولیئے — میں سراپا گوش برآواز ہوں

کیوں نہوں نغمے سرِ وجد آفریں — ہمنوائے بلبلِ شیراز ہوں

مجھ میں پوشیدہ ہے صوتِ سرمدی — تیری محفل میں صدائے ساز ہوں

بازوؤں میں دم نہیں طاقت نہیں — لیکن اب بھی مائلِ پرواز ہوں

شمعِ سوزاں ہوں پگھلنے دو مجھے — راز ہوں اور خود ہی شرحِ راز ہوں

بلبلیں بھی مست ہو جائیں حمید

میں چمن میں گر نوا پرواز ہوں

تقریر:—

ملاپ

حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کا ایک مضمون جو بزم اُردو گوالیار میں پڑھا گیا

(حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے قلم سے)

یہ جو سامنے اونچا قلعہ نظر آتا ہے۔ چتوڑ گڈھ سے بڑا ہے۔ یا چھوٹا؟ کہنے والے کہہ گئے ہیں۔ گڑھ ہے تو چتوڑ گڈھ باقی سب گڑھیاں ہیں اور تال ہے۔ تو بھوپال تال باقی سب تلیاں ہیں۔ یہ کہاوت اس شخص نے بنائی ہوگی جس نے ہندوستان کے اُن قلعوں کو نہ دیکھا ہوگا۔ جو چتوڑ گڈھ سے کہیں زیادہ بڑے ہیں۔ یا اس سیاسی اہمیت کے مظاہرے کے لئے جو مسلمان حکومت اور اودے پور کی ہندو حکومت کے درمیان کش مکش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ چتوڑ گڈھ کو سب قلعوں پر فوقیت دی گئی تھی۔

اور دوسرے بڑے بڑے قلعوں کا خیال چھوڑ دیجئے۔ صرف گوالیار کے قلعہ کو دیکھ لیجئے۔ یہ کسی بات میں چتوڑ گڈھ سے چھوٹا نہیں ہے۔ اور اس کی خصوصیت تو ایسی ہے۔ جو ہندوستان کے کسی قلعہ کو آج تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اس قلعہ میں ہندوستان کی سب مسلمان حکومتوں کے قیدی تاجدار یا شہزادے مقید رکھے جاتے تھے۔ جس سے گوالیار کے قلعہ کی فوقیت و عظمت ظاہر ہوتی ہے یہ ہندوستان کے سب قلعوں سے زیادہ مستحکم سمجھا جاتا تھا۔ یہ قلعہ ہر اسلامی سلطنت کے نزدیک ایسا ممتاز اور برگزیدہ تھا۔ کہ سب بادشاہ اسی قلعہ میں شاہی خاندان کے قیدیوں کو رکھتے تھے۔

اگر یہ قلعہ بول سکتا ہو اگر اس قلعہ کے در و دیوار زمین اور بالائی فضا میں کسی ڈاکٹر بوس نے شعور اور زندگی کو دریافت کر لیا ہو۔ اگر اس قلعہ کی آنکھیں بھی ہوں۔ اگر اس قلعہ کے کان بھی ہوں۔ اور اگر اس قلعہ کا حافظہ بھی درست ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اگر اس قلعہ پر نئی تاریخ اور نئی تہذیب کا سایہ بھی نہ پڑا ہو اور یہ پرانی تاریخ اور پرانی تہذیب کا قدردان اور دلدادہ بھی ہو۔ تو میں تمام حاضرین جلسہ سے درخواست کروں گا۔ کہ وہ میرا اس شاہوں کے قیدخانہ سے تعارف کرا دیں۔ صرف اتنا کہہ کر کہ یہ ایک قید خانہ ہے۔ جس میں بادشاہ اور شہزادے قید کئے جاتے تھے۔ اور یہ بھی ایک خانہ ہے جس میں اب تک بہت سے بادشاہ اور شہزادے اور شہزادیوں (دماغ۔ دل اور حواس باطنی) قید ہیں۔

جب تعارف ہو چکے گا۔ تو ایک جیل خانہ دوسرے جیل خانہ سے اپنے کلیجہ کو تھام کر آنکھوں میں آنسو بھر کر تھرتھراتی ہوئی آواز میں پوچھے گا "میں مغلوں کا حال نہیں پوچھتا میں تو صرف ایک قیدی مرد اور ایک قیدی عورت کا حال پوچھتا ہوں۔ مرد کا نام خضر خان تھا۔ عورت کا نام دیول دیوی تھا۔ مرد مسلمان تھا۔ عورت ہندو تھی۔ وہ خضر خان جو خضر خان سکندر ثانی علاؤالدین خلجی کا ولیعہد تھا۔ وہ خضر خان جو حسن صورت اور حسن سیرت میں بے مثل مانا جاتا تھا۔ اور وہ دیول دیوی جس کی محبت کے افسانے حضرت امیر خسروؒ کی فارسی مثنوی خضر خان و دیول رانی کے ذریعہ آج تک ایران و ہندوستان میں گونج رہے ہیں"

قلعہ سے پوچھتا ہوں۔ گوالیار کے قلعہ سے دریافت کرتا ہوں۔ یہی قلعہ جس کے نیچے سے رات دن عشق باز اور عشق سے محروم ظالم جفا کار اور ستم زدہ مظلوم عورت مرد گورے کالے امیر غریب بمبئی سے دہلی اور دہلی سے بمبئی ریل میں آتے ہیں۔ اور جاتے ہیں۔ اور اس اونچے قلعہ کو دیکھتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ اور کسی کو یہ خیال بھی نہیں آتا۔ کہ یہ کیا تھا؟ اور کیا ہے؟ اور کیا ہونے والا ہے؟ اگر تو زبان قال سے نہیں بولتا تو زبان حال سے بول اور سُنا اور بتا کہ شہنشاہ ہندوستان کا خوش جمال ولیعہد اپنے چھوٹے بھائی قطب الدین خلجی کی سفاکی سے اندھا ہو کر جب تیرے اندر قید ہوا۔ تو اس نے کتنے دن اور کتنی راتوں تک اپنی ملکہ دیول دیوی کو یاد کیا۔ کیا وہ اپنی خوبصورت آنکھوں کے لئے روتا تھا؟ کیا وہ اپنی عظیم الشان سلطنت کے لئے روتا تھا؟ کیا وہ اپنی آزادی اور عیش و راحت کے لئے روتا تھا؟ کیا وہ کسی محبوبہ کے لئے روتا تھا؟

میں دیکھتا ہوں۔ کہ جب میں نے خضر خان کی آنکھوں کا سوال کیا کہ اس کے ظالم بھائی نے اس کی خوبصورت آنکھوں کو تیل کی سلائی پھیر کر بے نور کر دیا تھا۔ اور اس کو اپنی آنکھوں کا بڑا صدمہ ہوگا مگر تو نے اس سوال کا جواب نہ دیا۔ تو میں سمجھا کہ

خضرخان کو اپنی آنکھوں کا غم نہ تھا۔ اور جب میں نے تجھ سے خضر خان کی سلطنت چھن جانے کا سوال کیا۔ تب بھی تو خاموش رہا۔ گویا تو نے کہا۔ کہ خضرخان کو سلطنت ہاتھ سے نکل جانے کا ملال بھی نہ تھا۔ اور جب میں نے خضرخان کی آزادی اور شاہانہ عیش و راحت سلب ہوجانیکا سوال کیا۔ تب بھی چپکا رہا جس سے میں سمجھا کہ خضرخان کو اس کا قلق اور صدمہ نہ تھا لیکن جب میری زبان پر محبوبہ کا لفظ آیا۔ تب تو مونگیر کے قلعہ کیطرح لرزنے لگا جس کو ابھی زلزلہ نے کپکپا یا تھا۔ اور تیرے اندر سے مجھے آہوں کا دہواں اُٹھتا ہُوا نظر آیا جس طرح بہار میں زلزلہ کے وقت زمین کے اندر کی آہوں کا دہواں باہر آگیا تھا۔ اور میں نے تیرے رخساروں پر آنسو بہتے ہوئے دیکھے۔ جس طرح بہار میں زلزلہ کے وقت زمین رو ئی تھی۔ اور اس کے آنسو ندیوں نالوں اور دریاؤں کی طرح اُبل پڑے تھے۔

جی کو سنبھال اور دل کی بات سُنا۔ کیا خضرخان دیول دیوی کی محبت میں بہت بے قرار تھا؟ کیا دیول دیوی کی جُدائی کا رنج والم سلطنت اور آنکھوں سے بھی زیادہ اس کے لئے تکلیف دہ تھا؟ وہ کیونکر آہ کرتا تھا؟ اور اس کے اظہار غم کا کیا طریقہ تھا؟ کیا وہ خدا سے دُعائیں مانگتا تھا؟ کیا اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا؟ کیا اس کو رات بھر نیند نہ آتی تھی؟ اور کیا اس نے دن کے وقت بھی سونا چھوڑ دیا تھا؟ یہ بھی بتا کہ اس کے درد محبت کی کہانی سُننے کے لئے اس کے پاس کوئی مونس۔ کوئی ہمدم۔ کوئی غم خوار۔ اور کوئی محرم راز بھی تھا؟ وہ تو مسلمان تھا۔ اس کو ایک ہندو عورت سے اتنی محبت کیوں تھی؟ وہ ایک کوہستانی آدمی تھا۔ اس کو چمن ہندوستان کے مہکتے ہوئے نازک پھول کی قدر کس نے سکھائی تھی؟

ہاں میں سُن رہا ہوں۔ تو بیان کر۔ تیری آواز میرے کانوں میں آرہی ہے۔ اور میں اس کو دماغ کے ورق پر اور دل کے کاغذ پر تصور کے جیبی قلم سے لکھ رہا ہوں۔ تو بیان کر۔

خضرخان اپنے بھائی شادی خان کے ساتھ دہلی سے اندھا کرکے میری گود میں لٹایا گیا۔ وہ ہر وقت بیچین رہتا تھا۔ اس کو اپنی محبوبہ بیوی دیول دیوی کے فراق کا صدمہ رہتا تھا۔ وہ بہت کم سوتا تھا۔ اور وہ ہر وقت روتا تھا۔ اس کا محرم راز کوئی نہیں تھا۔ فقط اس کا بھائی شادی خان اس کو تسلی دیتا تھا۔ چند مہینے کی آہ و بکا فریاد وزاری اور دعاؤں کے بعد اس کے ستمگر بھائی قطب الدین خلجی کو رحم آیا۔ اور اس نے خضرخان کی ملکہ کو گوالیار بھیجدیا۔ اب تو ذرا اپنے دل کو سنبھال کہ میں قید خانہ کے ملاپ کو بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اور وہ ایسا دردناک ہے۔ کہ کوئی شخص اس کے سُننے کی تاب نہیں لاسکتا۔ میں پتھر اور چونے کا انبار ہوں۔ اور تیشہ زنی اور سوخت اور سوزش کی تکلیفوں کو جانتا ہوں۔ میرے پتھر جب پہاڑ سے کاٹے گئے۔ تو ان کے سروں اور کلیجوں پر ہتھوڑے پڑے تھے۔ اور جگر پر تیشے چلے تھے۔ اور چونہ بھی کئی رات دن آگ میں تپتا رہتا تھا۔ مگر اس تکلیف اور اذیت اور قدر جاننے کے باوجود میں تجھ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ خضرخان کی تکلیف چونے اور پتھر سے زیادہ تھی۔ اور جب اس کی مطلوبہ دیول دیوی قید خانہ میں اس کے پاس آئی۔ اور اس نے اپنے پتی اور اپنے ساجن اور سندر من موہن کو دیکھا۔ تو وہ سکتہ میں کھڑی رہ گئی۔ آج جو آوازیں میرے کانوں میں آتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عشق کا دیوتا اندھا ہوتا ہے۔ مگر میں ۶۵۰ برس پہلے دیکھ رہا تھا۔ کہ خضرخان اندھا کیوپڈ تھا۔ اور اس کی مظلوم ہستی کمان بن گئی تھی۔ اور تیر دیول دیوی کے سینے پر آرہے تھے۔ اور وہ ہندو دیوی اپنے شوہر کی محبت اور تکلیف اور بے کسی اور قیدی پن کو کھڑی دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اس کا کلیجہ خضرخان کی موجودہ صورت کو دیکھ کر ایسا ہی چھلنی ہو رہا تھا۔ جیسے محبت کے یا عداوت کے تیر کسی دشمن کا کلیجہ چھلنی کردیتے ہیں۔ خضرخان نے دونوں ہاتھ بڑھائے۔ اور صرف ایک لفظ اسکی زبان سے نکلا جس کا مطلب یہ تھا "تم کہاں تھیں؟"

دیول دیوی جواب نہ دے سکی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ بس خضرخان کی بات سنکر وہ روتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور اس نے خضرخان کے پھیلے ہوئے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور ہاتھ کی حرکت سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خضرخان بیٹھ گیا۔ اور دیول دیوی بھی بیٹھ گئی۔ مگر یہ ان دونوں پر مسلط تھا۔ اور وہ دونوں دیر تک بات نہ کرسکے اور ہچکیاں لیکر روتے رہے۔ آخر خضرخان نے مردانگی سے کام لیا۔ اور دیول دیوی سے بات شروع کی۔ دیول دیوی نے قطب الدین کے مظالم کا ذکر کیا۔ اور کہا۔ کہ تمہارے گوالیار بھیجنے کے بعد مجھ کو ایک علیحدہ مکان میں قید کردیا گیا۔ اور مختلف ذریعوں سے زور ڈالا گیا۔ کہ میں قطب الدین کی بیگم بننا قبول کروں۔ مگر میں نے کہدیا۔ کہ ہندو عورت ایک خاوند کے سوا دوسرے مرد کا مُنہ دیکھنا گوارا نہیں کرسکتی۔ البتہ جب اس کو مجبور کیا جاتا ہے تو وہ موت کا چہرہ دیکھنا قبول کرلیتی ہے۔ پس میرے لئے یا خضرخان ہے یا موت ہے۔ تیسری صورت اور کوئی نہیں ہے۔

سُنا ہے کہ اس کے صلاح کاروں نے بھی یہ رائے دی۔ کہ اگر دیول دیوی کو بیوی بنانے کا خضرخان کی زندگی میں ارادہ کیا گیا۔ تو ہندو رعایا باغی ہوجائے گی اور معلوم نہیں کیسی کیسی مشکلات پیش آئیں گی۔ اسواسطے قطب الدین نے مجھ کو تمہارے

تمہارے پاس گوالیار میں بھیجدیا۔

دوسرا ملاپ

چھ سو برس پہلے ایک ملاپ گوالیار کے قید خانے میں ہندو مسلمان محبت کرنے والوں کا ہُوا تھا۔ آج ویسا ہی دوسرا ملاپ ہو رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان بحیثیت قوم کے اور مذہب کے اور معاشرت کے الگ الگ ہیں۔ لیکن دونوں کی زبان ایک ہے۔ ایک اس کو ہندی کہتا ہے۔ اور دوسرا اس کو اُردو کہتا ہے۔ انگور ہندوستانی کے انگور ہے۔ عرب اس کا نام عنب کہنے سے انگور کی صورت اور سیرت میں کوئی فرق نہیں ہو جاتا۔ ایک لالٹین کے چار شیشے ہیں۔ ایک لال ہے ایک سبز ہے ایک اودا ہے اور ایک زرد ہے جس شیشے کے رُخ دیکھنے والے بیٹھے ہیں۔ وہ روشنی کا رنگ اپنی دید کے موافق بیان کرتے ہیں۔ سبز شیشے کے رُخ بیٹھنے والے کہتے ہیں۔ کہ روشنی سبز ہے۔ اور سُرخ شیشے کی جانب بیٹھنے والے لال روشنی بتاتے ہیں۔ مگر روشنی تو ہر رنگ سے آزاد ہے۔ ہندوستانی بولی کا نام ہندی یا اُردو مطلب ایک ہی ہے۔ کہ وہ ہم سب مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے۔ کیا ہندوؤں میں یہ طاقت ہے۔ کہ وہ آٹھ کروڑ انسانوں کی بولی کو بدل سکتے ہیں؟ اور کیا مسلمانوں میں یہ قوت ہے کہ وہ ہندی بولنے والوں کو اس سے روک دیں؟ مگر جس طرح خضر خان اور دیول دیوی کسی تیسرے سبب سے جُدا ہوئے تھے۔ ایسے ہی ہم دونوں بھی بولی اور زبان کے معاملہ میں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ مگر آج گوالیار کے شاہی قید خانہ میں ہم پھر ملاپ کرتے ہیں۔ اور اس تاریخی قلعہ کو گواہ بناتے ہیں۔ کہ ہم سچے دل سے ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔ آج ہندوؤں نے اُردو کی حمایت میں جلسہ کیا ہے۔ کل ہندی کے حمایت میں مسلمان ایسا ہی جلسہ کرینگے۔ دونوں قوموں کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اختلاف حروف کا ہے مفہوم کا نہیں ہے۔ اور یہ اختلاف بھی دور ہو سکتا ہے۔ اگر ہندو اردو حروف کو ایشیائی اور ہندوستانی پیداوار سمجھ کر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ تو مسلمان بھی ہندی حروف کو ہندوستانی یادگار سمجھ کر سیکھیں گے۔ اور اس کی مدد کریں گے۔ مقابلہ کرنے اور لڑنے سے نہ ہندی کو فائدہ ہو اردو کو۔ حضرت اکبر الہ آبادی نے اس خانہ جنگی کو ایک شعر میں خوب ادا کیا ہے ؎

وصل کی شب میں نے اس بُت سے لڑائی تھی زبان
یہ اثر اس کا ہُوا اُردو سے ہندی لڑ گئی۔

براہِ راست مصر سے:-

ادبِ فرعونی

چند نظموں کا ترجمہ

میں اپنی کشتی لیکر نہر میں اُترا۔

میرے کاندھے پر پھولوں کا ایک بڑا گلدستہ تھا۔ اور میں ناؤ کھیتا جا رہا تھا۔

جب میں منفیس پہونچونگا۔ تو سب سے پہلے اپنے معبود (فتاح) کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اُسی سے التجا کرونگا"۔ کہ اے میرے معبود آج شام کو مجھے میری بہن سے ملا دے"۔

"منفیس" اُس خوشبودان کے مُشابہ ہے۔ جو "الہ جمیل" کے قدموں کے نیچے رکھا جاتا ہے"۔

منفیس کی صبح میری بہن کے حُسن سے ملتی جُلتی ہے۔

اگر آج میں اُس سے نہ مل سکا تو گھر جا کر بیماروں کی طرح بستر پر لیٹ جاؤنگا۔

اِس لئے کہ میں مظلوم ہونگا۔

پڑوسی مجھے پوچھنے آئیں گے۔

کہینگے کیسی طبیعت ہے؟

اگر اُن کے ساتھ میری بہن بھی ہوگی تو وہ سب کا مضحکہ اُڑائیگی۔ طبیبوں پر ہنسے گی۔

کیونکہ تنہا وہی۔ میرا مرض پہچانتی ہے۔ اور میری دوا بھی!

ایک عاشقہ کی آرزو

آہ! میرے بھائی۔ کتنا پُرکیف ہوتا ہے وہ منظر!

جب تیرے ساتھ نہر میں اُترتی ہوں۔

اور تیرے سامنے اُس میں غسل کرتی ہوں۔

میں چاہتی ہوں۔ کہ اپنی تمام خوبصورتی تجھے اچھی طرح دکھاؤں۔

میرے جسم پر ایک کپڑا ہو نہایت باریک۔ پانی سے بھیگا ہُوا۔

میں نہر میں غسل کرتی ہوں۔ اور تو میرے سامنے ہو۔

میں چاہتی ہوں۔ کہ تیرے ساتھ پانی میں اُتروں۔ اور تیرے ساتھ پانی سے باہر آؤں کھلی فضا میں!

میرے ہاتھ میں ایک سُرخ مچھلی ہو حسن وجمال سے بھری ہوئی میری دونوں اُنگلیوں کے درمیان۔

ایک عاشق کی آرزو

اگر میں اُس کا حبشی غلام ہوتا۔ تو اُس کے پیچھے پیچھے چلا کرتا۔ اور اُس کے جمال کو دیکھہ سکتا۔

اگر میں اس کی مشاطہ ہوتا۔ تو اس کے تیل میں ڈوبے ہوئے سر کے کپڑے کو دھو سکتا۔

اگر اُس کی انگوٹھی ہوتا۔ جو ایک طلسم سے کسی طرح کم نہیں اور جو ہر وقت اُس کی انگلیوں سے مس ہوتی رہتی ہے۔ تو میں بیحد مسرور ہوتا کیونکہ مجھے اس کی خوبصورتی اور بڑھتی!

اے میری پیاری محبوبہ، تو چاند سورج، زمین، آسمان نور و ظلمت سب میں شک کر سکتی ہے۔

میں تجھے اجازت دیتا ہوں۔ مگر کبھی اپنے دل میں یہ خیال نہ آنے دے۔

کہ میں تجھ سے محبت نہیں کرتا۔　　　حافظ ابراہیم

اے میرے دوست تو چودھویں کا چاند ہے مگر اُس کے نور کو تجھ سے کیا نسبت یہ نور زیورِ عشق سے آراستہ ہے۔ اور وہ اس جوہر سے خالی۔

شوقی

میرا دل محبّت میں ایک کشتی کی مانند ہے کہ بہا چلا جاتا ہے کاش مجھے خبر ہوتی۔ کہ یہ شرابی نہر مجھے کہاں تک بہا لیجائے گی۔ اے نیل کے پھول بھرے باغو!

میرے دل کو محبت کرنا سکھاؤ خدا تمہیں محبت اور محبت والوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ باقی رکھے۔

جب شام ہو جائے۔ اور رات کے ستارے فضائے آسمانی پر بکھر جائیں،
تو رات سے معلوم کرتا۔ کہ میرا ستارہ کب چمکے گا۔
جب فضا میں ستارے موتیوں کی طرح بکھر جائیں۔ تو اُن سے معلوم کرتا کیا میرے محبوب کو کچھ میری خبر ہے۔
ہر ایک ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ چمکتا ہُوا نظر آتا ہے مگر میرا ستارہ اُفق آسمانی پر تنہا حیران و پریشان گردش کناں ہے۔
اے میرے محبوب میری رُوح تجھ پر نثار وہ ایک اُفق ہے جس پر تیرے انوار کا ظہور ہوتا ہے۔ میری روح تیرے انوار سے معمور ہے۔
جب ستارے نکلتے ہیں۔ تو میں فضا کی طرف پُر اُمید نگاہیں ڈالتا ہوں۔
مگر میری طرف کوئی ستارہ نہیں دیکھتا۔
اے رات کیا تو مجھ پر رحم کر سکتی ہے۔
میں نغمہ چھیڑوں اور میرا محبوب میری آرزو میرے سامنے ہو!

ایک قومی گیت

ہمارا جھنڈا اونچا رہے آسمان کی نگہبانی میں۔
زمینِ حرم زندہ باد۔ زندہ باد علم و روشنی کا گہوارہ، زندہ باد ہمیشہ رہنے والا ملک۔
مصر زندہ ملک زندہ دلوں کا ملک۔
ہمارا ملک ہمیشہ رہیگا۔ صاف آسمان کے نیچے پاک زمین پر۔
مصر میں تمام دُنیا کی نعمتیں ہیں۔ پُرسکون زمان و مکان۔
ہماری نیل بہتر پانی والی کوثر و سلسبیل سے بھری ہوئی جس نے ہماری رگوں میں وہ گرم خون دوڑایا جو دشمن کے لئے جہنم کا ایک شعلہ ہے۔
کل ہم اور آگے قدم بڑھائیں گے۔ ہمارے لئے ابدی زندگی ہے۔
ہمارا سورج ہمیشہ منور رہیگا۔
ہم سر بلند کرتے ہیں۔
اُونچا رہے ہمارا جھنڈا۔ زندہ باد وطن!!!

کلوپیٹرا

اے شریف بطالسہ کی بیٹی۔ کھربائی حسن، جناتی روح والی ملکہ،
جب ساحروں سے عبادت گاہیں بھر جائیں۔ اور دھونی سے ہوا معطر ہو جائے
جب رات کی تیرہ و تار فضا ساحروں کے جادو بھرے نغموں سے لرزنے لگے۔ تو تیری ہلکی سی جادو بھری نگاہ ان سب طلسموں کے توڑنے کے لئے کافی ہے۔

قربانگاہوں میں آگ روشن کیجاتی ہے معبودوں پر قربانیاں چڑھائی جاتی ہیں
تیرے ناری رُخساروں کی سُرخی عاشقوں کو دعوتِ قربانی دیتی ہے۔
تو بھی ایک معبودہ تھی۔ جس پر روشن دل قربان ہوتے تھے۔
کاش زمانہ پھر اپنے افسانوں کو دُہرائے۔

جب کشتیاں ترنم کرتی ہوئی چلتی ہیں۔ اور نیل بھی اُن کے ساتھ ہم نغمہ ہوتی ہے۔
جب مسافر پہاڑوں میں چلتے چلتے تھک کر نیم جان ہو گئے ہوں۔
سخت دھوپ اور گرمی ہو۔ پیاس سے ہونٹ سوکھ گئے ہوں۔
تو تیرے لبوں کی شراب کا ایک قطرہ اُن میں نئی رُوح ڈال دیتا ہے۔
کاش زمانہ پھر اپنے افسانوں کو دُھرائے۔

{ یہ قدیم مصری ادب کا نمونہ براہ راست مصر سے موصول ہوا ہے۔ }

ڈرامہ:-

مہمان

(از جناب حامد اللہ صاحب افسر بی اے، پروفیسر لکھنو)

پہلا منظر

شاپور اور گلنار دونوں میاں بیوی ایک مختصر مگر بہت آراستہ اور خوبصورت مکان میں رہتے تھے۔ خوش حال تھے۔ تعلیمیافتہ تھے۔ اور سماج میں بہت وقعت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ گلنار کی ایک سہیلی تھی شہناز اُس کا نام تھا۔ شہناز نے بہت ناز و نعم میں پرورش پائی تھی۔ اس کی تعلیم و تربیت بہت اعلیٰ پیمانہ پر ہوئی تھی۔ صرف دو سال ہوئے کہ اُس کی شادی ایک نہایت قدیم و شریف خاندان کے ایک تعلیمیافتہ نوجوان کے ساتھ ہوئی تھی۔ دونوں میں بہت محبت تھی۔ لیکن بدقسمتی سے شہباز کے خاوند کا انتقال ہوگیا۔

شہباز نے اپنے خاوند کے انتقال کے چند ہی روز بعد گلنار کو ایک خط لکھا کہ میں تمہارے پاس آکر کچھ وقت صرف کرنا چاہتی ہوں۔

شاپور اور گلنار ایک کمرے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ یہ کمرہ بہت آراستہ ہے۔ اس کے مغربی جانب والے دونوں کونوں میں چھوٹی چھوٹی میزوں پر تازہ پھولوں کے گلدستے رکھے ہوئے ہیں۔ ایک گلدستہ کمرے کے بیچ والے میز پر بھی رکھا ہے۔ میزوں کے میزپوش بہت خوشرنگ ہیں۔ اور ان پر ریشم سے رنگ برنگ کے پھول کاڑھے ہوئے ہیں۔ کرسیوں کے گدّوں پر جو کپڑا چڑھا ہوا ہے۔ وہ بھی خوشنما اور خوشرنگ پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ کمرے میں دیواروں پر جو تصویریں آویزاں ہیں وہ نظر کو خوشدلی اور مسرت کا پیام دینے میں کمرے کی اور چیزوں سے کم نہیں ہیں)

شاپور: گلنار! تم نے مجھے شہناز کا خط تو دکھایا ہی نہیں، آخر اُنھوں نے کیا لکھا ہے۔ وہ کس گاڑی سے روانہ ہونگی۔ اور یہاں کس وقت پہنچیں گی؟

گلنار: خط کیا کروگے دیکھکر، پنجاب میل سے آرہی ہیں اور کل صبح ۸ بجے یہاں پہنچیں گی۔ اُس غریب کا خط دیکھکر میرا تو دل قابو میں نہیں رہتا۔ خدا جانے اُس کے لفظوں میں کیا درد بھرا ہُوا ہے۔ کہ خط کے ہر نقطہ نے میری آنکھوں سے ہزارہا آنسو کھینچ لئے۔

شاپور: ہا! کیا کرے بیچاری، اُس کی تو زندگی ہی تباہ ہوگئی۔ اپنی مصیبت کی داستان بہت درد بھرے لفظوں میں لکھی ہوگی۔ ماں بچپن میں مرگئی تھی۔ باپ شادی کے چار مہینے بعد دنیا سے رخصت ہوئے۔ پورے دو برس شادی کو نہ ہوئے تھے۔ کہ خاوند بھی اس غریب کو دُنیا میں تنہا چھوڑ کر چلدیئے۔ گلنار میں نوشتۂ تقدیر کا قائل نہیں۔ مگر اس کو بدقسمتی نہیں کہیں گے۔ تو آخر کیا کہیں گے۔

گلنار: یہی باتیں تو ہیں جن کو دیکھکر تقدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اور خدا کی مرضی اور اسکی مصلحتوں پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ کل شام میں گھنٹوں اس کا خط لئے بیٹھی رہی۔ اور یہی سب باتیں سوچتی رہی۔ زندگی کتنی بے اعتبار ہے؟

شاپور: گلنار وہ خط کہاں ہے۔ میں بھی پڑھوں گا۔ بیچاری اب کس طرح زندگی گزارے گی۔ دُنیا اس کے لئے ایک بھیانک جنگل سے بھی زیادہ دہشتناک ہوگی۔

گلنار: خط اوپر والے کمرے میں چھوٹی میز پر رکھا ہے۔ میں لائے دیتی ہوں۔

شاپور: گلنار! خط میں تو شہناز نے کچھ لکھا نہیں ہے کہتی ہیں "تم سے ملے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں۔ کل صبح پہنچونگی۔ اور کچھ وقت تمہارے ساتھ گزاروں گی۔ تم تو کہتی تھیں۔ اُس کے لفظ لفظ میں درد بھرا ہُوا ہے۔ کیا وُہ اور کوئی خط ہے۔

گلنار: مردوں کا دل کیسا بے حس ہوتا ہے تمہیں اس خط میں کچھ نظر نہیں آتا۔ ذرا سوچو تو سہی کس مصیبت میں یہ خط اُس نے لکھا ہے۔ جب خط کا کاغذ اُس نے لکھنے کے لئے اُٹھایا ہوگا۔ تو اس کے دل و دماغ کی کیا حالت ہوگی۔ کیسے دردانگیز خیالات اُس کے دل میں گزر رہے ہونگے۔ وہ کس درجہ مایوس ہوگی۔ سوچتی ہوگی۔ اب دُنیا میں میرا کون ہے۔ میں کہاں جاؤں۔ کسکو

اپنے دُکھ درد کی داستان سناؤں۔ (رونے لگتی ہے)

شاپور۔ ہاں ہاں یہ تو میں جانتا ہوں۔ میں سمجھا تھا خط میں بھی شائد کچھ لکھا ہوگا۔ تم اپنی طبیعت خراب نہ کرو۔ دیکھو یہ نہ کرو۔ تمہاری صحت ٹھیک نہیں ہے۔

گلنار۔ پھر وہی کہے جاتے ہو۔ تم کیسے سخت دل ہو۔ خط میں کیا نہیں ہے؟ اُس کے حرف حرف سے انتہائی بے کسی کا عالم نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اُس نے خط لکھتے وقت دُنیا بھر پر نظر ڈالی ہوگی۔ ہائے شہناز! آج تو دُنیا میں بالکل اکیلی رہ گئی۔ تجھے ساری دنیا میں کوئی ہستی ایسی نہ ملی جس سے کچھ سہارے کی اُمید ہوتی۔ کچھ غمخواری اور دلدہی کی توقع ہوتی۔ بچپن کی محبت نے ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا ہوگا۔ اور میری طرف اشارہ کرکے کہا ہوگا۔ کہ "جا گلنار کے پاس جا۔ وہ تیرے غم میں شریک ہوگی۔ تیرا دُکھ بٹائے گی"۔ ایک مایوسانہ انداز کے ساتھ شہناز نے اپنے غم سے بھرے ہوئے دِل سے پوچھا ہوگا۔ اور پھر آہستہ آہستہ سوچا ہوگا۔ جیسے کوئی بھاری بوجھ دھیرے دھیرے گھسیٹتا ہے۔ اور پھر اسی طرح سوچتے سوچتے بالکل بے خیالی کے ساتھ بالکل بے خبری میں مجھے یہ خط لکھا ہوگا۔ اللہ! کیا دردناک خط ہے!

شاپور۔ (کچھ سوچتے ہوئے، کچھ جھینپتے ہوئے نیچے کی طرف دیکھ کر) تم ٹھیک کہتی ہو بڑا دردناک خط ہے۔

گلنار۔ خط ڈاک میں ڈلوا دینے کے بعد وہ پھر سوچتی رہی ہوگی۔ مگر اب کچھ تیزی کے ساتھ جیسے اُس وقت ہوتا ہے۔ جب کوئی بے خیالی میں بے سوچے سمجھے کسی سوتے ہوئے آدمی کو جگا دیتا ہے۔ اور پھر پچھتاتا ہے۔ بے چین ہوتا ہے۔ کہ میں نے یہ کیا کیا۔ پھر اُسے خیال آیا ہوگا۔ کہ میں نے لکھدیا ہے کہ میں پنجاب میل سے آرہی ہوں۔ اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا ہوگا۔ کہ میں نے یہ کیوں لکھدیا۔ اب وہ اور زیادہ تیزی کے ساتھ سوچنے لگی ہوگی۔ گھبراہٹ کے ساتھ سوچنے لگی ہوگی۔ جیسے اُس وقت ہوتا ہے۔ جب کسی کے ہاتھ سے اتفاقاً خود اپنے گھر میں آگ لگ جاتی ہے۔ اور نہ بجھانے بن پڑتی ہے نہ بھاگتے۔ اللہ! خط کے یہ دو فقرے کس قدر یاس سے بھرے ہوئے اور غم سے لبریز ہیں۔

شاپور۔ تم سچ کہتی ہو بڑا دردناک خط ہے۔

گلنار۔ اور پھر جب اُسے سفر کی تیاری کا خیال آیا ہوگا۔ اور اس نے اپنا ساڑیوں والا بکس کھولا ہوگا۔ تو اُس کے دل کا ایسا حال ہوگا۔ جیسے کوئی دریا میں ڈوب رہا ہو۔ اور کوئی صورت کنارے پر سلامت پہونچنے کی نہ ہو۔ اُس وقت بھی وہ سوچ رہی ہوگی۔ مگر سوچ نہ سکتی ہوگی۔ جیسے گھپ اندھیرے میں اونچے نیچے اور ناہموار راستہ پر کوئی چل رہا ہو۔ اور چل نہ سکتا ہو۔ وہ فیصلہ نہ کر سکتی ہوگی۔ کہ میں کیا پہنوں۔ کونسی ساڑھیاں سفر کے لئے لیجاؤں۔ وہ بے چینی کے ساتھ پچھتا رہی ہوگی۔ کہ میں نے وہ خط کیوں لکھدیا۔ اور پچھتا بھی نہ سکتی ہوگی۔ ہائے کیسی بے بسی اس خط سے ٹپکتی ہے!

شاپور۔ تم نے ٹھیک کہا۔ اس خط سے بڑی بے بسی ٹپکتی ہے۔ گلنار اب اُٹھو، اوپر اپنے کمرے میں جاکر کسی کتاب سے جی بہلاؤ۔ میرے کورٹ جانے کا وقت آگیا۔ اب مجھے جانا چاہیئے۔

گلنار۔ ہاں تم جاؤ۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔

دوسرا منظر

(وہی آراستہ پیراستہ کمرہ ہے۔ شام کا وقت ہے۔ چار کے بعد شاپور اور گلنار بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں)

شاپور۔ تو شہناز کل صبح دس بجے تک یہاں پہونچ جائیں گی۔

گلنار۔ ہاں گاڑی ساڑھے آٹھ بجے آتی ہے۔ مگر دیکھو، یہ گلدستے میزوں پر سے ہٹا دینے چاہئیں۔

شاپور۔ کیوں اُنہیں کیوں ہٹاتی ہو۔ گلدستے میزوں پر رہنے دو۔ یہ تو اچھے لگتے ہیں۔ ان سے تو اور دِل بہلے گا۔

گلنار۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ گلدستوں سے اُس کا دل بہلے گا۔ یا اُس کے دل پر آرے چلیں گے۔ پھول مسرت کی نشانی ہیں۔ عشرت کا پتہ دیتے ہیں۔ حسن کے، شادمانی کے، محبت کے پیامبر ہیں۔ تمناؤں کے چھوٹے چھوٹے جواہر ریزے ہیں۔ اُمید کے لفظ ہیں۔ ان کو دیکھ کر اُس کا دل پاش پاش ہو جائے گا۔ اُسے اپنی شادی کا دن یاد آئے گا۔ وہ جس کو دُنیا میں کوئی اُمید نہیں رہی۔ جو مایوسی کا مجسمہ ہے۔ یاس کی تصویر ہے۔ ان کو دیکھ کر تڑپ جائے گی۔ شہناز میرے پاس اس لئے نہیں آرہی ہے۔ کہ میں اُس کو اور دُکھ دوں۔ ستاؤں۔ اُس کے زخموں کو اور گہرا کرکے ان پر نمک

پھولوں نہیں یہ گلدستے یہاں سے ہٹائے جائیں گے۔

شاپور۔ گلنار! پھول تو دلی خیر مقدم کی نشانی ہیں۔ پھولوں کا یہاں نہ ہونا ایسا ہی ہوگا۔ جیسے خیر مقدم کے وقت چہرے پر مسکراہٹ کا نہ ہونا۔

گلنار۔ بے شک شہناز کا خیر مقدم اس وقت مسکراہٹ سے نہ ہونا چاہیئے ہم یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتے کہ ہم اِس قدر وحشی ہیں۔ اس قدر جنگلی ہیں کہ اپنے عزیز ترین دوستوں کے جذبات کا ذرا بھی خیال نہیں رکھ سکتے۔ دلداری اور ہمدردی اور دلسوزی اور غمخواری کا تقاضا یہی ہے۔ کہ جتنی چیزیں مسرت وشادمانی کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ سب کمرے سے ہٹا دی جائیں۔

شاپور۔ میں عورتوں کے جذبات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا۔ اور نہ میں شہناز کے اندازِ طبیعت سے زیادہ واقف ہوں۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ اِن چیزوں کو دیکھ کر اُنھیں تکلیف ہوگی۔ تو ضرور اُنھیں کمرے سے ہٹا دو۔

گلنار۔ ہاں جتنی چیزیں مسرت شادمانی اور خوشدلی کا پتہ دیتی ہیں وہ سب اس کمرے سے ہٹا دینی چاہئیں۔ ورنہ اُسے رنج ہوگا۔ اُسے تکلیف پہونچے گی۔ یہ میز پوش بہت شوخ رنگ کا ہے اِسے بدل دینا چاہیئے۔

شاپور۔ اور یہ تصویریں، اگر گلدستے ہٹاتی ہو میز پوش بدلتی ہو۔ تو یہ تصویریں ضرور اتروا دو۔ اس کمرے کی ہر تصویر نظر کو خیال کو عیش ومسرت کی دعوت دیتی ہے۔

گلنار۔ ہاں تم نے ٹھیک کہا۔ یہ تصویریں بھی ضرور اتروا دی جائیں۔ اور یہ دروازوں کے پردے بھی ہٹا دو۔ یہ رنگین پھولدار پردے اس موقع کے لئے نہیں ہیں۔

شاپور۔ گلنار ایک بات اور یاد آئی۔ شہناز سے ہم لوگ جو باتیں کریں گے۔ اُن کا انداز بھی تو ہمیشہ کی طرح نہ ہونا چاہیئے۔ باتوں میں ضرور خیال رکھنا چاہیئے کہ کہیں اُن کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔

گلنار۔ تم نے خوب یاد دلایا۔ میرا خیال تو یہ ہے۔ کہ جہانتک ہو سکے باتیں بہت کم کرنی چاہئیں۔ وہ غریب خود زیادہ نہ بولے گی۔ تمہیں یاد ہے شہناز کتنی کم گو ہے۔ اور اب تو وہ شائد بالکل ہی خاموش ہوگی۔ ہاں ایک بات اور یاد آئی، میں ذرا جاکر پڑوس میں بیرسٹر صاحب اور ڈاکٹر صاحب کے ہاں کہہ آؤں۔ کہ وہ ایک روز اپنے بچوں کو ہمارے ہاں نہ آنے دیں۔ اور خود بھی آئیں تو ذرا مہمان کے جذبات کا خیال رکھیں۔

شاپور۔ ہاں ضرور جاؤ۔ یہ سب سے زیادہ ضروری کام ہے۔

تیسرا منظر

(اگلے دن صبح کا وقت ہے۔ وہی کمرہ ہے۔ مگر اب آراستہ نہیں ہے۔ نہ گلدان ہیں۔ نہ پردے۔ میزوں پر سفید میز پوش ہیں۔ تصویریں سب اُتار لی گئی ہیں۔ گلنار اور شاپور انتظار میں بیٹھے تھے۔ کہ پورٹیکو میں گاڑی آکر رکتی ہے۔ گلنار خیر مقدم کے لئے آگے بڑھتی ہے۔ مگر آبدیدہ اور غمگین، شہناز گاڑی سے اُترتی ہے۔ نہایت زرق برق لباس زیب تن کئے ہے)

شہناز۔ (زور سے ہنستے ہوئے) گلنار! بہت دبلی ہو رہی ہے۔ کیا کچھ کھانے کو نہیں ملتا۔ کیوں بولتی کیوں نہیں کیا کچھ طبیعت ناساز ہے؟

گلنار۔ نہیں طبیعت تو ٹھیک ہے۔ سفر میں تکلیف تو نہیں ہوئی؟

شہناز۔ تکلیف؟ سفر میں تکلیف کیسی۔ بہن! آجکل تو سفر دلچسپی اور تفریح کا ذریعہ ہے۔ ہمارے درجہ میں ایک بڑی دلچسپ بیگم بیٹھی تھیں۔ ان کی ہر حرکت ایک مجسم لطیفہ تھی۔ میں تو سارے رستے ان کی باتوں پر ہنستی چلی آئی۔ اوہو! شاپور صاحب تسلیم۔ یہ آج آپ اس قدر چپ چاپ کیوں ہیں۔ کہوں بھئی کیا ہمارا آنا آپ لوگوں کو اچھا نہیں لگا۔

گلنار۔ واہ اچھا نہ لگنے کی خوب کہی۔ ہم تو کئی روز سے تمہارا انتظار کر رہے تھے

شاپور۔ ہم ابھی بیٹھے ہوئے آپ ہی کا ذکر کر رہے تھے۔

شہناز۔ اور یہ کمرے کا کیا حال کر رکھا ہے۔ کیا مکان کی مرمت ہو رہی ہے؟

گلنار۔ ہاں کچھ اس کی سجاوٹ کا ڈھنگ بدلنے کا ارادہ ہے۔

شہناز۔ کیا چاء تیار ہے۔ میں نے ابھی تک ناشتہ نہیں کیا ہے۔

گلنار۔ ہاں چاء تیار ہے، چلو برابر والے کمرے میں چلو۔ وہیں چاء پئیں گے۔

شہناز۔ آج تمہاری چاء پر مٹھائی نہیں ہے۔

گلنار۔ مگر تم کو تو مٹھائی کا زیادہ شوق نہیں ہے۔

شہناز۔ واہ کیوں نہ ہوتا۔ پہلے ذرا کم مٹھائی کھاتی تھی۔ اب تو بہت شوق ہے۔

گلنار۔ میں ابھی مٹھائی لائے دیتی ہوں۔ تم خوب سیر ہو کر کھاؤ۔

شہناز۔ گلنار کیرم منگاؤ۔ چاء پی کر کھیلیں گے۔

گلنار۔ ابھی منگاتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں منگا ہوا گیا ہے۔

شہناز۔ اور ڈاکٹر صاحب کے بچوں کو بھی بلاؤ۔ بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج بچے ہیں۔

شاپور۔ مگر بڑے شریر ہیں، اس قدر شور مچاتے ہیں۔ کہ خدا کی پناہ،

شہناز۔ شرارت تو بچوں کا زیور ہے۔ اور شور و غوغا زندہ دلی کی علامت۔

گلنار۔ شہناز! تم نے تو کیرم کی خوب مشق بڑھا لی ہے۔ کسی کو جیتنے ہی نہیں دیتیں۔

شہناز۔ بھئی تم لوگ کیرم ٹھیک نہیں کھیل سکتے۔ اب کوئی اور کھیل کھیلو۔ تاش لاؤ۔

گلنار۔ تم تو کبھی تاش کھیلتی نہیں تھیں۔

شہناز۔ اب تو کھیلتی ہوں۔

گلنار۔ خدا کی پناہ، شہناز، کیا جادو جانتی ہو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا۔

شہناز۔ بھئی اب شام ہو گئی۔ چلو سینما چلیں گے۔

شاپور۔ آج تو شائد کوئی اچھا فلم نہیں ہے۔

شہناز۔ کیا ہرج ہے۔ تھوڑی بہت دلچسپی تو ہو ہی جائے گی۔

گلنار۔ نشاط میں چلو وہاں شائد دیوکا رانی کا فلم ہے۔

شہناز۔ دیکھو گلناز! جہاں کہیں آدمیوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ وہ جگہ کیسی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں اسوقت کیسی چہل پہل ہے۔

(فلم کے گانے کی آواز آتی ہے۔ ایکٹروں کی گفتگو کی آواز سنائی دیتی ہے۔ باجے بجتے ہیں۔ تماشائی تالیاں بجاتے ہیں۔)

(بازار کے سودے والوں کی آوازیں۔ تانگوں اور موٹروں کے گزرنے کی آوازیں)

شہناز۔ گلنار یہ کس راستے سے نکل آئے۔ بہت ہی جلد گھر پہنچ گئے۔

گلنار۔ نہیں تو اچھا خاصہ پھیر کر آئے ہیں۔

شہناز۔ اب تو کچھ تکان سی معلوم ہو رہی ہے۔

گلنار۔ ہاں شہناز۔ اب تم آرام کرو۔ تمہارا بستر اوپر والے کمرہ میں لگایا گیا ہے۔

شہناز۔ اور تم کہاں سوؤ گی۔

گلنار۔ میں نیچے والے کمرے میں سوؤنگی۔ کہوں کیا تم یہ جانتی ہو۔ کہ میں بھی تمہارے ہی کمرے میں سوؤں۔

شہناز۔ نہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں یوں ہی پوچھ رہی تھی۔

گلنار۔ اچھا خدا حافظ۔

شہناز۔ خدا حافظ۔

چوتھا منظر

(اگلے دن صبح کا وقت ہے۔ شہناز۔ گلنار اور شاپور نیچے پورٹیکو کے پاس والے برآمدے میں بیٹھے ہوئے چاء پی رہے ہیں۔ اور رات والے فلم کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے)

شہناز۔ دیوکا رانی کی اداکاری طربیہ میں اپنے کمال پر ہوتی ہے۔

شاپور۔ میرا خیال تو یہ ہے۔ کہ دیوکا رانی حزنیہ کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

گلنار۔ کل جوگن کے لباس میں وہ بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔

شاپور۔ مگر تم نے یہ بھی دیکھا۔ کہ جس وقت اس کا خاوند ملتا ہے۔ تو اس کا چہرہ بالکل نہیں بدلتا۔

گلنار۔ چہرہ کیونکر بدلتا۔ کیا وہ اپنے خاوند کو دیکھ کر کلیانی دیوی کے بجائے کوئی اور بن جاتی؟

شاپور۔ کوئی اور کیوں بن جاتی، میرا مطلب یہ ہے۔ کہ اتنی مدت کے چھوٹے ہوئے خاوند کے ملنے سے قدرتی طور پر کلیانی کے جذبات کی جو کیفیت ہونی چاہیئے تھی، اُن کا اثر اُس وقت اس کے چہرہ پر بالکل نہ تھا۔

(اس وقت شہناز کے چہرہ پر کچھ گھبراہٹ، کچھ پریشانی کے سے آثار نمایاں تھے شائد اس گفتگو نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا۔ اور وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی) اسی اثنا میں ایک فقیر ذیل کی غزل گاتا ہوا پورٹیکو میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

فقیر:

روتی ہے شبنم کہ نیرنگِ جہاں کچھ بھی نہیں ۔۔۔ خندہ زن ہے گل کہ نیرنگِ جہاں کچھ بھی نہیں
ہستیٔ رنگِ گلستانِ جہاں کچھ بھی نہیں ۔۔۔ چیختی ہیں بلبلیں گل کا نشاں کچھ بھی نہیں
جوڑ سارے توڑ ڈالے باندھ کر بندِ کفن ۔۔۔ گور کی تنگی سے چت ہیں پہلواں کچھ بھی نہیں
تخت والوں کا پتہ دیتے ہیں تختے گور کے ۔۔۔ کھوج ملتا ہے یہیں تک بعد ازاں کچھ بھی نہیں
جن کے محلوں میں ہزاروں رنگ کے فانوس تھے ۔۔۔ جھاڑ اُن کی قبر پر ہیں اور نشاں کچھ بھی نہیں

(شہناز کے منہ سے ایک ہلکی سی آہ نکلی اور وہ فرش پر گر پڑی۔ فقیر گاتا رہا)

گلنار۔ (شہناز کا سر اپنی گود میں لے کر) گلاب کے عرق کی بوتل اُٹھا لاؤ۔ منہ پر چھینٹے دینے سے ہوش آ جائے گا۔

شاپور۔ یہ انہیں کیا ہو گیا، ذرا دیکھنا سانس کا کیا حال ہے منہ پر ہاتھ رکھ کر دیکھو۔

گلنار - مجھے تو بالکل سانس چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی - جلدی سے ڈاکٹر کو بلاؤ -

شاپور - میں نے تمہارے کہنے سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب کو ٹیلیفون کر دیا ہے - وہ آتے ہی ہونگے -

گلنار - شہناز پیاری بہن ، یہ تمہیں کیا ہوگیا - ذرا تم نبض تو دیکھو -

شاپور - نبض تو بالکل چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی - خدا خیر کرے - لو ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے -

ڈاکٹر - یہ ہوا کیا ؟

گلنار - کچھ بھی نہیں - بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں - یکایک خاموش سی ہوگئیں - پھر بیہوش ہو کر فرش پر گر پڑیں -

ڈاکٹر - مگر اب تو ان کو دنیا سے رخصت ہوئے آدھ گھنٹہ سے زیادہ ہوگیا ہے -

"اُردو کا مستقبل"

از جناب آنند نرائن مُلا کی یہ تقریر ان ہی دنوں لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے براڈ کاسٹ ہوئی

کسی زبان کے مستقبل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا آسان کام نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ موجودہ رجحانات کی بنا پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اپنے زمانے کے مستقل رجحانات کو پہچاننے کے لئے اور یہ سمجھنے کے لئے کہ ان میں سے کون اگلی منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ اور کون محض نقش سراب ہیں۔ ایک باریک بین نظر کی ضرورت ہے۔ زبان قوم کی معاشرت اور تمدن کا ایک آئینہ ہوتی ہے۔ لہذا اس کے مستقبل پر غور کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے۔ کہ ہمارے ذہن میں آج سے پچاس سال آئندہ کی زندگی کا ایک خاکہ موجود ہو۔ میرے ذہن میں جب اُردو کے مستقبل کا خیال آتا ہے۔ تو سب سے پہلے پچاس برس آئندہ کے ہندوستان کی تصویر نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ اور پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس تصویر میں اُردو کس جگہ ہے۔ اور کس رنگ میں ہے؟ اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ آج اُردو کی رگوں میں ایک نیا خون دوڑ رہا ہے۔ اور اس کے جسم میں ایک نئی رُوح پھونکی جا رہی ہے۔ اُردو ادب کو موجودہ زمانہ کا ایسا زرّیں دور کبھی نصیب نہیں ہُوا۔ سوال صرف یہ ہے کہ آیا یہ تجدید زندگی کا پیام ہے یا چراغ کے بجھنے کی پیشتر والی آخری بھڑک۔ اس سوال کا جواب مشروط طریقہ پر دیا جا سکتا ہے۔ اگر اُردو نے ہندوستان کا مستقبل سنوارنے میں نمایاں حصّہ لیا۔ تو کوئی طاقت اس کو مٹا نہیں سکتی۔ لیکن اگر اس نئے زندگی کی حقیقتوں کی ترجمانی میں اسی طرح کمی کی جیسی کہ آج تک کی ہے۔ تو اس کو مٹ جانے سے نہ میر و غالب کی غزلیں بچا سکتی ہیں۔ نہ انیس کے مرثیئے اور نہ اقبال کی نظمیں۔ قرائن تو یہی بتا رہے ہیں۔ کہ کشتیٔ اُردو کے موجودہ کھینے والے وقت کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔ اور اپنی ذمہ داری پورے طور پر محسوس کرنے لگے ہیں۔ اتنا تو بغیر نجوم جانے ہوئے بھی بتایا جا سکتا ہے۔ کہ آج اُردو زبان پھر اپنا چولا بدل رہی ہے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں یہ ہندی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں اس نے اپنا نام ریختہ رکھا۔ انیسویں صدی میں یہ اُردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ اور تمام آثار یہی بتا رہے ہیں۔ کہ بیسویں صدی کے آخر تک اس کا نام ہندوستانی ہو جائے گا۔ اور اسی نام سے یہ ہندوستان کی زبانِ عام بنے گی۔ آج بھی یہ اس نام سے پکاری جانے لگی ہے۔ اور جو تبدیلیاں کہ اس میں رفتہ رفتہ آتی جا رہی ہیں۔ وہ اہلِ نظر سے چھپی نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ سیاسی مصلحت سب میں زائد اس تبدیلی کی ذمہ دار ہے۔ لیکن اگر قومی مطالبہ کو نظر انداز بھی کر دیا جائے۔ تو بھی ہماری موجودہ معاشرتی زندگی میں خود ایسی صورتیں نمودار ہو رہی ہیں۔ جن سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستانی ہی آئندہ زمانے کی ملکی زبان ہوگی۔ آل انڈیا ریڈیو ہی کو لے لیجئے۔ اس نے اپنی تقریروں کے لئے ہندوستانی ہی کو پسند کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ میرے ایسے چند بولنے والے ابھی صحیح معنی میں ہندوستانی بولنے سے قاصر ہیں۔ لیکن جو گھڑی گھڑی ہدایت ان کو کی جاتی ہے۔ وہ رفتہ رفتہ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آج اگر اثر نہیں ہوا تو کل ہوگا۔ کل نہیں ہُوا تو پرسوں ضرور ہوگا۔ اور اس طرح جو فرق کہ ہندی اور اُردو میں پیدا ہو گیا ہے۔ وہ بہت کچھ زائل ہو جائے گا۔ اور چونکہ یہ زبان ملک کے گوشہ گوشہ میں سُنی جاتی ہے لہذا سادہ ہندوستانی کو رواج دینے کے لئے ایک بہت زبردست طاقت ثابت ہوگا۔ لیکن ہندوستانی زبان کی تبلیغ و اشاعت آل انڈیا ریڈیو سے بھی زیادہ بڑی ایک طاقت کر رہی ہے۔ اور وہ ہندوستانی فلمیں ہیں۔ ریڈیو کے آواز کے مقابلہ میں ٹاکیز کی آواز بہت زیادہ کانوں تک پہنچتی ہے۔ اور چونکہ ان کی بنیاد تجارتی اصول پر ہے۔ لہذا ان کے لئے لازمی ہے۔ کہ وہ ایسی زبان استعمال کریں۔ جو زیادہ سے زیادہ عام فہم ہو۔ خود انشا پردازوں کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی اکاڈمی اور ترقی پسند مصنفوں کی انجمن کی کوششیں بھی ایک حد تک اپنا اثر ڈال رہی ہیں۔ اور یہ تو اب ایک اندھے کو بھی نظر آ رہا ہے۔ کہ ہندوستان کی زبان مستقبل کا نام

ہندوستانی ہوگا۔ دوسرا سوال جو اس سے کہیں زیادہ اہم اور پیچیدہ ہے۔ اور جس کا جواب دینا بہت دشوار ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس ہندوستانی زبان کا انداز تحریر کیا ہوگا۔ کانگریس کی مجلس انتظامیہ نے تو ابھی تک یہ طے کیا ہے۔ کہ اُردو اور ناگری دونوں اس زبان کے حروف میں لکھی جائے۔ لیکن اس رائے پر نظر ثانی ضرور کرنا پڑے گی۔ ایک زبان کے خصوصاً ایسی زبان کے جو ابھی بالکل ناکمل ہے۔ اور جس کو علمی زبان بنانے کے لئے ابھی ہزاروں اصطلاحیں وضع کرنی ہیں۔ دو طرز تحریر نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ زبان کی توسیع کا دار و مدار ایک حد تک اسی پر ہوتا ہے۔ آج اُردو اور ہندی کا سارا جھگڑا script کی وجہ سے ہے۔ ہندی میں اتنے بھاشا اور سنسکرت کے الفاظ کیوں استعمال کئے جاتے ہیں؟ script کی وجہ سے۔ اُردو میں فارسی اور عربی ترکیبوں کی کیوں بھرمار ہے؟ script کی وجہ سے لہذا اگر اُردو اور ہندی کا فرق مٹانا ہے۔ اور ایک عام زبان کی بنیاد ڈالنی ہے۔ تو یہ دونوں script چھوڑنا پڑیں گے۔ میرے نزدیک تو اس ہندوستانی زبان کو رومن script مجبوراً اختیار کرنا پڑیگا۔ قومیت کا جذبہ ظاہر ہے۔ کہ اسے خوشی خوشی قبول نہ کریگا۔ لیکن اس کے فوائد اتنے بے شمار ہیں۔ کہ وہ نظر انداز نہ کئے جا سکیں گے۔ ہندوستانی زبان Roman script اختیار کئے ہوئے مغربی زبانوں کے ہزاروں الفاظ کچھ تو بجنسہ اور کچھ تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ ہماری زبان میں آسانی سے گھل مل جائیں گے۔ بلکہ ہمارے انشا پردازوں کی ذہنی پستی بھی بہت کچھ دُور ہو جائے گی۔ موجودہ زمانے میں دُنیا کے اہم مسائل سمجھنے کے لئے کم سے کم ایک مغربی زبان کا بخوبی جاننا نہایت ضروری ہے۔ اور جو لوگ محض فارسی اور عربی جانتے ہیں۔ وہ رفتار زمانہ سے قریب قریب بیگانہ ہو چکے ہیں۔ جون ۱۹۳۵ء میں مغربی انشا پردازوں کا ایک بین الاقوامی جلسہ پیرس میں ہُوا تھا۔ جن موضوعات پر بحث ہوئی تھی۔ ان میں سے چند پیش کرتا ہوں۔ سنیئے۔ عظمت خیال۔ اہل فن کی آزادی کی نوعیت یعنی اصناف سخن پر تبدیلی معاشرت کا اثر اظہار خیال کے لئے نئے اصلاحی ذرائع۔ میں ترقی پسند مصنفین کی جماعت کے علاوہ کسی اور ادبی انجمن کو اس قسم کے مسائل پر غور کرتے ہوئے نہیں دیکھتا۔ اور میرا خیال ہے۔ کہ ہمارے اکثر ادیب ان پر رائے دینا تو دُور رہا ان کے مطلب کو بھی پورے طور پر نہ سمجھ سکیں گے۔ اس کمی کو پُورا کرنے کے لئے بھی رومن script کا اختیار کرنا بہت کارآمد ثابت ہوگا۔ کیونکہ مغربی علوم و فنون کی دولت اس سے زائد آسان طریقہ سے حاصل نہیں کیجا سکتی۔ ٹرکی کی مثال آنکھوں کے سامنے موجود ہے۔ کیا ٹرکی میں جذبۂ قومیت ہندوستان سے کم ہے؟ فارسی جدید میں بھی اس کثرت سے مغربی زبانوں کے الفاظ موجود ہیں۔ کہ ہمارے ہندوستان کی گلستان بوستان پڑھنے والے فارسی داں فارسی جدید کو سمجھ نہیں سکتے۔ اقبال کی فارسی شاعری پر اہل فارس یہی اعتراض کرتے ہیں۔ کہ وہ سعدی کی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ سوال یہ کیا جائیگا۔ کہ اگر فارسی بغیر script تبدیل کئے ہوئے مغربی زبانوں سے فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ تو ہندوستانی ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟ اول تو ہندوستانی زبان کا بحیثیت زبان کے فارسی سے کوئی مقابلہ نہیں۔ اس کے علاوہ ایران میں اُردو ہندی کا جھگڑا بھی نہیں تھا۔ اور نہ وہاں کوئی مغربی زبان اس طرح رائج تھی۔ جیسے کہ انگریزی ہندوستان میں ہے۔ اس کے علاوہ طباعت اشاعت اور بین الاقوامی معاملات میں جو آسانیاں رومن کی وجہ سے ہونگی۔ وہ ظاہر ہیں۔ لہذا میرا تو یہی خیال ہے۔ کہ ہندوستانی زبان کو Roman script اختیار کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن آئندہ کی اُردو میں محض نام اور script ہی کی تبدیلی ہو گی۔ بلکہ زبان کا مزاج بھی تبدیل ہو جائیگا۔ ابھی تک اُردو نے محض شاہی درباروں اور روساء کی محفلوں میں پرورش پائی ہے۔ لیکن بیسویں صدی کے انقلاب پسند مزاج سے جو زندگی کی کایا پلٹے دے رہا ہے۔ زبان بھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اور اس میں اب فقط محلوں کے سُریلے نغموں کی گنجائش نہیں۔ بلکہ عام بازاروں کی کرخت آوازیں بھی شامل ہونگی۔ وہ ادبی حلقے جنہوں نے زبان کو صرف اپنی تفریح کے لئے بائیں باغ سمجھ رکھا ہے۔ اور جن کی نظریں ابھی خواب خیال کی مصنوعی دنیا کے نقش و نگار میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ ان کا آخری وقت آگیا ہے، جس زبان میں عوام کے جذبات اور خیالات کا اظہار نہ ہو۔ وہ بے روح ہے۔ زبان کو زندگی کی ترجمانی کرنا ہی پڑے گی۔ اور ہندوستان کو عوام کی زبان بننا ہی پڑے گا۔ اس تبدیلی میں زبان کی بہت سی نفاستوں اور نزاکتوں کا خون کرنا پڑے گا۔ جو غیر مقامی رنگ اب اُردو پر حاوی ہے۔ اس کو مٹانا پڑے گا۔ آج اُردو کی حالت Pisa کے جھکے ہوئے مینار کی سی ہو گئی ہے۔ اس پر اور تعمیر کی گنجائش نہیں۔ تعمیر کرنے والوں کو تعمیر کرنے سے پہلے اس مینار کی کئی ایک منزلیں گرانا پڑینگی۔ جن لوگوں نے یہ منزلیں بنائی ہیں۔ یا جو ان میں رہتے ہیں ظاہر ہے۔ کہ وہ اپنی بساط بھر اس کے خلاف اپنی آواز صرف بلند کریں گے۔ لیکن قومیت کا تقاضہ رد نہ کیا جا سکے گا۔ ممکن ہے کہ ہم کو میرؔ اور سوداؔ یا اس سے بھی پیشتر کی زبان تک واپس جانا پڑے۔ اور وہاں سے زبان کو مقامی رنگ دے کر از سر نو تعمیر کرنا پڑے۔ مزاج زبان کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ

رنگ کلام میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہوگی۔ چونکہ حقیقت نگاری پر ادب کا دارومدار ہوگا۔
لہٰذا وہ اصنافِ سخن جن کی بنیاد و بناوٹ اور تکلف پر ہے۔ رفتہ رفتہ متروک ہو جائینگے
نظم کے مقابلہ میں نثر کیطرف زیادہ توجہ کیجائیگی۔ اور افسانہ نگاری سب سے زیادہ
کامیاب صنفِ سخن ثابت ہوگی۔ نظم میں بھی نئی نئی بحریں نئے نئے بند اور نئے نئے
اوزان تلاش کئے جائیں گے۔ اُردو اور ہندی کے جھگڑے میں ہندی کی بہت بڑی
جیت یہی ہے۔ کہ ہندی میں گانے اور گیت موجود ہیں۔ جو کہ گاؤں گاؤں گائے جاتے
ہیں۔ اور اس طرح ہندی زبان کا عوام سے ایک مضبوط رشتہ قائم ہے۔ اُردو نے
عوام سے ہمیشہ بے نیازی برتی۔ اور اہلِ فن نے عام فہم زبان میں کوئی ایسے ترانے
نظم نہیں کئے۔ جو عوام کی معاشرتی زندگی کا جزو بن جاتے۔ لیکن ہندوستانی زبان
میں ایسے ترانے بکثرت نظم کئے جائیں گے۔ اور حفیظ جالندھری۔ ساغر نظامی۔
اور مقبول احمد احمد پوری اس مقبول صنف کے موجد قرار دیئے جائیں گے۔ میں پہلے
کہہ چکا ہوں۔ کہ مصنوعی باتوں کی ہندوستانی ادب میں قدر نہ ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ
ہوگا۔ کہ قصیدہ گوئی قریب قریب بالکل متروک ہو جائیگی۔ اور غزل گوئی میں بھی بہت
کمی آجائیگی۔ شاعروں کے یہاں غزلیں ملیں گی۔ مگر نظموں کے مقابلہ میں بہت کم
غزلوں میں جذبات نگاری سے کام لیا جائیگا۔ اور اشعارِ غزل میں غالباً ایک تسلسل
بھی ہوگا۔ عشق و محبت کا ذکر ہوگا۔ لیکن اس جھولا نہ اور گریہ و زاری کرنے والے
عشق کا جس سے اُردو کے دیوان بھرے پڑے ہیں۔ خاتمہ ہو چکا ہوگا۔

غزلوں کی سرد بازاری مشاعروں کے لئے تیز زہر ثابت ہوگی۔ اور رفتہ رفتہ یہ
محض ادبی یادگار بنکر رہ جائیں گے۔ اس کے یہ معنی نہیں۔ کہ شعرا اپنا کلام نہیں سنائیں
گے۔ لیکن یہ رات رات بھر کی نشستیں اور یہ طرح پر قافیہ پیمائی یقیناً ختم ہو جائے گی۔
ادبی انجمنوں کے سلسلہ میں ممکن ہے۔ کہ چند برگزیدہ شاعر اپنا کلام بھی سنائیں۔
لیکن عام طور پر ایک شاعر کا ادبی دنیا سے تعارف رسالوں کے ذریعہ ہوا کرے گا۔
اس بات کا ایک مفید نتیجہ تو یہ نکلے گا۔ کہ شاعروں کی حشرات الارض والی جماعت ختم ہو
جائے گی۔ استادی اور شاگردی بھی نہ رہے گی۔ اور محض چند فطری شاعر رہ جائیں
گے۔ آئندہ زمانے کے شاعر کے لئے ایک عالی دماغ ادیب ہونا بھی لازمی ہوگا
اور فقط ایک مشتاق دماغ کی بنا پر کوئی شاعر نہ بن سکے گا۔ لیکن جو چیز کہ ہر صنفِ سخن پر
حاوی رہے گی۔ وہ حقیقت نگاری اور مقامی رنگ ہوگا۔ اور ہر اہلِ سخن کے کلام میں
ہندوستان کے دھڑکتے ہوئے دل کی صدا آئے گی۔ اُردو کا کیا حشر ہوگا؟ اگر
فارسی اور بھاشا مل کر اردو بن سکتے تھے۔ تو کیا وجہ ہے۔ کہ اُردو اور ہندی ملکر
ہندوستانی نہ بن سکیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُردو کو ققنس کی فطرت ملی
ہے۔ آج یہ اپنے آتشیں نغمے گا گا کر فنا ہوتی نظر آرہی ہے۔ لیکن مجھے یقین
ہے کہ اسی راکھ سے یہ اپنا رنگ روپ بدل کر پہلے سے بھی زیادہ حسین اور
دلفریب بن کر اُٹھیگی۔ اور سارے ملک کی فضا کو اپنے ترانوں سے معمور کر دیگی۔

(آواز)　　آنند نرائن ملا

ڈرامہ!

ہسپانوی پناہگیر"

افرادِ ڈرامہ:۔

پناہ گیر:۔ جنرل فرانکو کے بموں سے بچے کھچے بے خانماں برباد "انسان" جنہیں حکومت فرانس پناہ دینے کا فخر حاصل کر چکی ہے۔

ہسپانوی سفیر:۔ متعینہ پیرس (فرانس)

مسیترو:۔ ہسپانوی اسکول ماسٹر جسے فرانسیسی حکومت نے یتیم ہسپانوی بچوں کا نگہبان مقرر کیا ہے۔

لوئی گلاکس[1]:۔ فرانسیسی سوشلسٹ جسے ہسپانوی پناہ گیروں کے نازک اور اہم "مسئلہ" میں بہت گہری دلچسپی ہے۔

ڈاکٹر:۔ فرانسیسی ڈاکٹر جسے حکومت فرانس نے ہسپانوی پناہ گیروں کی "صحت، تندرستی، اور دیکھ بھال" کے لئے مقرر کیا ہے۔

پہلا سین

پیرس: ——— ہسپانوی سفیر کا ملاقاتی کمرہ، شاندار کمرہ۔ بیش قیمت فرنیچر ——— قالین اور سامان آرائش ہے۔ مگر سب درہم برہم ہے۔ جیسے اس میں رہنے والے کافی عرصہ سے اسے خیرباد کہہ چکے ہوں۔ کمرے کے وسط میں ایک تپائی ہے۔ اس پر "آزادی اور انصاف" کا ایک چھوٹا سا مجسمہ پڑا ہے۔

داہنی دیوار میں ایک بہت بڑا دروازہ ہے جس پر سرخ مخمل کا پردہ آویزاں ہے بائیں دیوار کے کونے میں ایک بہت بڑی میز ہے جس پر ٹیلیفون اور کچھ کاغذات بکھرے پڑے ہیں۔

ہسپانوی سفیر ایک ہاتھ میں اخبار لئے خاموش اور سرنگوں بیٹھا ہے۔ جیسے وہ کوئی گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔

مخملی پردہ اُٹھتا ہے۔ اور مسیترو بغل میں کچھ کاغذات لئے اندر آتا ہے اور رسمی آداب کے بعد قدرے تیزی اور بیتابی سے سفیر کے بالمقابل صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔

مسیترو:۔ آپ نے حکومت فرانس کے نئے احکامات دیکھے ہوں گے؟

سفیر:۔ ہاں! میں ابھی اخبار میں ان کی تفصیل دیکھ چکا ہوں۔

مسیترو:۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ یتیم بچوں اور عورتوں کو بغیر کسی سہارے اور امداد کے فرانکو کے بموں سے فنا ہونے کے لئے واپس اسپین بھیج دیا جائے؟

سفیر۔ (استہزایہ انداز میں گردن بلند کرتے ہوئے) موجودہ زمانے کی "متمدن حکومتوں" کی یہ بھی ایک "انسانی خدمت" ہے (جس میں ہمیں کلام کرنے کی مجال نہیں۔

مسیترو:۔ (قدرے حیرت اور زیادہ پریشانی سے) مگر ان میں اکثر بچے ایسے ہیں۔ جو تمام ہسپانیہ میں ایک بھی والی وارث نہیں رکھتے۔ معصوم فلورنٹیا کو ابھی تک اپنے باپ کا پتہ نہیں ملا؛ اور اس کی ماں، جب یہ ہسپانیہ چھوڑ رہی تھی۔ اس کے سامنے ہی دم توڑ رہی تھی!

---

[1] ۔ آزادی اور انسانیت کی ہمدرد فرانسیسی ری پبلک ہسپانوی پناہ گیروں سے جو افسوسناک سلوک کر رہی ہے۔ اسکی صحیح تصویر لوئی گلاکس نے اپنی ایک طویل ڈائری میں پیش کی ہے، جسے اس نے ۲۶ ستمبر ۱۹۳۷ء سے لیکر ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۷ء تک کئی کیمپوں کا عینی مشاہدہ کرنے کے بعد مرتب کیا تھا۔ میرا ڈرامہ اس کا چربہ یا ترجمہ نہیں۔ بلکہ اس طویل ڈائری کے افسوسناک حالات اور غم انگیز تاثرات کو "ترتیب" اور مختصر انداز میں یکجا کرنے کا "ایک ڈرامائی بہانہ" ہے۔ مجھے احساس ہے۔ اور واقفیت کی زیادہ پاسداری میں ڈرامہ کا تسلسل کمزور ہے۔ مگر میں نے "آرٹ" کی خاطر صحیح واقعات کا خون کرنا مناسب نہیں سمجھا ہے۔ (رحمٰن)

سفیر: ــ (انتہائی بے تابی کے عالم میں موضوع گفتگو بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے جیسے اِس مسئلہ پر سوائے رنج اور اظہار افسوس کے وُہ کچھ نہیں کر سکتے) اچھا! بورڈنگ میں بچوں کی حالت کیسی ہے؟

مستیرو ۔ ان کی آنکھوں میں اگرچہ کوئی آنسو نہیں ہیں۔ مگر خوف و ہراس اور بے بسی کے اندوہناک آثار ان کے چہروں پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ (رنج مینی سے) بھائی! کیا حکومت فرانس ایسے ظالمانہ طریق پر انہیں اسی طرح بے بس چھوڑ دیگی؟

سفیر ۔ ہاں! معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ (اخبار کیطرف اشارہ کرتے ہوئے) اس اخبار کی بھی یہی رائے ہے۔ کہ "حکومت فرانس کو خواہ مخواہ غیروں" کی خاطر اپنے ٹیکس دہندوں پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہیئے" اور ان "آوارہ پناہ گیروں" کا یہاں قیام بھی ان کے امن اور انکی سوسائٹی کے بلند نظام میں خلل ڈال رہا ہے! خیر! "پر پنگیر" میں عورتوں کی کیا حالت ہے؟

مستیرو ۔ مسٹر فرانسس جو ہماری فوجوں میں ڈپٹی کمانڈر تھا۔ اور پچھلے ماہ فرانکو کے سپاہیوں کی گولیوں سے مارا گیا تھا۔ اس کی بیوی آج صبح اپنے بچے کو گود میں لیکر رو رہی تھی مجھے اسکی ہچکیوں میں ٹوٹتے ہوئے الفاظ سے معلوم ہوا۔ کہ اپنے بچے کے لئے اس کے پاس دودھ نہیں رہے۔

بھائی! تباہیوں اور نامرادیوں سے ٹوٹے ہوئے دل جنت کو بھی جہنم بنا دیتے ہیں۔ اور یہاں تو ویسے ہی مصائب اور مشکلات کے طوفانوں میں معصوم زندگیاں تڑپ رہی ہیں۔ . . . . جب دو دو چار چار عورتیں ملکر قومی گیت الاپتی ہیں۔ تو سب سے پہلے بوڑھی عورتیں بے تابانہ چلانے لگتی ہیں۔ اور پھر ایک کہرام بچ جاتا ہے۔ اور کئی ماؤں کی گودیوں سے بچے گر پڑتے ہیں۔ اور . . .

سفیر ۔ (جیسے وہ بہت متاثر ہے) فرانسیسی مئیر نے وعدہ تو کیا ہے کہ وہ کونسل میں پناہ گزینوں کے اخراج کے احکامات کی نزاکت اور غیر مصلحت اندیشی کی طرف وزیر اعظم کو توجہ دلائیں گے ـــــ مگر ـــــ مگر ـــــ وُہ ذاتی طور پر کوئی امداد کرنے سے قاصر ہیں۔

مستیرو ۔ (طنزاً مسکراتے ہوئے) بچوں، بوڑھوں یا عورتوں کا قتل عام بھی ان دولت اور اقتدار کے وحشیوں کے دلوں میں رحم پیدا نہیں کر سکتا: ـــــ آپ ان سے خواہ مخواہ اُمیدیں وابستہ کئے ہوئے ہیں!

سفیر ۔ (سیاستدانوں کے انداز میں) ہاں! مگر برطانیہ کی آئے دن بڑھتی ہوئی کمزور پالیسی کے پیش نظر فرانس کیلئے یہ حالت مجبوری یہ ضروری ہے۔ کہ وہ ہسپانوی حکومت کیلئے زیادہ ہمدردی کا ثبوت نہ دے اور باغی فرانکو کے لئے ہسپانیہ کی سرزمین صاف کرنے کے لئے مسولینی سے معاہدے کرے!

مستیرو ۔ بھائی! یہ حکومتیں؟! ان کی "پالیسیاں" ہم جانتے ہیں۔ کہ امن و امان اور غریب انسانوں کے نام پر کیا بے ہودگیاں اور ناانصافیاں ہوتی ہیں؟ ـــــ کون کہہ سکتا ہے کہ فتح ہمیشہ ایسی صورت ہی میں ہوتی ہے۔ جیسی کہ ہم چاہتے ہیں . . . . .

سفیر ۔ (جیسے وہ ایسی بے معنی گفتگو سے گھبراتا ہے) ہاں! لیکن اس سے ہم دونوں کو سبق لینا چاہیئے: (نیم بیداری کی حالت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ جیسے اسے اچانک کوئی خیال آگیا ہے۔) اچھا! میں خود وزیر خارجہ سے دریافت کرتا ہوں!

وہ ٹیلیفون کے پاس جاتا ہے۔ اور وزارت خارجہ کے نمبر کی گھنٹی بجاتا ہے اور جیسے اسے ایک ذمہ دار حکومت کی بد اعنوانیوں پر یقین نہیں ہے۔ تیز انداز میں پکارتا ہے

سفیر ۔ ہلو! . . . . . وزیر خارجہ فرانس . . . . ؟

آواز ۔ . . . .

سفیر ۔ ہاں! میں ہوں ہسپانوی سفیر . . . . !

آواز ۔ . . . .

سفیر ۔ کیا آپ ان غیر متوقع احکامات اور ان کے تلخ نتائج کا اندازہ فرما سکتے؟

آواز ۔ . . . .

سفیر ۔ ہاں! وہی . . . . . وہی ہسپانوی پناہ گیروں کو واپس ہسپانیہ بھیجنے کے متعلق . . . . .

آواز ۔ . . . .

سفیر ۔ ہیں؟ (سخت لب و لہجہ میں) پناہ گزینوں نے جو فسادات کئے ہیں؟ . . . . ! مگر یہ تو کوئی اتنی اہم وجہ نہیں ہے! ایک آلام زدہ سے اتنی اُمید بھی نہیں کہ وہ ظلم و ستم کے خلاف آواز بھی بلند کرے؟ کیا فرانس کی تمام آبادی فساد کرنا جانتی ہی نہیں؟ ـــــ اور آپ کی حکومت کے تمام کارناموں پر ہر شخص

خاموش رہتا ہے ؟

آواز۔ . . . .

سفیر۔ (اس کے چہرے کا رنگ دگرگوں ہوجاتا ہے) کیا ان چند فسادیوں کے لئے آپ تمام بے بسوں کو "فرانکو کے جہنم" میں دھکیل رہے ہیں۔

آواز۔ . . . .

سفیر۔ ہوں . . . . . اچھا! . . . . . .

آواز۔ . . . .

سفیر۔ مجبوری ——— ؟ ؛ البتہ یہی ایک لفظ ہے جو ہماری کمزوریوں اور خود غرضیوں کی پردہ پوشی کرتا ہے! . . . . خیر! کیا ان پر نظر ثانی . . . ؟

آواز۔ . . . .

سفیر۔ نہیں . . . . ؟ ! (اس کی آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔ اور وہ نیم مجروح انداز میں ٹیلیفون میز پر رکھ دیتا ہے۔ جیسے اس کے جسم سے نصف روح غائب ہوچکی ہے اور مستیرو سے انتہائی افسوس اور غم آمیز لہجے میں کہتا ہے)

وزیر صاحب کا ارشاد ہے کہ صرف ان پناہگیروں کو یہاں رہنے دیا جائیگا۔ جو اپنے اخراجات پر یہاں رہیں گے۔ اور بوقت ضرورت حکومت فرانس کے ایما پر اپنے ہی اخراجات پر یہاں سے جائیں گے۔

مستیرو۔ اس طرح تو بہت سے بچے اور عورتیں برباد ہو جائیں گی؟

سفیر۔ (غصہ اور نفرت میں) بچے ——— یہ معصوم بچے ——— اور ——— بے گناہ عورتیں پہلے ہی کیا کم برباد ہوچکی ہیں؟ ——— میں جب گھر جاتا ہوں۔ میری بچی دوڑ کر میرے پاس آتی ہے۔ اور میری گردن میں اپنی ننھی ننھی بانہیں ڈال دیتی ہے۔ اور مجھے چھوٹی چھوٹی کہانیاں سناتی ہے۔ میں ہنستا ہوں ——— اسے دھوکہ دیتا ہوں ——— میرا دل لرزتا ہے۔ کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے اسوقت اسکی عمر کے سینکڑوں بچوں کی برباد زندگی کا ہیجان انگیز منظر ہوتا ہے۔

مستیرو۔ (جیسے وہ ایک غیر متعلق جذباتی گفتگو نہیں سننا چاہتا) اب تو سوشلسٹ پارٹیوں کے سیکرٹریوں نے بھی اپنے بناوٹی الفاظ سے اپنی خود غرضیوں کو ننگا کر دیا ہے ——— یعنی "وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے" "یہ بہت مشکل ہے" اور وہ ناممکن ہے" وغیرہ۔

سفیر۔ (جیسے جذبات کی دنیا سے باہر آنا اس کیلئے مشکل ہوگیا ہے۔) موجودہ دنیا کی پیشانی پر انسانی خون سے لکھے ہوئے چند اہم سوالات ہیں۔ جنہیں کئی سادہ لوح پیچیدہ اعداد و شمار اور لایعنی دلائل سے حل کرنا چاہتے ہیں . . . . . . بے وقوف! ہماری پالیساں اور ہمارے لائحہ ہائے عمل سب فضول بکواس ہے۔ ہمارا مطلب ہی سب سے بڑا ہے!

مستیرو۔ (سفیر کو جذبات کی دنیا سے باہر لانے کیلئے ایک مؤثر حربہ استعمال کرتا ہے) ہاں! تو پہلا گروہ کتنے بچوں، مردوں، اور عورتوں پر مشتمل ہے ؟

سفیر۔ (اکڑ کر بیٹھتے ہوئے) ایک سو پچاس جن میں پچاس بچے ہیں ——— بیس دودھ پیتے! ——— بقیہ عورتیں (بے تابی سے) ——— اچھا! آپ جا سکتے ہیں۔ مجھے "پرنگور" جانا ہے۔ ایک نہایت تشویش انگیز اطلاع آئی ہے ———

دوسرا سین

پیرس کے باہر ایک سڑک پر ———

ہسپانوی سفیر بے تابی اور پریشانی میں تیز قدم چل رہا ہے۔ اور ماحول سے تقریباً بے خبر ہے۔ اور کسی گہری سوچ میں ہے۔ اس کی داہنی طرف لوئی کلاکس اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے لمبے لمبے قدموں سے چل رہا ہے۔ اور کبھی استفہامیہ نگاہوں سے سفیر کے چہرے کا جائزہ بھی لے لیتا ہے۔ ان کی بائیں جانب فرانسیسی ڈاکٹر نہایت آزادی اور اطمینان سے چل رہا ہے۔ اور اس کے لبوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہے۔

تینوں کچھ دیر چلنے کے بعد سڑک کے کنارے ایک فیکٹری نما بلڈنگ کے آہنی دروازے پر ٹھہرتے ہیں۔ جو ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ہے۔ اور جس کے دروازے پر کافی بدبودار پانی جمع ہے۔ اس کی شکستہ حالت اس کا واضح ثبوت ہے۔ کہ گذشتہ کئی سالوں سے یہ کسمپرسی کی حالت میں ہے۔

تینوں اس دروازے کے اندر داخل ہوتے ہیں۔ بلڈنگ اندر سے ایک وسیع ہال کی صورت میں ہے۔ جس کے ایک کونے میں چند زنگ آلود پرانی مشینیں پڑی ہیں۔ اس کی چھت شیشے اور سلیٹ سے بنی ہوئی ہے۔ مگر کئی جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے۔

جس سے بارش کا پانی اندر کافی مقدار میں آتا ہے۔

تمام ہال میں کوئی آگ روشن نہیں ہے۔ فرش پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی ہے۔ جس پر ہسپانوی پناہ گیر (مرد۔ عورتیں اور بچے) بہت بُری حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

ہسپانوی سفیر۔ (انتہائی کراہت اور نفرت میں) انسانوں سے حیوانوں جیسا سلوک! دُنیا کی ان حکومتوں کی طرف سے ہو رہا ہے۔ جن کی "انسانی ہمدردی" اور امن و امان کی "مقدس آرزوئیں" دنیا میں ضرب المثل ہو چکی ہیں! بھیڑوں اور بکریوں کی طرح ان سب کو ایک باڑہ میں جمع کر کے پیاسے چوہوں اور زہریلے کیڑوں کو ان کا خون چوسنے کیلئے آزاد چھوڑ دینا ——— کیا یہی انسانی ہمدردی ہے؟! ——— ٹھنڈی۔ میلی اور بدبودار جگہ کو مظلوم اور برباد انسانوں کا مسکن بنانا! ——— ڈاکٹر صاحب! (ڈاکٹر سے) آپ ہی فرمائیے ——— آپ کی سائنس تو انسانوں کی یہی ہمدردی کر سکتی ہے؟

(گلاکس ہونٹوں میں مسکرانے لگتا ہے)

ڈاکٹر۔ (خفیف ہو کر) دیکھئے صاحب! یہ جگہ تو پہلے ہی سے ایسی تھی۔ البتہ صاف نہ کرنے اور غلیظ رکھنے کا الزام ان گندی عادات رکھنے والے میلے پناہ گیروں پر عائد ہوتا ہے ——— یہ خود اس جگہ کو صاف نہیں رکھتے۔

(سفیر ہونٹ کاٹنے لگتا ہے)

اس کے لئے تو ہمارے کئی مزدوروں کو کتنے روز تک محنت کرنا پڑے گی!

گلاکس۔ (قدرے طنزیہ انداز میں) کیا انہیں صابن وغیرہ نہیں دیا جاتا؟

ڈاکٹر۔ (سنجیدگی اور استکراہت سے) کہاں سے دیا جائے؟ آپ جانتے ہیں کہ ان فضول اخراجات کیلئے فنڈ میں روپیہ ہی کہاں ہے؟!

گلاکس۔ اس بلڈنگ کا کرایہ کس قدر فنڈ سے لیا جاتا ہے؟ (ڈاکٹر منہ چڑھا کر خاموش ہو جاتا ہے۔ جیسے وہ گلاکس کی روش کو انتہائی ناپسندیدگی سے دیکھتا ہے۔ سفیر جواب دیتا ہے۔ گلاکس کے سوال کیلئے نہیں بلکہ ڈاکٹر کو فرانسیسی حکومت کا ایک رُکن سمجھتے ہوئے اسے نادم کرنے کیلئے)

سفیر۔ ہر پناہ گیر کو آٹھ فرانک روزانہ ملتے ہیں ——— ہسپانوی فنڈ سے ——— جس میں سے ایک فرانک روزانہ بطور کرایہ کاٹ لیا جاتا ہے ——— اسوقت یہاں تین سو پناہ گیر ہیں۔ کیوں ڈاکٹر صاحب! ٹھیک ہے نا! ——— تین سو فرانک روزانہ ——— یعنی ——— نو ہزار فرانک ماہوار! (انتہائی دکھ سے جو آخر نفرت آمیز طعنوں پر ختم ہوتا ہے) بہت کم کرایہ ہے؟! ——— آخر یہ فیکٹری بھی تو اتنی مدت سے بیکار پڑی تھی۔ اب اس کا مالک اپنی فیکٹری کو نئے سرے سے زندہ کر سکیگا!

گلاکس۔ یہ ہماری ہمدرد قومیں ہیں۔ ری پبلک "اشتراکی اور سوشلسٹ حکومتیں"؟ ———! اپنی زندگی اور بے خانماں انسانوں کی زندگی میں آخر کچھ فرق تو سمجھتی ہیں؟!

(ڈاکٹر کی پیشانی پر بل آ جاتا ہے۔ جیسے یہ تمام گفتگو اسے سخت ناگوار گذری ہے)

سفیر۔ خیر! ڈاکٹر صاحب!! وہ عورت کہاں ہے؟

گلاکس۔ جس کے کل بچہ پیدا ہوا ہے؟

(سفیر اسبات میں سر ہلاتا ہے)

تینوں خاموشی سے پناہ گیروں کی گھاس پر پڑی ہوئی "زندہ لاشوں" میں سے راستہ بناتے ہوئے ہال کی مغربی دیوار کی طرف جاتے ہیں۔

غلیظ پرانے کپڑوں کے انبار کے نیچے ٹھنڈی گھاس کے "بستر" پر ایک نحیف عورت جس کے چہرے پر زردی چھائی ہے۔ پڑی ہے۔ اس کے بائیں پہلو میں ایک معصوم بچے کا سُرخ چہرہ لرز رہا ہے۔ جو آدھا ننگا ہے اور آدھا ایک چیتھڑے میں لپٹا ہوا ہے۔

وہ عورت پہلے ایک نگاہ ان تینوں پر ڈالتی ہے اور پھر مُسکراتے ہوئے اپنے ننھے "کھلونے" کو پیار کرنے لگتی ہے۔ جیسے ان تمام مصائب کے باوجود وہ ایک "ماں" بننے پر فخر اور مسرت محسوس کر رہی ہے۔

ماحول کی انتہائی غلاظت اور افسران کی انتہائی بے پروائی کے اس افسوسناک مظاہرے سے سفیر غصے اور نفرت سے بے تاب نظر آتا ہے۔

سفیر۔ (سخت اور درشت لہجے میں) اس کو زچہ خانہ سے کب یہاں لایا گیا ہے؟

ڈاکٹر۔ کل۔ . . .

سفیر۔ (غصے اور نفرت میں) ڈاکٹر صاحب! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس عورت کا اس زچہ خانہ میں کتنی مدت تک رہنا لازمی تھا! مگر مجھے افسوس ہے کہ ——— (وہ شدت جذبات سے پیچ کھا کر خاموش ہو جاتا ہے) آپ تو روزانہ یہاں ایک گھنٹہ گزار کر چلے جاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اور انسانیت کی گردن پر ایک عظیم احسان رکھ دیا۔ لیکن آپ

اندازہ کر سکتے ہیں کہ آپ کی اس بے پروائی کا نتیجہ کس قدر خوفناک ہوگا — میں تم سے پوچھتا ہوں۔ تمہاری حکومت کی تمام مشینری سے پوچھتا ہوں۔ کہ مظلومین کی یہی وہ شاندار امداد ہے جس کا ہمیں یقین دلایا گیا تھا؟ — اس سے — اس ذلت اور بے ہودگی سے تو بہتر تھا۔ کہ یہ سب فرانکو کے بموں اور توپوں کی نذر ہو جاتے۔

(وہ کانپنے لگتا ہے۔ غصے سے بیتاب ہے)

اب انہیں موت کی بیماریوں، مکھیوں اور زہریلے چوہوں سے کون بچا سکتا ہے؟ آپ؟ جنہیں اس نیم مردہ عورت کو زچہ خانہ سے باہر نکال کر موت کے منہ میں پھینکتے ہوئے شرم نہیں آئی — جس کے دل میں یہ معصوم مکھڑا بھی رحم نہیں جگا سکا!؟ — اب اگر یہ مر جائے۔ . . . . یہ بچہ مر جائے۔ (وہ کانپتی ہوئی انگلی سے نیچے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔) تو . . . ؟ (وہ شدت جذبات سے کچھ نہیں بول سکتا)۔ . . . ڈاکٹر صاحب! (طنزیہ انداز میں) پیرس کی میونسپل کونسل اپنی شاندار اور پھولوں سے سجی ہوئی گلیوں کے چند پھول بھی اس معصوم کی قبر پر چڑھا سکے گی؟

(ڈاکٹر ندامت انگیز نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ جیسے اس کے دل کا "مقدس وحشی" جاگ اٹھا ہے۔ اور اب وہ دنیا کے دکھ کو دکھ سمجھنے لگا ہے)

سفیر۔ کیا آپ اس عورت کو میری حفاظت میں دے سکیں گے؟

ڈاکٹر۔ میونسپل کونسل کی اجازت کے بغیر . . . . . . (ہچکچاتے ہوئے) آپ تو خود جانتے ہی ہیں۔ — کہ — ؟

سفیر۔ تو اسے کم از کم واپس زچہ خانہ میں ہی بھجوا دیں!

ڈاکٹر۔ ہاں! البتہ اس پر "ہمدردانہ" غور ہو سکتا ہے

تینوں چلے جاتے ہیں۔ گلاکس کسی گہری سوچ میں گردن نگوں کئے چلتا ہے۔

تیسرا سین

ریلوے اسٹیشن — پناہ گزینوں کی "اسپیشل ٹرین"

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی ہے۔ جس پر "برائے بلباؤ" لکھا ہے۔ گاڑی کی تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں۔ مگر ان میں سے صرف چند بوڑھے چہرے نظر آ رہے ہیں جن کے سروں پر سرخ رومال لپٹے ہوئے ہیں۔

باقی سب پلیٹ فارم پر تیزی اور جوش و خروش میں پھر رہے ہیں۔ مگر ان کے سنجیدہ چہرے ان کی ذہنی بے چینی کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

تقریباً سب کے کپڑے بوسیدہ اور میلے ہیں۔ جو پہرہ دار فرانسیسی سپاہیوں کی صاف چمکتی ہوئی وردیوں کے مقابلہ میں بہت ہی مکروہ معلوم ہو رہے ہیں۔

ہسپانوی سفیر ایک عام لباس میں ایک سولہ سالہ لڑکے سے معروف گفتگو ہے۔ گلاکس اس کی داہنی جانب خاموش کھڑا ہے۔ اور ستیروان کے پیچھے کھڑا اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو سہلا رہا ہے۔

سفیر۔ (لڑکے سے) کیا تمہاری ماں بھی تمہارے ہمراہ ہے؟

لڑکا۔ نہیں؟

سفیر۔ تمہارا باپ؟

لڑکا۔ مجھے معلوم نہیں — زندہ ہے یا فرانکو کی قید میں؟

سفیر۔ ہم اگر تمہارے یہاں قیام کی خاطر سے اجازت دے لیں — تو —؟

لڑکا۔ (تیزی اور جوش میں) جی نہیں: شکریہ! میں بلباؤ جانا چاہتا ہوں — بلباؤ!

سفیر۔ (قدرے تمکنت سے) جیسے جیسی مرضی! — تمہیں فرانکو کی فوجوں میں کام کرنا پڑے گا؟!

لڑکا۔ (غصے میں) فرانکو!؟ فرانکو؟؟ — ہرگز نہیں . . .

سفیر۔ (مسکراتے ہوئے) اچھا سلام! (لڑکا بند مٹھی سے ایڑیاں جوڑ کر سلامی دیتا ہے)

(سفیر ایک دوسرے قریب ٹھہرے ہوئے ادھیڑ عمر پناہ گیر سے مخاطب ہوتا ہے)

سفیر۔ انہوں نے تمہیں خوراک تقسیم کر دی ہے؟

پناہ گیر۔ جی نہیں! راستے میں تقسیم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے — ایک روٹی دس آدمیوں کے لئے!

سفیر۔ بچوں کے لئے دودھ!

پناہ گیر۔ (اندوہگیں مسکراہٹ سے) کئی عورتوں نے اپنے بچوں کے لئے سیپی

سے بوتلوں میں پانی بھر لیا ہے۔ اور ——

(اتنے میں انجن سیٹی دیتا ہے۔ اور وہ سفر کو سادہ رسمی سلام کر کے رخصت ہو جاتا ہے)

سب جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اور گانے لگتے ہیں ——

۴ —— "آریا اسپانا ر وجا" —— ہر گیت کے آخر میں دُہرایا جاتا ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو نیم وارفتگی میں اپنے گھٹنوں پر بٹھائے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ کئی اپنے چہروں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپے رو رہی ہیں۔

انجن دوسری سیٹی دیتا ہے۔ گاڑی کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ اور کھڑکیوں سے باہر سُرخ رومالوں میں لپٹے ہوئے سر باہر نکلتے ہیں۔ مردوں کے چہروں پر مصنوعی مسکراہٹیں ہیں۔ عورتوں کے چہروں پر آنسوؤں کی لڑیاں ہیں۔ گاڑی آہستہ آہستہ روانہ ہوتی ہے۔ گانے کی آوازیں زیادہ تیز ہو جاتی ہیں۔ اور تمام کھڑکیوں سے پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کی طرح رومال ہلنے لگتے ہیں۔

جوں جوں گاڑی دُور ہوتی چلی جاتی ہے۔ آوازیں وائرلیس کے پردوں پہ مدہم سروں کی طرح سُنائی دینے لگتی ہیں۔ اور آخر میں صرف ایک آواز —— "اسپانا" —— "اسپانا" —— افق میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخیوں سے اُبلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

(امین حزیں رہاولپوری)

نقد و نظر۔

پاگل

خلیل جبران کی کہاوتوں اور نظموں کو سید بشیر ہندی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ خلیل جبران وہی مصنف ہے جس نے "اس نے کہا" نامی کتاب انگریزی میں لکھی تھی۔ اس مختصر کتاب میں ۳۵ مختلف عنوانات پر نہایت دلچسپ اور سبق آموز ادبی شہ پارے ہیں۔ ان میں بعض اتنے گراں پایہ ہیں کہ شاید رابندرناتھ ٹیگور کے شاہکاروں میں ان کا جواب مل سکے۔ زبان سلیس اور موثر ہے۔

یہ کتاب پاگل نہیں بلکہ ہوشمندوں کے لئے بھی راہ نما ہے

مجلد کتاب کی قیمت آٹھ آنے ہے

ملنے کا پتہ:۔ گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور

حامد اللہ افسر کی شاعری

از ادارہ

حامد اللہ افسر نے اُردو کو بام ترقی پر پہونچانے کے لئے جو خدمات انجام دی ہیں ۔ اُن پر ایک مختصر مضمون میں تبصرہ کرنا مشکل ہے ۔ اس سے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے ۔ کہ میں تین مختلف مضامین تحریر کروں ۔ ایک مضمون میں افسر صاحب کی شاعری پر بحث ہو ۔ دوسرے میں اُن کے افسانوں پر اور تیسرے میں اُن کی تنقیدوں پر، سب سے پہلے میں اُنکی شاعری پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں ۔)

جدید اُردو شاعری کی تاریخ میں افسر کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جائیگا ۔ ان کی ادبی جد وجہد ایسے زمانہ میں شروع ہوئی جبکہ ایک طرف طرز جدید کے پرستاروں پر ٹیگور کا سکہ بیٹھا ہوا تھا ۔ اور دوسری طرف اقبال کی ولولہ انگیز اور جوش خیز نظمیں لوگوں کو مسحور کر رہی تھیں ۔ اور ہمارے نوجوان شاعر دیوانہ وار کبھی ٹیگور کی طرف دوڑتے تھے، اور کبھی اقبال کے پیچھے ہو لیتے تھے ۔ لیکن افسر نے کبھی کسی کے اتباع کی کوشش نہیں کی سب سے پہلے اُنکی ایک غزل ۱۹۱۸ء میں مشہور ہو کر عوام تک پہونچی اس غزل میں بھی اُن کی انفرادیت روز روشن کیطرح واضح ہے ۔

آنریبل ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب جج فیڈرل کورٹ دہلی افسر کی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں " تخیل کی جدت ۔ اچھوتے مضامین کو سلاست اور صفائی کے ساتھ بیان کرنا سیدھے سادے الفاظ کو اس طرح ترتیب دینا کہ وہ موسیقیت سے لبریز ہو جائیں ؟ یہ افسر کے کلام کی خصوصیات ہیں " میاں بشیر احمد آڈیٹر رسالہ ہمایوں لاہور فرماتے ہیں " سادگی موسیقیت اور ایک انوکھا طرز بیان یہ افسر کے کلام کی خصوصیات ہیں " اس مضمون میں افسر صاحب کے کلام پر مبسوط تبصرہ کرنے کا ارادہ نہیں ہے میں صرف کلام افسر کے چند دلفریب نمونے پیش کر کے یہ امر واضح کرنا چاہتا ہوں ۔ کہ اُنہوں نے اُردو ادب کو ایسے ایسے پاکیزہ اور اچھوتے خیالات سے لبریز کر دیا ہے ۔ جو دُنیا کی بڑی سے بڑی ترقیافتہ زبان کے لئے بھی سرمایہ ناز و افتخار ہو سکتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ایک نہایت اہم خصوصیت افسر صاحب کے کلام کی یہ ہے ۔ کہ ان کا طرز بیان سب سے نرالا اور نہایت سلیس اور شستہ و رفتہ ہے ہر زبان میں کسی شاعر یا ادیب کا یہ سب سے بڑا کمال سمجھا جاتا ہے ۔ کہ وہ نازک سے نازک اور ادق سے ادق خیال کو نہایت آسان صاف اور سلیس الفاظ میں ادا کر دے ۔ حقیقت میں ادبی سادگی کمال فن میں داخل ہے مشکل سے مشکل خیال کو آسان سے آسان الفاظ میں ادا کرنے میں افسر صاحب کو جو ملکہ اور جو کمال حاصل ہے اسکی مثال اُردو شعرا میں بہت کم ملتی ہے ۔

اُردو زبان کے نشو ونما میں ایک بڑی دقت یہ آپڑی ۔ کہ ابتدا میں فارسی زبان نے اس کے لئے خیالات کا ذخیرہ مہیا کر دیا ۔ اور جب موجودہ زمانے میں اس نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا ۔ تو انگریزی زبان نے وہی خدمت انجام دی ۔ جو ابتدا میں فارسی نے انجام دی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں میں خیال کی جدت اور تازگی کا فقدان نظر آئے گا ۔ ہمارے معدودے چند شاعر بھی ایسے نکلے ۔ جو اس خامی سے اپنا دامن بچا سکے ۔ افسر صاحب نے ایک طرف عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی ۔ اور دوسری طرف انگریزی زبان میں مہارت بہم پہونچائی ۔ لیکن جہانتک اُن کی شاعری کا تعلق ہے ۔ اُنہوں نے اُن زبانوں سے بالکل فائدہ نہیں اُٹھایا ۔ اعلیٰ تعلیم سے جو فوائد حاصل کئے جا سکتے ہیں ۔ اُنھوں نے وہ سب حاصل کئے لیکن کبھی کسی کی نقل نہیں اُتاری واقعات و موجودات کا جو اثر اُنکی طبیعت پر ہو ۔ اُنہوں نے کسی کو اپنے انوکھے طرز بیان میں پیش کر دیا ۔

آپ نے حمد میں صدہا اشعار پڑھے ہوں گے ۔ لیکن افسر کی وہ نظمیں جو اُنھوں نے خدا کی تعریف میں کہی ہیں ۔ سب سے الگ ہیں ۔ ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ فرمایئے :-

تا بہ کے چشمک زنی اے برق حسن بے نیاز — یا تو اک دم پھونک دے یا نور سے بھر دے مجھے
تو ہے پردے میں تو اس دُنیا کو تیرہ کیا کروں — جو تجھے دیتا ہے پردے سے نکالکر دے مجھے
ذرہ ذرہ میں ترا جلوہ سہی میں کیا کروں — ذرہ ذرہ کا جہاں کے رازداں کر دے مجھے
نالہائے آخر شب تو کوئی سنتا نہیں — شورش ہنگامہ خیز صبح محشر دے مجھے
ہے اگر کچھ رحمتوں کے صرف بیجا کا خیال — اپنی اس دُنیا کو تو جنت بنا کر دے مجھے

ایک اور نظم میں فرماتے ہیں :-

قصر فلک نشاں میں تاجِ گہر فشاں میں
دنیائے عزو شاں میں عشرت کی داستاں میں
میں جس کو ڈھونڈھتا ہوں وہ جلوہ گر نہیں ہے

اصواتِ دلربا میں نغمات باصفا میں
لحن طرب فزا میں مطرب تری صدا میں
میں جس کو ڈھونڈھتا ہوں وہ ہے مگر نہیں ہے

اس کچی جھونپڑی میں اس پھونس کی کٹی میں
خاموش مفلسی میں روپوش بے کسی میں
میں جس کو ڈھونڈھتا ہوں وہ مسکرا رہا ہے

مظلوم کی صدا میں بیکس کی التجا میں
مجبور کی ندا میں مایوس کی دعا میں
میں جس کو ڈھونڈھتا ہوں خود وہ ہی بولتا ہے

اسی مبحث پر ایک بڑی پیاری نظم سائل کے عنوان سے کہی ہے سنیئے :-

تم مجھے کیا دے رہے ہو یہ ستارے کیا کروں ہوں تو سائل لیکن ان چیزوں کا میں سائل نہیں
یاں مرے کس کام کے یہ آفتاب و ماہتاب ہوں تو سائل لیکن ان چیزوں کا میں سائل نہیں
کیا کروں میں لیکے یہ دریا تمہارے کیا کروں ہوں تو سائل لیکن ان چیزوں کا میں سائل نہیں
کیا کرینگے میری تسکین اُنچے اُونچے یہ پہاڑ ہوں تو سائل لیکن ان چیزوں کا میں سائل نہیں
سچ یہ ہے مجھکو نہیں ہے مال و دولت کی تلاش ہوں تو سائل لیکن ان چیزوں کا میں سائل نہیں

تم مجھے مل جاؤ بس اتنی ہے میری آرزو
اور کچھ حاصل نہ ہو گر اور کچھ حاصل نہیں :

اُمید افزا نغمے

اُردو شاعری کی ہمیشہ سے ایک خصوصیت یہ رہی ہے - کہ وہ غم انگیز مضامین سے لبریز رہی ہے - اور اس کا اثر طبائع پر بہت مایوس کُن ہوتا ہے - لیکن افسر صاحب اس قسم کے مضامین سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں - اُنھوں نے بہت امید افزا اور خوش آئند نغموں سے اردو کو لبریز کر دیا - اور آپ اس خصوصیت میں بھی عدیم المثال ہیں - چنانچہ "نشاط خیال" کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے :-

ہاں ہاں وہ چھپنے والا ہر دل میں چھپ جائیگا لیکن ڈھونڈنے والا بھی ڈھونڈھے گا اور پائیگا
میں تو نام کا مالی ہوں پھولوں کا رکھوالا ہوں جس نے بیل لگائی ہے خود پروان چڑھائیگا
جس نے خزاں کو بھیجا ہے اُسکے پاس بہار بھی ہے جس نے باغ اُجاڑا ہے وہ خود پھول کھلائیگا
زانو کا تکیہ ہوگا مٹی کا بستر ہوگا گھر گھر جس کا چرچا ہے میرے گھر بھی آئیگا

افسر میرے کانوں میں کوئی یہ کیا کہتا ہے :
وہ سرکار ہماری ہے بے مانگے ہی پائیگا

اس قبیل کی نظموں میں ایک بہت ہی دلفریب نظم کے چند شعر سُنیئے :-

رہبر خود گمراہ ہوئے ہیں آج زمانہ ایسا ہے ہر اک گام پہ منزل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا
دولت ہے نیکی میں داخل آج زمانہ ایسا ہے دولت جرم میں داخل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا
آج اندھیرا ہے ہر گھر میں آج زمانہ ایسا ہے جگ مگ جگ مگ محفل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا
خوش دل ہونا بھی ہے اچھا آج زمانہ ایسا ہے ساری دُنیا خوش دل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا

کشتی ہے گرداب میں افسر آج زمانہ ایسا ہے
کشتی نزدِ ساحل ہوگی وہ بھی زمانہ آئیگا

ایک نظم کا عنوان ہے "فلسفہ کامیابی" فرماتے ہیں :-

جو سب سے بدتر تھے اس جہاں میں ہیں اُن کے وارث ہی سب سے بہتر
روکاوٹیں جس قدر ہوں پیدا اُسی قدر کامیاب ہو گے
یہ چھاؤں جس سے گزر رہے ہو ثبوت بیّن ہے دھوپ کا خود
شکست کا لطف پا چکے ہو تو ایک دن فتحیاب ہو گے

خزاں اُجاڑے گی جس چمن کو بہار آئے گی اُس چمن میں
اُسے خوشی بھی نہ ہو گی حاصل جسے کبھی غم نہیں رہا ہے
خدا رسیدہ بزرگ ہونا اُسی سے ممکن ہے اس جہاں میں
گنہگاروں میں جو یہاں کے کسی سے کچھ کم نہیں رہا ہے

جو بے بسی میں گھرے ہیں افسر وہی تو گہرائی سے ہیں واقف
جو دل سے نکلا ہے کوئی نالہ فلک پہ وہ با اثر رہا ہے
بلندیوں پر وہی چڑھے گا نشست میں جو اُتر سکے گا
جو چوٹیوں پر گیا ہے رستہ وہ گھاٹیوں سے گزر رہا ہے

مناظر قدرت

"مناظر قدرت" سے اختر کو بے انتہا دلچسپی ہے۔ لیکن ان نظموں میں بھی ان کی "انفرادیت" نمایاں ہے۔ اور ان کا مخصوص رنگ ان کے ہر مصرعے سے جھلک رہا ہے۔ ایک نظم کا عنوان ہے "چاند" اس کے چند شعر سنیئے۔

تم ندی پر جا کر دیکھو   جب ندی میں نہائے چاند
ڈبکی لگائے غوطے کھائے   ڈر ہے ڈوب نہ جائے چاند
کرنوں کی اک سیڑھی لیکر   چھم چھم چھم اتر آئے چاند
جھولے میں پانی کی لہروں کے   کیا کیا پینگ بڑھائے چاند
ہنس ہنس کر ندی کے اندر   روتوں کو بھی ہنسائے چاند
جب تم اس کو پکڑنے جاؤ   بادل میں چھپ جائے چاند
پھر چپکے سے نکل کر دیکھے   اور پھر خود کو چھپائے چاند
اب ہالے میں چھپ بیٹھا ہے   کیا کیا روپ دکھائے چاند

چاہے جدھر کو جاؤ اختر
ساتھ تمہارے جائے چاند

ذیل کے اشعار میں صبح کا زرریز و کیف خیز سماں ملاحظہ فرمائیے:۔

صبح نے کھول کے اپنا خزانہ گھر گھر سونا بانٹ دیا
پتہ پتہ سونے کا تھا کونپل کونپل سونے کی
موتی ہی موتی بکھرے پڑے تھے سارے کھیت کے پتوں پہ
گویا کھیت میں سونے کے تھی فصل یہ موتی بونے کی
شب بھر چاندی کے دریا میں صبح نہا کر نکلی تھی
سونے کے پیٹ میں جگ مگ کرتے تارے کھا کر نکلی تھی
قدر نہ جانی مالی کی اس کے اکثر سونے والوں نے
صبح اسی لئے اختر کے گھر سیدھی آکر نکلی تھی

"سکوت شام" کے دو بند ہیں۔

شفق پھولی فلک پر سرخ بادل کچھ نظر آئے   یہ کیسے لال دیوانہ دیواروں کے سر آئے
چمن کی سیر کر کے لوگ اپنے اپنے گھر آئے   چھتیں سونی پڑی ہیں کھیل کر بچے اتر آئے
چراغ اب رفتہ رفتہ ہو چلے روشن دکانوں میں
بسیرے کیلئے جاتی ہیں چڑیاں آستانوں میں
بجا گھنٹہ شوالے میں پجاری نے بھجن گایا   عبادت اور موسیقی نے ہر سو کیف پھیلایا

عقیدت مندوں نے بتوں میں بھی خدا کا حسن دکھلایا   کچھ ایسا درد تھا آواز میں دل سن کے بھر آیا
خموشی میں یکایک گونج اٹھے دیوار و در سب ہی
سڑک پر چلنے والے جھوم کر گانے لگے خود ہی

اس قسم کی نظموں میں ایک نہایت پر کیف نظم "مالن" ہے۔ اس کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے:۔

بھر کے دامن پھول والی یاسمن لائی ہے تو   بیچنے بازار میں حسن چمن لائی ہے تو
ماہ پرا اِن محبت کے لئے رہزن ہے تو   ہائے کتنی بےخبر سادہ دل مالن ہے تو

بلبلیں حسرت بھری نظروں سے تکتی رہ گئیں   بس ہی کیا تھا بیکسی میں سر پٹکتی رہ گئیں
پتے گر گر کر زمیں پر سر رگڑتے رہ گئے   خار تک ظالم ترا دامن پکڑتے رہ گئے

رات بھر شبنم تجھے بے درد مالن روئے گی   اب سحر کو کس کا منہ آکر چمن میں دھوئیگی
نور کی جب ماہ تاباں شب کو چادر لائیگا   وہ چھپانے کو چمن کا حسن کیونکر پائیگا
صبح کو آئے گا سورج گدگدانے کے لئے
باغ میں کوئی نہ ہوگا مسکرانے کے لئے

نور کے ٹکڑے پرو کر لائی ہے تو ہار میں   چاند کا دل توڑ کر لے آئی ہے بازار میں
مسکراتے ہیں خوشی سے یوں ترے دامن میں پھول   ہو دعا جیسے کسی ناچار و بیکس کی قبول
تیرے پھولوں میں ہے پوشیدہ تبسم حور کا   جسم لیکر آئی زاہد کی عبادت نور کا
پھول، تارے بن کے جتنے شب کے گلشن میں رہے
صبح کے دامن سے نکلے تیرے دامن میں رہے

"شب تاریک" میں کہتے ہیں:۔

تاریکی میں رقصاں ہے ستاروں کی چمک بھی
لبریز تبسم
محروم تکلم
سہما ہوا کچھ دور سے تکتا ہے فلک بھی

شب ہے کہ خیالات کی وسعت کا ہے ساماں
کیفیتِ لرزاں
تاروں میں ہے پنہاں
ہیں یہ مرے اشعار کے ارکانِ پریشاں

"ترِبینی" کے دو بند سنئے:-

پریاگ پہ بیٹھی ہوئی بہنیں جو ملی ہیں — پانی کی زمیں پر بھی تو کلیاں سی کھلی ہیں
کچھ گنگا کا رُکنا
کچھ جمنا کا جھکنا
پھر دونوں کا ملنا
دو پھول سے کھلنا
کس شوق سے اٹھلاتی ہوئی ساتھ چلی ہیں — یہ عشق و محبت کے نظارے ازلی ہیں

کہتے ہیں کہ جنت سے بھی آئی ہے بہن ایک — گر تینوں کا ہے اس میں گھر ایک وطن ایک
گھر جب سے چھٹا تھا
دل سرد ہوا تھا
وہ کوہ سے گرنا
وہ دشت میں پھرنا
راتوں کو وہ سنسان بیابان میں چلنا — سہمے ہوئے تاروں کا وہ سینے پہ مچلنا

تنہا وہ سفر دشت میں میدان میں بن میں — خاموش پہاڑوں میں گلستان میں چمن میں
جنگل سے نکلنا
رُکتے ہوئے چلنا
کچھ بڑھ کے پلٹنا
ڈر ڈر کے سمٹنا
مر مر کے اکیلے یہ گزارا ہے زمانہ — جیسے کوئی دُنیا میں نہو اپنا یگانہ

حقیقت یہ ہے کہ مناظر قدرت کی جیسی پیاری اور دل کو موہ لینے والی تصویر کیا افسر کے یہاں ملتی ہیں۔ ایسی اُردو کے دوسرے شعرا میں کم ملتی ہیں۔ ایک نظم ہے: "رات گنگا کے کنارے"

رات آئی ہے کس شان سے گنگا کے کنارے
بکھرے ہوئے ہر چار طرف نور کے پارے
اوپر بھی ہیں تارے
نیچے بھی ہیں تارے
گنگا کے کنارے

ہنستا ہوا اک چاند فلک پہ ہے نمایاں
اک دل میں ہے گنگا کے بصد کیف درخشاں
دونوں میں برابر
ہوتے ہیں اشارے
گنگا کے کنارے

آوازِ سکوں ریز کا لہروں پہ مچلنا
موسیقی کا رہ رہ کے خموشی سے نکلنا
ہیں ننھے ہی نغمے
میدان ہیں سارے
گنگا کے کنارے

موجوں کا یہ رقص اور یہ دلدوز تبسم
ہو جاتی ہے پل بھر کے نظر جن میں کہیں گم
کر دیتے ہیں جادو
دل پر یہ نظارے
گنگا کے کنارے

"چاندنی رات" میں تخیل نزاکت اور منظر کشی کا کمال ملاحظہ فرمائیے۔

چاندنی افسردہ بھی ہے زرد بھی — چھن رہا ہے ہلکا ہلکا درد بھی
دل کی دھڑکن گویا دل کو چھوڑ کر — منتشر ہے چاندنی کے فرش پر
کچھ پریشانی ہے ایسی ماہ میں — جیسے کھو جائے مسافر راہ میں
چاندنی میں کوئی شئے بیتاب ہے — حسن کا شانۂ پریشاں خواب ہے
خامشی جو ہمرو مہتاب ہے
بولنے کے واسطے بیتاب ہے

جذبات

بعض نظموں میں جذبات اس قدر مؤثر طریقہ سے ادا کئے ہیں۔ کہ بے تحاشا داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ "نوائے مہجور" میں کہتے ہیں،

ہے شورش پنہاں میں انداز دل آویزی چھنے لگی پھر دل میں نغموں کی غم انگیزی
ناکامیٔ مقصد کا ہے خوف مرادوں میں قوت نہ رہی باقی پھر میرے ارادوں میں
مانوس کچھ ایسا پھر میں غم الفت سے گھبرانے لگا پھر دل احباب کی صحبت سے

جب اس سے مرے دل کو تسکین نہیں ہوتی کیا تیرے تصور کی توہین نہیں ہوتی
میرے دل وحشی کی اللہ رے تنہائی معلوم یہ ہوتا ہے دنیا ہے تماشائی
حالت یہ وطن میں ہے مایوس تمنا کی انجان سا پھرتا ہو جیسے کوئی پردیسی
ناکام محبت کی اللہ رے مجبوری ہر قرب کے پردے میں پوشیدہ ہے اک دوری

ایک عورت آئینہ میں پہلے پہل سفید بال دیکھ کر کہتی ہے:۔

یہ کیا ہو گیا کیا نظر ہو گئی سر شام کیونکر سحر ہو گئی
بس اے آئینہ مجھکو دھوکا نہ دے نہ دے اس طرح دلکو چرکا نہ دے
ابھی میں ہوتی کہن سال کیوں بھلا ایسے ہوتے مرے بال کیوں
جوانی کا باقی ابھی دور ہے سفیدی نہیں یہ تو کچھ اور ہے
ستایا تھا نزلے نے جواب سے دور اسی کھو گئے کا ہو شاید فتور

"حسن سادہ" میں فرماتے ہیں:۔

گنگناتا کچھ گیا ہے کھیت سے ہوتا ہُوا چاندنی راتوں میں بیٹھا ہے کوئی کھویا ہُوا
کوئی کچھ پوچھے تو وہ ناچار صورت نوجواں کچھ بتانا چاہتا ہے پر نہیں کھلتی زبان
اور کچھ بولے تو دل دھڑکے زبان لکنت کرے جیسے رک رک کر پہاڑی سوتے سے پانی بہے
آنسوؤں کو سنبھالنے کی کوشش میں پلکیں تھام لیں گویا کچھ شبنم کے قطرے پھول کے رستے پہ ہیں

وطن دوستی

افسر کا رواں رواں حب وطن میں سرشار ہے۔ اُنھوں نے طرح طرح سے اس جذبہ کو ظاہر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے انھوں نے بچپن سے ایسی فضا میں پرورش پائی ہے۔ جو وطن دوستی سے لبریز تھی اپنے کسی دوست کو مخاطب کر کے ایک نظم میں بچپن کے دلوں کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

اے۔۔ بچپن کے دن بچپن کی راتیں یاد ہیں بیٹھ کر کرتے تھے جو باتیں وہ باتیں یاد ہیں
اب نہیں آراستہ ہوتی خیالوں کی وہ بزم ہائے وہ بچپن کے منصوبے وہ تجویزیں وہ عزم
وہ دعائیں اتحاد باہمی کے واسطے گفتگوئیں وہ وطن کی بہتری کے واسطے

ایک نظم میں کہتے ہیں۔

اک جھونپڑی ہے
سب کچھ یہی ہے
کیا سادگی ہے
کیا زندگی ہے
دنیا میں جنت میرا وطن ہے
وہ ترک آئے
بھارت پہ چھائے
جھنڈے اُڑائے
قرآن لائے
دنیا میں جنت میرا وطن ہے

ایک خمسہ کے دو بند ملاحظہ فرمائیے۔

یہ برسات کی ہلکی ہلکی پھوار ہواؤں کا چلنا یہ مستانہ وار
یہ کھیتوں کی سبزی چمن کی بہار یہ پھولوں کا شبنم سے دھل کر نکھار
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن
یہ خاموش اور خوشنما بستیاں کسانوں کے یہ چھوٹے چھوٹے مکاں
یہ سادہ لباس اور پیاری زباں ترقی کی رو سے یہ محرومیاں
ہمارا وطن دل سے پیارا وطن

ایک اور خمسہ کے دو بند ہیں:۔

ہرے بھرے ہیں کھیت ہمارے دنیا کو اَن دیتے ہیں
چاندی سونے کی کانوں سے ہم جگ کو دَھن دیتے ہیں
پریم کے پیارے پھول کی خوشبو گلشن گلشن دیتے ہیں
امن و امان کی نعمت سب کو بھر بھر دامن دیتے ہیں
بھارت پیارا دیس ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے
کرشن کی بنسی نے پھونکی ہے روح ہماری جانوں میں
گوتم کی آواز بسی ہے محلوں میں میدانوں میں
چشتی نے جو دی تھی مے وہ اب تک ہے پیمانوں میں
نانک کی تعلیم ابھی تک گونج رہی ہے کانوں میں
بھارت پیارا دیس ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

درس عبرت

جہاں تک اخلاقی تعلیم کا سوال ہے۔ افسر صاحب کا مطمح نظر بہت بلند ہے۔

اُنھوں نے اپنی اکثر نظموں میں طرح طرح سے اخلاق آموزی کی ہے لیکن اس قسم کی نظموں میں بھی شاعرانہ تخیل سے کوئی شعر خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

چمن میں کہہ رہا تھا غنچۂ شگفتہ بلبل سے　　جہاں ہو ضبط کی قوت وہاں آہیں نہیں ہوتیں

اسی زمین میں مذہب کے متعلق کس قدر پاکیزہ خیال نظم کیا ہے۔

مذاہب کیا ہیں راہیں مختلف ہیں ایک منزل کی
ہے منزل کیا؟ جہاں سب کچھ ہے پر راہیں نہیں ہوتیں

ایک مشہور خمسہ کے چند بند ہیں۔

درد جب دل میں ہو اُس دل کی دوا بن جاؤں　　کوئی بیمار اگر ہو تو شفا بن جاؤں
دکھ میں جلتے ہوئے لب کی میں دعا بن جاؤں

اُف وہ آنکھیں کہ ہیں بینائی سے محروم کہیں　　روشنی جن میں نہیں نور جن آنکھوں میں نہیں
میں اُن آنکھوں کیلئے نور ضیا بن جاؤں

دور منزل سے اگر راہ میں تھک جائے کوئی　　جب مسافر کہیں رستے سے بھٹک جائے کوئی
خضر کا کام کروں راہ نما بن جاؤں

عمر کے بوجھ سے جو لوگ دبے جاتے ہیں　　ناتوانی سے جو ہر روز جھکے جاتے ہیں
اُن ضعیفوں کے سہارے کو عصا بن جاؤں

اس قسم کی نظموں میں "فرشتے سے خطاب" بہت پُر تاثیر نظم ہے۔ کہیں کہیں سے اس کے چند شعر نقل کرتا ہوں۔

اے فرشتے اے مقدس روح تجھ پر ہو سلام　　آج ہمت کر کے ہوتا ہوں میں تجھ سے ہمکلام
میرے دل میں جاگزیں ہیں تیری سب اعلیٰ صفات　　پوچھتا ہوں میں بعد تعظیم تجھ سے ماجرائیات
تیری دنیا ہے جہاں ہوتا نہیں ہے غم وہاں　　غم سے تو نا آشنا ہے تو سکونِ دل کہاں

غم میں کتنا کیف ہے یہ بھی تجھے معلوم ہے　　کیفیت سے یہ تیری روحانیت محروم ہے
ہوتی ہے رنج و مصیبت میں جلا ہر روح کو　　غم سے رفعت ہوتی ہے اکثر میسر روح کو
کچھ خبر ہے دل کی دھڑکن میں ہے لذت کسقدر　　آنسوؤں میں کیف بھرتی ہے محبت کسقدر

میں نے یہ مانا خدا سے ہے بہت ہی تو قریب　　جانتا ہوں تجھ کو ہر لحظہ حضوری ہے نصیب
لیکن اے نور مجسم یہ بھی ہے تجھکو خبر　　ہم سے ہے نزدیک تیرا حسن والا کسقدر
آ کے دیکھے گر تو رگ رگ میں اُسے پائے گا تو　　اتنی قربت دیکھکر حیران رہ جائے گا تو
خاک کے پتلوں میں جلوہ اپنا دکھلاتا ہے وہ　　دیکھ تو آ کر ہر انسان میں نظر آتا ہے وہ
ہائے افسر ہے ہمارا دکھ مبارک کسقدر
دل میں سکھ بنکر وہ آتا ہے کبھی دکھ ہو اگر

دروس اخلاق کے سلسلہ میں ایک مختصر سی نظم اور سُن لیجئے۔ جو بہت مشہور ہوئی۔ اس کا عنوان ہے "درس عمل" فرماتے ہیں۔

عمل کی جنمیں قوت ہے اُنہیں ملتی ہیں تاثیریں　　نمایاں ہو حیات نو اگر ذروں کے دل چیریں
تڑپ ہو درد کی اب بھی اگر پیدا کسی دل میں　　تو لب ہوں آشنا آہوں سے آہوں میں ہوں تاثیریں
عمل کی محویت دنیا میں جن خوابوں کا باعث ہو　　ہمیشہ سچ ہوا کرتی ہیں اُن خوابوں کی تعبیریں
خدا توفیق دیتا ہے جنہیں وہ یہ سمجھتے ہیں　　کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں
طلب ہو زندگی کی تو سکون نا آشنا ہو جا
کہ نقطوں میں نہیں ہوتی ہیں اِن باتوں کی تفسیریں

بچوں کی نظمیں

میرا جی تو چاہتا ہے۔ کہ کلام افسر کے جواہر پاروں کا آپ کے سامنے ڈھیر لگا دوں۔ مگر رسالہ کے صفحات میں اتنی گنجائش نہیں۔ بہر طور کلام افسر کی دو خصوصیتوں کا ذکر کئے بغیر یہ مضمون قطعاً غیر مکمل رہ جائیگا۔ اور یہ دونوں خصوصیتیں ایسی ہیں۔ جن میں افسر صاحب منفرد ہیں۔ ان میں پہلی چیز بچوں کی نظمیں ہیں۔ اُردو میں بچوں کی نظمیں اس قدر کم تعداد میں کہی گئی ہیں۔ کہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ افسر صاحب نے جس قسم کی نظمیں بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ اُس قسم کی نظمیں اُردو میں اب تک ناپید تھیں۔

"نرسری پوئمز" کا انگریزی اور ترقیافتہ زبانوں میں بہت رواج ہے۔ لیکن اُردو میں افسر صاحب سے پہلے کسی نے ایک بھی "نرسری پوئم" نہیں لکھی۔ اس کے علاوہ اور بھی جو نظمیں ہیں۔ اُن میں آپ کو بچپن کی خوشبوؤں اور بچپن کی معصومیت اور سادگی کی جھلک نظر آئے گی۔ اور آپ اِن میں معصوم دنیا کے ان واقعات کا عکس دیکھیں گے، جن کا ذرہ ذرہ بچوں کی نظر میں صدہا حقیقتوں کا سرمایہ دار ہے۔ اِن میں بچے اپنے دل کی بھولی بھولی باتیں پائیں گے۔ اور یہ باتیں اُن لفظوں میں ہونگی۔ جن سے وہ اچھی طرح آشنا ہیں۔ ایک نظم کا عنوان ہے۔ "چاند کی پریاں" کہتے ہیں:-

امّاں باجی کہتی ہیں   چاند میں پریاں رہتی ہیں
رات کو پَر پھیلاتی ہیں
اُور اُتر کر آتی ہیں
سب بچوں کو سُلاتی ہیں
اور پھر خواب دکھاتی ہیں
امّاں باجی کہتی ہیں   چاند میں پریاں رہتی ہیں
میں تو آج نہ سوؤں گا
رات گئے تک جاگوں گا
باہر باغ میں بیٹھوں گا
چاند کی پریاں دیکھوں گا
امّاں باجی کہتی ہیں   چاند میں پریاں رہتی ہیں

ایک اَور لطیف نظم سنیئے:-

تارہ سا لہراؤں   کنکوا بن جاؤں
جب امّاں تم آؤ
چھت کو خالی پاؤ
چُپ کی چُپ رہ جاؤ
سارے میں ڈھنڈواؤ
پھر بھی میں نہ آؤں   کنکوّا بن جاؤں
ڈور کو جب تم پاؤ
کھینچو اُور کھنچواؤ
اور ہنستی بھی جاؤ
اُور پھر مجھ کو بلاؤ
تب میں گھر میں آؤں   کنکوّا بن جاؤں

اخترؔ صاحب نے بچوں کیلئے بہت سی عجیب عجیب اور دلچسپ نظمیں کہی ہیں۔ یہاں میں صرف ایک نظم اَور پیش کرونگا۔ اس نظم کا عنوان ہے ”منتدیا پور“

دور بہت ہی دور یہاں سے   اور اس سے بھی دور
ندی اک بہتی ہے جہاں سے   اور اس سے بھی دور
دلدل ہے گہری سی جہاں پر   دلدل سے بھی دور
جنگل میں ہے بڑھیا کا گھر   جنگل سے بھی دور
یاد ہے اُس کو ایک کہانی   ہے اُس میں اک حور
حور یہ ہے اک ملک کی رانی   ملک ہے منتدیا پور

تغزل

اختر صاحب کا دوسرا زبردست کارنامہ تغزل کی اصلاح ہے۔ ہمارے یہاں مضامین غزل کچھ رواجی طور پر اس قدر یکساں چلے آ رہے ہیں۔ کہ ہر شاعر کے دیوان میں قریب قریب وہی مضامین مختلف لفظوں میں نظر آتے ہیں۔ اخترؔ صاحب نے قطعاً اس کی پابندی نہیں کی۔ اور جس طرح اپنی نظموں میں اُنھوں نے ایک بالکل نیا رنگ اختیار کیا۔ اسی طرح غزلوں میں بھی ان کی انفرادیت پورے طور پر نمایاں ہے۔ ابتک غزل داخلی مضامین کے لئے مخصوص رہی ہے۔ لیکن اختر صاحب نے خارجی مضامین کو داخلی رنگ میں رنگ کر اس خوبصورتی کیساتھ پیش کیا ہے۔ کہ انکی غزلیں انتہائی کیفیت اور تاثیر سے لبریز ہوگئی ہیں۔ میں ذیل میں صرف چند غزلوں سے جستہ جستہ شعر پیش کرونگا تاکہ آپ کو اختر صاحب کے رنگ تغزل کا اندازہ ہوسکے۔ فرماتے ہیں:-

نظر کے سامنے آ جنگلوں میں لوٹنے والے   کوئی دھیمی رسیلی ہلکی آوازوں سے کیا سمجھے
رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کوئل نے   نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

تیری بھی اے ابرِ نیساں ہر صورت دلکش ہوتی ہے
جب جانِ بہار ہے قطرہ ہے جب زیبِ تاج ہے موتی ہے
دنیا کے ظاہر بینوں کی نظرت یہ نظر کب ہوتی ہے
جو قطرہ ہے وہ قطرہ ہے جو موتی ہے وہ موتی ہے

پہاڑوں کا بنا رکھا ہے تکیہ   مزے کی نیند بادل سو رہے ہیں
چمکتی ہے یہ بجلی ابر میں یا   کسی سے کچھ اشارے ہو رہے ہیں

یہ دلنوازیٔ جنگل کی خامشی میں   لرزہ سا آرہا ہے تاروں کی روشنی میں
للہ یہ بتا دے اے جذبۂ محبت   کیا حسن ہے خدا میں کیا عیب آدمی میں
جنگل کی رات اخترؔ گو پر خطر ہے لیکن   امید کی جھلک ہے بستی کی روشنی میں

ضَو ہے برسات کی جنگل پہ وقت شام ہے — ایک تارا ہے سو وہ بھی رعشہ براندام ہے
بادلوں کی سرزمیں پر نغمہ ہائے جانفزا — مرغ خوش پرواز آزادی اسی کا نام ہے

پریشانی ہے جی گھبرا رہا ہے — کوئی دھیمے سُروں میں گا رہا ہے
میری آنکھوں سے ظاہر ہو نہ جائے — کہ اک بادل سا دل پر چھا رہا ہے
تصوّر کی یہ مقصد آفرینی — میں سمجھا کوئی سچ مچ آرہا ہے

اثر دیکھا دعا جب رات بھر کی — ضیا کچھ کچھ ہے تاروں میں سحر کی
یہ بجلی ہے کہ اے ابرِ شبِ ہجر — ہے دھجّی ایک دامانِ سحر کی

پیری میں آ رہے ہیں جوانی کے ولولے — گویا نمودِ صبح کی خواہش ہے دن ڈھلے
ہو قرب اور پھر وہی دلبستگی رہے — ہیں اصل میں یہی تو محبت کے مرحلے

کچھ توجہ خاص ہوتی ہے عیاں — نام لے لے کر نہ کوسا کیجئے
میں نے کچھ پوچھا تو وہ کہنے لگے — آپ ہم سے کچھ نہ پوچھا نہ کیجئے
مصلحت کا ہے تقاضا احتیاط — دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجئے

بزم میں تیری کوئی بیخود کوئی مدہوش ہے — او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے
سامنے تُبت ہیں تو رُسوائی کا کسکو ہوش ہے — یا الٰہی تو گنہگاروں کا پردہ پوش ہے
بزم میں اِن مدبھری آنکھوں کو گردش دے مگر — اسکا اندازہ تو کرلے کسکو کتنا ہوش ہے
ہم کہاں ہیں ہم کہاں تھے ہمکو اسکی کیا خبر — تمنے پردے کو اُٹھایا تھا بس اتنا ہوش ہے
یہ نظر کی جنبشیں یہ چال اِٹھلائی ہوئی — کچھ تمہیں بھی آج اپنی بیخودی کا ہوش ہے

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے — چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے
نظر کو روک لے اے حسن بے پردہ کے متوالے — کہ ان بیتابیوں سے شوق کی تضحیک ہوتی ہے
وہ دولت جسکا دنیا نے مسرت نام رکھا ہے — تری جلوؤں کی دامانِ نظر میں بھیک ہوتی ہے

میں نے اس مضمون میں بجائے تبصرہ کرنے کے کلامِ افسر کے چند نمونے پیش کرنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ آپ اس باکمال شاعر کے اندازِ کلام کا بطورِ خود اندازہ فرما سکیں۔ افسر صاحب کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "پیامِ روح" کے نام سے انڈین پریس الٰہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ دوسرا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔

ادارہ

غزل

(از جناب نجم آفندی اکبرآبادی)

موت سو بار آئے خاطر میں نہ لانا چاہیئے
مرتے مرتے زندگی کا گیت گانا چاہیئے

مسکرا کر زخم کھانے کا مزا کچھ اور ہے
یہ بھی برحق زخم کھا کر مسکرانا چاہیئے

جس طرح چاہیں زمانہ کو بدل دیں اہل دل
پست ہمت ہیں جنہیں اگلا زمانا چاہیئے

اپنی ہستی سے بھی کل بیگانگی ہو گی تو ہو
آج موجودات کو اپنا بنانا چاہیئے

آؤ دل کے مسئلہ کا حل بتا دیں ہم تمہیں
بات کرتے ہو تو پہلے مسکرانا چاہیئے

فرض ہے حفظ مراتب عزت نفس حیات
موت سے دو اک قدم آگے ہی جانا چاہیئے

رشک دشمن کیا بلا ہے شاد باش دوست کیا
آپ اپنی داد دے کر دل بڑھانا چاہیئے

زندگی یہ ہے جدھر ہم ہوں ہوا اُس رخ کی ہو
کون کہتا ہے ہوا کے رخ پہ جانا چاہیئے

وسعت کونین کم ہے اپنی ہستی کے لئے
اپنے دل میں اپنی آنکھوں میں سمانا چاہیئے

اسقدر بے کیف اگر گذری تو کیا گذری حیات
ایک شب کی شب تو پھولوں میں بسانا چاہیئے

یہ سکوں کا عالم بے دلی سے کم نہیں
نجمؔ بیٹھے کیا ہو کچھ طوفان اٹھانا چاہیئے

اقبال کا آخری قطعہ

(از جناب ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ)

اقبالؒ ایک شاعر اور حکیم نہ تھے بلکہ ایک پوری دنیا تھے ایک جہانسوز مجاہد اور دل جلے عاشق تھے، انہوں نے آنسوؤں، فریادوں، آہوں اور نالوں کے سوا دنیا کی نعمتوں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

حضرت اقبالؒ قوم سے کسقدر مایوس ہوکر گئے اس کا اندازہ ان کے آخری قطعات سے ہوسکتا ہے، یوں فرماتے ہیں۔ قطعۂ ذیل کو آخری کلام سمجھنا چاہئیے:

بہشتے بہر ارباب ہمم ہست ؛ بہشتے بہر پاکانِ حرم ہست!
بگو با مسلمِ ہندی کہ خوش باش! ؛ بہشتے فی سبیل اللہ ہم ہست!

ترجمہ۔ بہشت ہمت والوں کو ملتی ہے، بہشت دینداروں کو ملتی ہے، لیکن میں ہندی مسلمانوں سے کہتا ہوں کہ خوش باشیاں کرتے رہیں کہ تمہیں بھی کوئی خیراتی بہشت مل جائے!!

میں قوم سے دست بستہ استدعا کرتا ہوں کہ اگر وہ حضرتِ اقبالؒ کی روح اطہر کو خوش کرنا چاہتی ہے تو وہ ان کے فرامین پر جلد از جلد عمل پیرا ہونے کی کوشش کرے اور اپنے آپ کو صحیح معنوں میں مسلمان بنائے!

حضرت اقبالؒ کی یاد میں رونے چلّانے سے اور ماتم کرنے سے یہ فرض ادا نہیں ہوسکتا ہم صرف صحیح معنوں میں مسلمان بنکر حضرت اقبالؒ کی روح اطہر کو خوش کرسکتے ہیں، میں ماتم کرنے کا قائل نہیں ہوں حضرت اقبالؒ زندہ ہیں اور ہمیشہ رہینگے:

کافر ہیں جو منکر ہیں حیاتِ شہدا کے ؛ ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے!

میں خاصکر اس قطعہ سے بیحد متاثر ہوا جو حضرتِ ممدوح نے انتقال سے دس منٹ پیشتر پڑھا تھا، میں نے اس سے متاثر ہوکر ایک قطعہ اس کے جواب میں قلمبند کیا ہے جسکو حضرتِ اقبال کے حضور نیرنگ خیال کے ذریعے پیش کرنا چاہتا ہوں۔

حضرتِ اقبال کا قطعہ جسکو انتقال کے دس منٹ پیشتر آپ نے پڑھا تھا۔ یہ ہے:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید ؛ نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے ؛ دگر دانائے راز آید کہ ناید

(ترجمہ) اب گایا ہوا گیت واپس لوٹے یا نہ لوٹے، اب حجاز کی ٹھنڈی ہوا آئے یا نہ آئے، اس فقیر کی زندگانی کا وقت پورا ہوتا ہے اب کوئی دوسرا راز داں پیدا ہو یا نہو"

میں نے اپنے قطعہ میں حضرت اقبالؒ کو یقین دلایا ہے ہم کو اب دوسرے دانائے راز کی حاجت نہیں ہے، ہمارے لئے آپکے فرامین کافی ہیں، قطعہ حسبِ ذیل ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ کے حضورِ اقدس میں......

خدائے[1] بے نیاز آید کہ ناید ؛ کلیمے در حجاز آید کہ ناید!
چگونہ دیں نوازی کرد اقبالؒ ؛ چہ غم! دانائے راز آید کہ ناید!

(ڈاکٹر محمد عباس علی خاں لمعہ حیدرآبادی)

میرے پاس مرحوم کے بہت سے غیر مطبوعہ خطوط ہیں جو موقعہ پر شائع کرنیکے لئے آپکے پاس بھجواؤنگا، میں نے اقبالؒ علیہ کو خوش کرنیکے لئے شاعری کی اور مجھے یقین ہے کہ میں نے حضرتِ ممدوح کو خوش کیا اور جبتک میں زندہ ہوں اُنکی روحِ اطہر کو خوش کرنیکی کوشش ضرور کروں گا، چند اشعار ممدوح سے متعلق درج ہیں:

اقبال تو سراپا اسرارِ ایزدی تھا ؛ افسوں ترا تکلّم تو شعر کا نبی تھا
اقبالِ دنیا اقبالِ عقبےٰ ؛ اینجا ہم اقبال، آنجا ہم اقبال!
ہم جانِ مشرق ہم جانِ مغرب! ؛ فرمانِ حضرت محمد اقبال
سچ پوچھو تو اقبال تھا اک سازِ خدا کا ؛ پیغام حقیقت کا تھا اک رازِ خدا کا

[1] موجد فلسفۂ خودی سے مراد ہے۔

نگہت[۱]

(از جناب راجہ مہدی علی خاں)

مری پیاری نگہت ثریا جبیں — کسی پھول کے خواب سے ہے حسیں

نگہ شوخ اُس کی ادائیں شریر — اگر دل میں "ہاں" ہے تو لب پر "نہیں"

کنول سے سفید اُس کا حُسنِ صبیح — لباس اُس کا قوسِ قزح سے حسیں

ہر اِک اُس کا نقشِ قدم حُسن میں — قسم ہے کہ ہے رشکِ ارژنگِ چیں

حیا کی وہ معصوم تصویر ہے — وہ ہے لاجونتی سے بھی شرمگیں

ستاروں سے چھپ چھپ کے رہتی ہے وہ — اُسے چشمِ مہ تک نے دیکھا نہیں

شبستاں میں جب آئے وہ شمع رُو — شبستاں میں پھر شمع جلتی نہیں

حقیقت ہے لطف اُس کے آغوش کا — فسانہ ہے آغوشِ خُلدِ بریں

کٹی زندگی اُس کے جو روبرو — خدا کی قسم مجھ کو بھولی نہیں

وہ آئے تو اِس گھر میں آئے بہار — نہ ہو زندگی اپنی اندوہگیں

درخشاں مری عمر کی رات ہو

نہیں جس کی اُمید وہ بات ہو

۱ یہ نام فرضی ہے۔

(مہدی علی خاں)

غزل

(از جناب مخمور صاحب جالندھری)

تو عشق کا ہر دردِ جفا کار مجھے دے　　اس سے بھی نرالا کوئی آزار مجھے دے

تکلیفِ وفا اور دلِ زار مجھے دے　　جو مرحلہ ہو عشق میں دشوار مجھے دے

جلوے ترے رنگین ہیں آنکھوں کی ہوس تیز　　تو خواب میں بھی دیدۂ بیدار مجھے دے

میں ان سے بناؤں گا نئی عمرِ محبت　　جو لمحے زمانے کے ہوں بیکار مجھے دے

ہے ضبط تو غماز کروں ضبط میں کیونکر　　دینا ہے جو غم قابلِ اظہار مجھے دے

اور اس نے کیا میری مصیبت میں اضافہ　　کب میں نے کہا تھا دلِ بیمار مجھے دے

عرفانِ حقیقت سے نہ رکھ عشق کو غافل　　دیوانہ ہوں میں فطرتِ ہشیار مجھے دے

میں موت کو تا حشر غمِ عشق میں ٹالوں　　اپنی سی جو تو شوخیٔ انکار مجھے دے

آگے نکل آیا ہوں میں ہستی کی حدوں سے　　اس سے بھی سوا منزلِ دشوار مجھے دے

تیری وہ حقیقت ہے کہ میں پھر بھی چھپاؤں　　تو آنکھ جو پردہ درِ اسرار مجھے دے

میں اپنا وہ سر دوش پہ جو بار ہے رکھ دوں　　اتنی تو جگہ سنگِ درِ یار مجھے دے

مخمور کو پھر تشنہ لبی کی ہے شکایت
اے مست نظر جرعۂ سرشار مجھے دے

عشق

(از جناب عطاء الرحمٰن صاحب - ممتاز)

باعثِ آبادیٔ شہر و بیاباں عشق ہے
موجبِ شادابیٔ صحنِ گلستاں عشق ہے
کفر ترکِ عشق ہے مقصودِ ایماں عشق ہے
عقل کالی رات ہے، صبحِ درخشاں عشق ہے

بس یہی سرمایۂ دنیا و دیں رکھتا ہے دل
ڈھونڈتا ہے عشق ہی کو صوت و آہنگ میں
ڈھالتا ہے عشق ہی کو حسنِ زنگار رنگ میں
پا گئے اہلِ نظر دل میں سراغِ عاشقی

عشق ہی سے ہے نمودِ جلوہ ہائے کائنات
بس اسی محفل میں روشن ہے چراغِ عاشقی

عشق کیا ہے ابتدا و انتہائے کائنات
کوئی دیکھے تو بہارستانِ داغِ عاشقی

عالمِ فانی میں روحِ زندگانی عشق ہے
بعدِ مردن بھی کھلا رہتا ہے باغِ عاشقی

بزمِ خاکی میں نویدِ آسمانی عشق ہے
مرکزِ نورِ ازل یہ پارۂ گل ہی تو ہے

سربلندی بختیاری، کامرانی عشق ہے
جنت الفردوس کہتے ہیں جسے دل ہی تو ہے

ماسوائے عشق پیری ہے جوانی عشق ہے
حسن ظاہر دل سے لاکھ اظہارِ بیزاری کرے

ہے عبارت زندگی ہنگامہائے عشق سے
عشق سے نفرت کرے یا ترکِ دلداری کرے

جلوۂ ہستی کی رونق ہے بقائے عشق سے
یار ہے وقفِ تغافل یا دلآزاری کرے

ماسوا سے کچھ تعلق ہی نہیں رکھتا ہے دل
دہر میں آئینِ استبداد کو جاری کرے

ایک ہی صورت سے جسکے دلنشیں رکھتا ہے دل
عشق سب کچھ دیکھتا جائیگا ہنستا جائے گا

عشق ہی کی کارسازی پر یقیں رکھتا ہے دل
ابرِ رحمت کی طرح ہر سو برستا جائے گا

میرا بھائی کہاں ہے؟

(مسز ہمانس کی ایک نظم سے متاثر ہو کر)

اے ماں! میرے بھائی کو واپس بلا دو۔ گلستاں اپنے فردوسِ نظر نظاروں کی وجہ سے پھولا نہیں سماتا۔ رنگ و بو کی شہزادیاں آراستہ ہیں، شہد کی مکھیاں اپنے مترنم لبوں سے پھولوں کو چوم رہی ہیں ——— میرا بھائی کہاں ہے؟

(۲)

حسین تتلیاں سورج کی سنہری کرنوں میں اُڑ رہی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رنگ و بو کی پریاں موسیقی کی وادیوں میں رقصاں ہیں باغ میں اُڑتی ہوئی ان حسین تتلیوں کو پکڑنے کو میرا دل نہیں چاہتا ——— اے ماں! میرے بھائی کو میرے پاس بلا دو!

(۳)

اس گلاب کے پودے میں جسے ہم دونوں بھائیوں نے لگایا تھا بہت سے خوبصورت پھول کھلے ہیں ——— انگور کا پودا بھی پھلوں سے لدا ہے لیکن کوئی ان کو توڑنے والا نہیں ہے ——— میں بھی نہ توڑونگا کیونکہ میرا بھائی اسوقت نہیں ہے اور میں اس کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا ——— مہربانی کر کے کوئی میرے بھائی کو بلا دے!

(۴)

بھولے بچے! وہ ہماری آواز نہیں سنے گا اور نہ وہ اب تیرے پاس آسکتا ہے، وہ خوبصورت اور حسین چہرہ جو ایک مرتبہ عید کے چاند کی طرح مسکرایا تھا، اب تم نہیں دیکھ سکتے!

(۵)

گلاب کی طرح تبسم آگیں مگر مختصر زندگی تیرے بھائی کو بھی نصیب ہوئی تھی، جا ——— تجھے تنہا کھیلنا چاہئے۔ میرے بچے! تیرا بھائی جنت میں ہے!

(۶)

کیا میرے بھائی نے ان خوبصورت چڑیوں اور ان رنگین پھولوں کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہدیا۔ کیا یہ واقعی سچ ہے کہ میں اپنے بھائی کو پکارنے میں ناکام رہوں گا اور کیا مبارک بہار کے ان لامحدود لمحوں میں وہ کبھی بھی مجھے دیکھنے نہیں آئے گا ——— ؟؟؟

(۷)

کھیلتی ہوئی ندی اور دولھن کی طرح آراستہ سبزہ زار ——— جہاں ہم دونوں بھائی کھیلا کرتے تھے ——— کیا بالکل برباد ہوگئے؟ اُف! اگر مجھے معلوم ہوتا تو اسی وقت جبکہ میرا بھائی میرے ساتھ ہنس ہنس کر کھیلا کرتا تھا، میں اسے جی بھر کے پیار کر لیتا!!

(سلام مچھلی شہری)

تبرکاتِ خیال!

نواب نصیر حسین خیال
کا
ایک غیر مطبوعہ خط

لکھنؤ - ۴ / جون ۱۹۳۱ء

احب الصالحین ولست منہم لعل اللہ یرزقنی صلاحًا!

عزیز والاشان، "موجِ نسیم" اور موجِ تسنیم (خط) دونوں کا ساتھ شکریہ قبول کیجئے، میں عشرہ بھر لکھنؤ سے باہر رہا، کل لوٹا اور آج یہ خط لکھ رہا ہوں، رسالہ کو پڑھ کر مجھے تعجب کم اور افسوس زیادہ ہوا، محاورات وغیرہ سے لاعلمی تو خیر، مگر جو لوگ معمولی اور روزمرہ کے الفاظ کی تانیث و تذکیر سے بھی بے خبر ہوں، وہ اُردو میں تحریر و تقریر کی کیوں ہوس کرتے اور اس زبان کے کیوں پیچھے پڑتے ہیں؟! ایک ایسے پرچہ میں آپ کی رباعیوں کا شائع ہونا مجھ پر بہت گراں گزرا، یہاں کے ایک جلسہ میں، ایک مرتبہ عظیم آباد کے ذکر میں کہہ چکا ہوں کہ "گو اُس شہر کی زبان عرصہ ہوا کہ رخصت ہو چکی، مگر پرانوں میں شائق اور جوانوں میں حمید اب بھی وہاں ایسے ہیں جن کی زبان یہاں کے شرفا کی زبان سے کم نہیں اور میں ان دونوں پر اعتبار کرتا ہوں" میں تو یہ کہوں اور آپ ایسے رسالوں میں اپنا کلام دے کر خود کو رُسوا اور مجھے لغو ثابت کریں!

آپ کی رباعیاں اچھی ہیں، مگر تیسری رباعی کا چوتھا مصرع

چلتی ہوئی چھاؤں ہے جوانی میری

غور طلب ہے، محاورہ میں چلتی پھرتی چھاؤں کہتے ہیں، اس میں کوئی لفظ کم و بیش ہو تو محاورہ میں تصرف ہوگا اور وہ ناجائز، اس پر نظر کیجئے

حضرت .... کی بھی ایک غزل رسالہ میں شائع ہوئی ہے اُس کے اس مصرعہ، طریقِ خاص کا ہر ایک کو پائے بند کیا، کو دیکھیے، یہ غزل اگر قبل آپ کو دکھائی جاتی تو پائے بند (بجائے پابند) کا سا غیر فصیح بلکہ غلط لفظ اُس میں رہنے نہ پاتا، اہلِ محاورہ اور اہلِ نظر ایسی غلطیوں کو دیکھ کر کیا کہیں گے؟!

ڈاکٹر صاحب کی غزل بھی پڑھی، یہ پہلی مرتبہ مجھے اُن کی نظم کے دیکھنے کا موقعہ ملا ہے، زبان و محاورہ کی بے خبری کی وجہ سے قافیے اور ردیف کی دوری تو خیر، مگر اس ؎

گھول کر نقشِ قدم اُس کا پلایا کس نے؟

کو کیا کہا جائے، نقشِ قدم بھی کیا تعویذ یا ڈاکٹری گولیاں ہیں کہ گھولی جائیں نقشِ قدم ہاں دُھل سکتا ہے، مگر وہ بھی کیا، غزل بغور پڑھ جائیے، افسوس کیجئے گا، مگر اُس میں یہ شعر بھی ہے۔

لختِ دل خونِ جگر کھاتے ہیں کھانے والے
ایسے ٹکڑوں پہ بھی آتا ہے گذارا کرنا!

اس نے غزل کو سنبھال لیا، ان حضرات کی مثال تازی گھوڑے کی سی ہے۔ اصالت موجود۔ لیکن اچھے شہ سوار کی ران باگ دیکھی نہیں قدم تو چلے، مگر جب پھریری لی، طبیعت سے مجبور ہو کر دولتی جھاڑ دی!

عزیز من! صحیح مذاق کا حاصل ہونا اور کسی زبان کا آنا ایک دو

دن کی بات نہیں، برسہا برس اور بڑی تپسیا کے بعد کچھ آتا ہے، اُردو کمبخت سب زبانوں سے مشکل زبان ہے، اِس میں الفاظ و محاورات کا نہ کوئی صحیح لغت اور نہ اُن کی جائے استعمال کی کوئی معقول کتاب کہ وہ رستہ بتائے، اس لئے چارہ نہیں کہ اہلِ اُردو اور زباندانوں کے آگے زانوئے ادب تہ کیا جائے، اُن کی زبان و محاورات کو سُنا اور یاد کیا جائے اور یہ وہاں نایاب، اور اگر ایسی صحبت ملی بھی تو چند دقیقہ یا چند گھنٹے، ہم اپنے گھروں میں جب آئے تو وہ بولیاں سُنیں کہ خدا نہ سُنوائے، اور پھر یہ آوازیں ۲۴ گھنٹہ کانوں میں بسی ہوئی، لامحالہ وہی زبانوں سے نکلیں گی، یہ کمزوری کیونکر دُور ہو سکتی ہے؟ اہلِ بہار کی مادری زبان نہ کبھی اردو تھی نہ اب ہے، اُس صوبہ میں بچھاں اور خصوصاً دِلّی اور لکھنؤ سے لوگ گئے اور وہاں بسے، بیشک وہ ممتاز تھے، اُن کی زبان کا ایک گونہ اثر بھی پڑا، مگر ایسوں کی تعداد ہی کیا۔ بہت ہوں گے تو دس بیس ہزار، وہ دو کروڑ پر غالب کیونکر ہو سکتے نتیجہ یہ کہ وہ خود مغلوب ہو گئے، اور رفتہ رفتہ زبان کی وہ حالت ہوگئی جو آج آپ دیکھتے ہیں، آپ نے سُنا تو ہوگا کہ ایک زمانے میں وہاں میرے گھر کی زبان مانی جاتی تھی، یہ کیوں؟ اس خاندان کے زیادہ تر لوگ دِلّی سے آئے اور وہ ملتے بھی رہے تو اپنے ہم چشموں سے، ہمہ شما کی صحبت سے دُور رہتے، اس لئے اُن کی زبان ایک زمانہ تک محفوظ اور فی الجملہ اچھی رہی، مگر جب سے وہ دَور رخصت ہوا۔ خاص بہاریوں کے ساتھ نشست و برخاست رہی، اُن کی بولیاں اور اُن کے محاورات سیکھے گئے، زبان گئی اور اس کے ساتھ معاشرت بھی، نتیجہ یہ کہ اب وہی گھر ہے کہ وہاں جائیے تو وہ بولیاں اور وہ آوازیں سُنئے کہ توبہ بھلی، جب میرے گھر کی یہ حالت ہو جائے تو میں دوسروں کو کیا کہوں اور کس منہ سے ٹوکوں، اور جب وہاں کے چالیس چالیس اور پچاس پچاس برس کے مشاق شعرا جانوروں کی بولیاں بولیں تو میں اَنیلوں اور بچوں کی کیا گرفت کروں، غرضکہ پٹنہ اور بہار کی مادری زبان نہ کبھی اُردو تھی اور نہ اب اُردو ہو سکتی ہے، ہاں! فارسی دانوں اور انگریزی دانوں کی طرح وہاں اُردو دان بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور نام نکال سکتے ہیں مگر ان کی تعداد ہمیشہ اتنی کم ہوگی کہ اُن کا اثر عام نہیں ہو سکتا، دوسری دشواری یہ ہے کہ وہاں ابتک صرف غزلوں کا شوق ہے اور غزلیں ہر کہ و مہ کی زبان کو درست و با محاورہ اور عام نہیں کر سکتیں، وہاں شروع سے نثّار پیدا ہی نہیں ہوئے، کہ ان کی تصنیفیں عوام پر اثر ڈالتیں زبان پھیلتی اور بعد کو درست کر لی جاتی، تیسری دقت یہ دیکھ رہا ہوں کہ وہاں اب جو لوگ اُردو کی طرف ذرا متوجہ نظر آتے ہیں وہ لاہوتی کشمیری اور پھر اعظم گڈھ کی بولیاں بولنا چاہتے ہیں، پھر زبان اور بگڑے گی یا درست ہوگی؟ چوتھی مشکل یہ ہے کہ اُردو، فارسی اور عربی کے ذریعہ سے حاصل کی جاتی ہے، ان زبانوں کے دو چار بے ربط و بے موقع الفاظ زبان میں ٹھونس لئے اور زباں داں ہی نہیں، اہلِ زبان بن گئے! اسی پرچہ (موجِ نسیم) کے صفحہ ۱۳ کا یہ فقرہ پڑھئے "مجھ کو تقریباً وسطِ سن مراہقت سے شاعری کا مشغلہ ہے"، اس مراہقت کو یاد کر کے سر بزانو ہو جئے اور پھر اُردو بولنے کا نام نہ لیجئے۔ جہاں کی یہ حالت ہو، وہاں کی زبان خالقِ زبان ہی درست کرے تو ہو، ہماری آپ کی مجال نہیں۔

رسالہ کے متعلق چند سطروں میں اپنے خیالات میں نے قلمبند کر دیئے ہیں، پڑھئے، پسند آئے اور مناسب ہو تو پرچہ میں چھپوا دیجئے۔

حضرت امداد کی اسپیچ کا آخر کیا فیصلہ ہوا، اُن کا شوق معلوم، آپ اُٹھیں تو شاید کچھ ہو جائے، ورنہ وہ ردّی تو تھی ہی اب کوڑے میں ہوگی، وہ چھپ جاتی تو پٹنہ کا اگلا حال بھی کھلتا اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ خیر وہاں، امداد کی طرح اب بھی اُردو لکھنے والے کچھ باقی رہ گئے ہیں۔

عزیزی شبّو میاں کو دعا و سلام۔ امیر نواب اور اُنکی بہن مسوری پہاڑ پر ہیں آپ کا سلام پہنچا دیا جائے گا۔ والسلام

دعا گو خیال

مرسلہ نسیم گورگانی

۱؎ مولانا سلیمان ندوی کی طرف اشارہ ہے۔ بہ حیثیت زباں داں کے مولانا سلیمان ندوی نہ قبل مستند تھے اور نہ آج ہیں، خیال مرحوم نے یہ لکھ کر اردو جاننے والوں کے سامنے ایک بہت بڑے راز کا انکشاف کیا ہے۔ نسیم گورگانی

اُردُو زبان کا شکوہ

(نتیجہ فکر جناب آغا شبیر احمد خاں۔ خاموش۔ بی اے۔ بی ٹی۔ ایل ایل بی)

یہ ہند وطن میرا — یہ ہند چمن میرا
اس خاک پہ قرباں ہے — ہر موئے بدن میرا
اس دیس کے ذرّوں نے — چوما ہے دہن میرا
سو سال سے زائد کا
یہ گھر یہ وطن میرا
گردش ہے زمانہ کی
میں گھر میں بھی بے گھر ہوں

ایراں سے نہیں آئی — افغاں سے نہیں آئی
مغرب کی فضا مجھ کو — ہرگز نہ یہاں لائی
اس دیس سے میں اٹھی ہوں — اس دیس پہ ہوں چھائی
بچپن بھی جوانی بھی
سب نذرِ وطن کر دی
گردش ہے زمانہ کی
میں گھر میں بھی بے گھر ہوں

فارس کے نشاں مجھ میں — عربوں کے بیاں مجھ میں
ویدا اور پرانوں کے — سب راز نہاں مجھ میں
میں دیس پجارن ہوں — رشیوں کی زباں مجھ میں
ہندو و مسلماں کی
دونوں کی زباں میں ہوں
گردش ہے زمانہ کی
میں گھر میں بھی بے گھر ہوں

یہ کوہ و دمن میرا — یہ گنگ و جمن میرا
صحرا و چمن میرا — یہ صحن وطن میرا
مخمور فضاؤں میں — اندازِ سخن میرا
گھنگھور گھٹاؤں میں — اک سازِ کہن میرا
اس دیس کے نغموں سے
میں دُور کہاں جاؤں
گردش ہے زمانے کی
میں گھر میں بھی بے گھر ہوں

اپنوں کی حکومت ہے — اور مجھ سے یہ نفرت ہے
حقدار توجہ بھی — بیگانہ راحت ہے
اغیار سے کیا شکوہ — اپنوں سے شکایت ہے
اب نام تو بدلا تھا
صورت بھی بدل ڈالی
گردش ہے زمانے کی
میں گھر میں بھی بے گھر ہوں

غالب کی زباں میں ہوں — سرشار کی جاں میں ہوں
اقبال کے نغموں میں — سرور و جواں میں ہوں
چکبست و نظیر اکبر — ان سب کی فغاں میں ہوں
سر تیج بہادر کا — اندازِ بیاں میں ہوں

حیرت ہے مجھے اِس پر ——— وہ مجھ سے خفا کیوں ہیں
گردش ہے زمانہ کی ——— میں گھر میں بھی بے گھر ہوں

بادۂ مشرق

(از خامہ حضرت محمود نظامی۔ بی۔اے)

[حضرت محمود نظامی کو فن تنقید میں جو ید طولےٰ حاصل ہے اس سے ناظرین بے خبر نہیں ہیں، اگر آپ وقتاً فوقتاً اس سلسلہ میں لکھتے رہیں تو اُردو ادب کو گرانبہا فائدہ پہونچ سکتا ہے، جبتک اہل قلم کے محاسن اور نقائص تفصیل کے ساتھ ہمدردانہ لہجہ میں پیش نہ کئے جائیں ہمارا ادب معیاری نہیں بن سکتا، ادیبوں اور شاعروں کو اس قسم کی قیمتی تنقیدوں سے صحیح معنوں میں استفادہ حاصل کرنا چاہئے اور ایسے ناقدوں کا مشکور رہنا چاہئے جو حسن و قبح کو دیانتداری سے منظر عام پر لاتے ہیں۔

زیر نظر سالنامہ میں تین تنقیدیں شائع ہو رہی ہیں، ایک حضرت ساغر کے متعلق ہے اور باقی دو حضرت حفیظ جالندھری اور حامد اللہ افسر کے متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک تو ادبی زندگی پر نظر ہے اور دوسری میں محاسن ہی محاسن ہیں، اس لحاظ سے حضرت محمود نظامی کی تنقید صحیح معنوں میں فنِ تنقید کا ایک اچھا نمونہ ہے، ہم حضرت محمود نظامی سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ سال بھر میں کم از کم چھ تنقیدیں نیرنگ خیال کے لئے ضرور لکھا کریں، اور یہی علم و فن کی صحیح خدمت ہے جو وہ کرسکتے ہیں

ایڈیٹر]

بادۂ مشرق کے عنوان سے ساغر نظامی کے کلام کا ایک ضخیم مجموعہ کچھ عرصہ ہوا میرٹھ کے مرکز ادبی کی طرف سے شائع ہوا ہے، یہ چھ سو صفحات کی ایک خوبصورت کتاب ہے، اس کی صاف ستھری طباعت، عمدہ کاغذ اور خوشنما جلد کو دیکھ کر ساغر کے جمالیاتی ذوق کی داد دینا پڑتی ہے، اُردو کی بہت کم کتابیں اس اہتمام سے شائع ہوئی ہیں، بلاشبہ یہ کتاب اپنے صوری محاسن کے لحاظ سے میاں بشیر احمد صاحب ایڈیٹر ہمایوں کی کتاب طلسم زندگی سے کم نہیں۔

کتاب کی ابتدا میں ساغر کے "جرعات" کے عنوان سے جو تمہید لکھی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ بادۂ مشرق میں ساغر کا سارا کلام موجود نہیں، کیونکہ سنہ ۱۹۳۰ء میں اس کے کلام کا ایک "مرتب مسودہ سفر اجمیر میں گم ہو گیا جس میں بیشتر حصہ غیر شائع شدہ تھا اور جس کی کوئی نقل محفوظ نہیں" چنانچہ زیر نظر مجموعہ اس کتاب کا پہلا حصہ ہے، جس کی اشاعت ایک ہزار صفحات پر "تھی"۔ ظاہر ہے ساغر نہایت بسیار نویس اور پُرگو شاعر ہے جس نے تیس برس کی عمر میں شعر و نظم کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر لیا ہے۔

مگر بادۂ مشرق میں جو شے سب سے پہلے پڑھنے والے کی نظر کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ اس کے چھ نثر کے ابتدائی مضامین ہیں، ان میں ایک مقدمہ ہے، چار دیباچے ہیں اور خود شاعر کے اپنے سخنہائے گفتنی بھی "جرعات" کے عنوان سے ہیں، ہمارے ہاں ایک ایسی رَو چل نکلی ہے کہ کتاب کے شروع میں جب تک درجن بھر اہل قلم کے تعارف نامے شامل نہ ہوں نہ صرف کتاب کے مصنف کو اُسے شائع کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا بلکہ پڑھنے والے پر بھی اس کی اہمیت واضح نہیں ہوتی، یہی وجہ ہے کہ اردو کے اکثر شعرا کے کلام کے ساتھ جو خود پچاس ساٹھ صفحات سے زائد نہیں ہوتا، دس دس پندرہ پندرہ اشخاص تمہیدیں باندھتے، تعارف نامے لکھتے اور دیباچے چھاپتے ہیں، اور ان میں سے ہر با کمال یہی کوشش

کرتا ہے کہ اس کا مافی الضمیر تین سو پچاس صفحات سے کم میں واضح نہ ہو۔
چنانچہ اردو میں شعر کی اکثر کتابوں کی روش کو پیش نظر رکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ ساغر نے محض نصف درجن مضامین پر ہی کیوں اکتفا کی اور اگر فانی کے کلام پر پروفیسر رشید احمد صدیقی کا طویل وبسیط دیباچہ سامنے رکھا جائے تو جہاں ایک طرف بادۂ مشرق جیسی ۸۰۰ صفحات کی کتاب کے "آٹھ صفحات" کے یہ ۵ مختصر دیباچے اونٹ کے منہ میں زیرہ دکھائی دیتے ہیں، وہاں اس حقیقت کی موجودگی میں کہ آج کل دیباچہ نگار کا منصب عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ وہ قطرے کو سمندر اور ذرّے کو آفتاب ثابت کرے اور اپنی طبیعت کا جوش دکھانے میں ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھے بادۂ مشرق کے دیباچہ نگاروں کا ساغر کے محاسن کو واضح کرنے میں اسقدر اختصار سے کام لینا ایک قسم کی جدت یا یوں کہئے بدعت ہے، ان دیباچہ نگاروں میں ایک بلبل ہند ہے، ایک مصور فطرت ایک قبلۂ محترم، ایک استاد ادب اور ایک زعیم بلبل ہند کے نغمات اس قدر مختصر ہیں کہ وہ دو صفحات سے بڑھ نہیں سکے، حالانکہ بلبل کو ہزار داستاں محض اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بہت چہکتی ہے، دوسری طرف مصوّر فطرت کا رشک مانی و بہزاد قلم کبھی محض ساغر کے "نمکین گندمی رنگ" "سرمئی" آنکھوں اور قدیم و جدید باجوں کو نظر ہلانے والی نہایت سریلی بلند اور سامعہ نواز آواز کی تصویر کشی سے آگے نہیں بڑھا، ان کے بعد قبلۂ محترم کا دیباچہ ہے جو ساغر کے حضرت الاستاذی بھی ہیں، سیماب صاحب خدا کے فضل سے علامہ ہیں، اور ایسے چند علاموں میں سے ہیں، جنہیں یہ اعزاز اپنے نام کے ساتھ خود لکھنے کا استحقاق ہے مگر نہ جانے کیوں وہ بھی یہاں نثر کی ساڑھے چھ سطروں اور نظم میں چھ اشعار سے آگے نہیں بڑھ سکے، اس لحاظ سے ان کا دیباچہ نہ صرف آدھا تیتر آدھا بٹیر ہے بلکہ اس کے اختصار کی وجہ سے ان کے لاہوتی ارشادات اور سرمدی نکات سمجھ میں کبھی نہیں آتے، ان کے بعد "امام ادب" کی باری آتی ہے جو اردو کے بہت بڑے دیباچہ نگار ہیں مگر وہ بھی اپنے فرض سے بوجوہ احسن عہدہ برآ نہیں ہو سکے، یہی حال زعیم قوم پرور کا ہے جو سب سے آخر میں ہونے کی وجہ سے سب کی کمی پوری کرنے کی بجائے چند انگریزی شعراء اور چند تاریخی افراد کا نام بتلا کر خاموش ہو گئے ہیں ٭

ان دیباچوں سے ہٹ کر اگر ساغر کے کلام پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کلام میں تنوع کی بہت فراوانی ہے، اس کے پاس پرانی چیزیں بھی ہیں اور نئی بھی اس کے ہاں اگر غزلیات اور رباعیات جیسے رسمی اصناف سخن بھی موجود ہیں تو وطن اور مظاہر فطرت جیسے جدید موضوعات پر بھی بے شمار نظمیں ملتی ہیں، اسی طرح اگر فارسی کے اشعار ہیں تو ہندی کے گیت بھی اس کی شاعری فنی لحاظ سے بھی اس جدید اسلوب سے بہت متاثر نظر آتی ہے، جس کی وجہ سے آج کل اردو میں مترنم بحور اور دلکش اوزان کا رواج ترقی پکڑ رہا ہے، اس لحاظ سے ساغر کی شاعری موجودہ دور کے تمام تر رجحانات شعری کی حامل نظر آتی ہے، بغور سے دیکھا جائے تو ساغر کی مقبولیت کا راز تین امور پر موقوف ہے۔ (۱) اس کی مترنم بحور۔ (۲) اس کے پرشکوہ الفاظ۔ (۳) اس کے عام فہم جذبات، یہی تین چیزیں اس کی ساری شاعری کی کنجی ہیں، اس کی بحور کے متعلق گو اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بعض اوقات اس کی ایک نظم میں مختلف مصرعے مختلف بحروں میں لکھے گئے ہیں جس سے ایک مصرع دس پندرہ الفاظ میں اور دوسرا ایک یا دو میں ملتا ہے اور اس قسم کی جدت سے نظم میں خاطر خواہ روانی رہنے نہیں پاتی، پڑھنے والے کو ایک بحر سے دوسری بحر کی طرف منتقل ہونے میں اٹکنا پڑتا ہے، جس سے طبیعت خواہ مخواہ بدمزہ ہوتی ہے، مگر اس میں شک نہیں کہ ان نظموں کو خود ساغر کی زبان سے اگر سنا جائے تو وہ بہت موثر ثابت ہوتی ہیں، اسی طرح اس کے پرشکوہ الفاظ ایک سے زیادہ مقامات پر محض ایک بے معنی ملغوبے کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہوتے، مگر انہیں پرشکوہ الفاظ سے کئی اور مقامات پر اس کا بیان زوردار بھی معلوم ہوتا ہے اور اسی طرح اپنی شعری تصویروں میں وہ جن خیالات کا رنگ بھرتا ہے ان کا دار و مدار تو کسی بہت عمیق تخیل پر موقوف نہیں ہوتا مگر چونکہ اس کے جذبات روزمرہ کی زندگی سے علاقہ رکھنے کی وجہ سے عام فہم ہو جاتے ہیں اس لئے اس کا کلام موثر ہو جاتا ہے، ساغر میں سب سے زیادہ قابل توجہ چیز اس کی سادگی خیال ہے، اس کے پاس ایسے تخیل کی گنجائش نہیں جس سے دماغ کو آسمان کی طرف پرواز کرنے کی ضرورت پڑے، اس کا ذہن فلک پر اُڑنے کی بجائے اسی عالم سے اپنے محسوسات

تلاش کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس کے پاس فلسفیانہ کاوش اور جستجو نظر نہیں پڑتی، اور تخیل کی جولانیاں دکھائی نہیں دیتیں، بعض اوقات اسکے کلام کے ماخذ ایسے سیدھے سادے جذبات ہوتے ہیں کہ وہ حد درجہ سطحی دکھائی دیتا ہے، بلکہ جب وہ حسن کی تعریف کرنے لگتا ہے تو اس کے جذبات اتنے سیدھے سادے ہو جاتے ہیں کہ اس پر کسی ایسے وارفتہ مزاج نوجوان کا گمان ہونے لگتا ہے جس کے دل اور دماغ پر ہوس کا حد درجہ قابو ہو جو ہر چیز کو محض ایک ہی نقطۂ نگاہ سے دیکھے۔

ساغر کی شاعری میں جو جذبہ سب سے زیادہ کارفرما نظر آتا ہے وہ "وطنیت" ہے، اس جذبے کی جھلک اس کی شاعری میں ہر جگہ نظر آتی ہے در اصل شاعر کا ایک پہلو تربیتی بھی ہوتا ہے، شاعروں کے خیالات اقوام کی درستی میں بڑا حصہ لیتے ہیں، گو اردو شاعری کا آج سے پہلے کا حصہ قوم کی کسی حالت سے تعرض نہیں کرتا مگر اب قومی شاعری کو اردو میں بہت دخل ہو گیا ہے اور اس کی رَو کچھ ایسی چل نکلی ہے کہ بہت کم شاعر ایسے ہونگے جو اس سے متاثر نہ ہو سکے ہوں، در اصل اقبال نے وطنی نغموں کو اسقدر مقبول بنا دیا ہے کہ اس عرصہ کے کم و بیش سب شاعر حبِ وطن کے بادہ سے سرشار نظر آتے ہیں، یہ احساس بڑی حد تک خود ملک کی موجودہ سیاسی حالت کا پیدا کردہ بھی ہے، کیونکہ ہر طرف بے چینی اور اضطراب کی لہریں دوڑ رہی ہیں اور لوگوں میں بیداری کے آثار بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال کا اثر آج کل ہماری زبان کے اکثر نوجوان شعراء کے کلام میں نظر آتا ہے۔

خود آج ہمارے نوجوان اسی چیز کی قدر کرتے ہیں جس میں اقبال کی طرز کا کچھ نہ کچھ شائبہ ضرور ہو، یہی وجہ ہے کہ اقبال کی قومی شاعری سے کم و بیش ہر شاعر متاثر نظر آتا ہے، مگر قومی شاعری میں ایک اور کشش بھی ایسی ہے جسکی وجہ سے ہر وہ شاعر جسکو نمود کی ذرا بھی خواہش ہوتی ہے اس کی طرف جھک جاتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ملک کی فضا میں آزادی کا جذبہ اتنا پھیل گیا ہے کہ ہر وہ کوشش جس میں وطنیت یا قومیت کا جذبہ آشکارا ہو، قدر کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے، عوام کے مذاق کی پستی بھی اس روش کی مقبولیت کی بہت ذمہ دار ہے، بد مذاق لوگ جب اچھے اور برے کارناموں میں امتیاز کئے بغیر جذبات سے متاثر ہو کر واہ واہ اور شاعر کی جے کے نعرے بلند کرتے ہیں تو اس قسم کی شہرتِ ارزاں شاعر کے دماغ کو غلط راستوں پر ڈال دیتی ہے اور وہ اپنے تئیں "مصلح" سمجھنے لگتا ہے، آج اسی افراط تفریط کی بدولت قومی شاعری کا آغاز ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے ملک میں سیکڑوں سیاسی ڈکٹیٹر پیدا ہو گئے ہیں جو قوم کے انحطاط و فلاکت سے فائدہ اٹھا کر اس کو ہدفِ سب و شتم بناتے اور اس سے دست و گریباں ہونے کو اپنا بہت محبوب مشغلہ سمجھے ہوئے ہیں، مگر شاعری کے قومی اور وطنی ہونیکے صرف یہی معنی نہیں کہ اس میں قوم کے عیوب بیان کئے جائیں، اور وطن کی تعریف کے بےیعنی راگ الاپے جائیں، بلکہ اس میں قومیت اور وطنیت کے ایسے شریف خیالات کی جھلک ہو کہ اس سے جذبات کی تولید ہو سکے، یہ قومی شاعری اپنے نتائج کے لحاظ سے اردو کے لئے اچھی نہیں، کیونکہ اس سے نہ صرف اچھے مفکر شعراء راستے سے بھٹک گئے ہیں بلکہ قوم میں جو قابلیت باقی ہے وہ بھی بری طرح پست ہو رہی ہے، اس ضمن میں حضرت جوش ملیح آبادی اس قسم کے افسوسناک ادبی نقصان کی ایک بہت بڑی مثال ہیں، جوش کی ابتدائی شاعری میں سرمستی اور شباب افزا کیفیت کے جو نمونے عام ملتے ہیں ان کو پڑھ کر طبیعت مسرور ہو جاتی ہے، چنانچہ بروج ادب جس میں رندی اور عشق، تلاشِ حسن اور پرستشِ فطرت ان کے مخصوص مضامین ہیں ان کی شعری کوششوں کا بہت اچھا نمونہ ہے، مگر جب سے لوگوں نے انہیں شاعرِ انقلاب کا تعجب آفریں خطاب عطا کیا ہے، وہ ہماری ذہنی پستی اخلاقی کمزوری اور غلامانہ ذہنیت کا خاکہ اڑانے میں کچھ ایسے مستغرق ہو گئے ہیں کہ ان کی شاعری اب الفاظ کی بلند آہنگی اور مضامین کی تکرار سے آگے نہیں بڑھتی، ہر شخص کے لئے اپنا اپنا رنگ مخصوص ہوتا ہے وہی اس کو زیب دیتا ہے اور اس کی پابندی خود اس کی بقا اور تحفظ کیلئے بھی لازمی ہوتی ہے، ورنہ اس بے راہ روی کے نتائج خود شاعر کے لئے بعد کو بہت مضر اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔

بہر صورت اس عرصہ میں جبکہ قومی شاعری کا عام رنگ افراط تفریط کی وجہ سے بڑی خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے، ساغر کی طرز عام

سطح سے اچھی ہے ، وہ قوم سے لڑنا بھڑنا یا اس کی کمزوریاں دکھا دکھا کر اس کے نقائص گنا گنا کر اس سے گالی گلوچ کرنا پسند نہیں کرتا ، اس کا مطمح نظر صرف آزادیٔ وطن ہے ، ملکی غلامی اور قومی انحطاط کی دوراز کار وجوہات گنوانے کی بجائے وہ نوجوان نسلوں کو آزادی کی جد وجہد کے لئے اکسانے اور وطن کے ساتھ اعلےٰ اور مفید خیالات متعلق کرنے کی تلقین کرتا ہے ، جب وہ وطن کا گیت گاتا ہے تو اس کے کلام میں وہی جوش و خروش وہی زور اور تیزی ہوتی ہے جو شباب کا لازمہ اور جوانی کا خاصہ ہیں' دیکھ لیجئے :-

دعوےٰ ہے ہر آن ہمارا ٭ سارا ہندوستان ہمارا
جنگل اور گلزار ہمارے ٭ دریا اور کہسار ہمارے ٭ کوچے اور بازار ہمارے ٭ پھول ہمارے خار ہمارے
ہر گھر ہر میدان ہمارا ٭ سارا ہندوستان ہمارا
گو نہیں ہم میں فوجی قوت ٭ پھر بھی بہت ہے دل میں ہمت ٭ اور ہمارے ساتھ ہے قدرت ٭ اب کوئی طاقت در مکھ مت
روک تو دے طوفان ہمارا ٭ سارا ہندوستان ہمارا

وہ اس جذبے سے اس قدر متاثر ہے کہ بعض اوقات اس کے کلام میں بے اعتدالی کا رنگ بھی جھلک پڑتا ہے ، وہ اگر ذرا کسی حرکت سے یہ سمجھتا ہے کہ اس میں وطنی مفاد مرکوز ہے تو اس پر اظہار تہنیت سے باز نہیں رہ سکتا "گاندھی اروِن معاہدہ" پر جو نظم ہے وہ اسی سبک جذبے کی آئینہ دار ہے بعض اوقات وہ اپنے وطن کی آزادی کے لئے اس قدر مضطرب ہوتا ہے کہ اس کے ذرائع تجویز کرنے کی بجائے کبھی خدا کے آگے گڑگڑاتا ہے ، کبھی بدھ کرشن اور رام سے استمداد کرتا ہے ، کبھی حیدر علی اور سلطان شہید ٹیپو سے اعانت طلب ہوتا ہے ، یہاں تک کہ چاند سورج ستارے پہاڑ اور دریا تک کو اس موضوع پر اپنا مخاطب ٹھہراتا ہے اور جب کسی طرح سے تشفی نہیں ہوتی تو پھر خود ہی اعلانِ آزادی کر دیتا ہے ۔

ہم آج سے ہیں آزاد — آزاد — آباد ٭ لے اپنا قفس صیاد — صیاد — برباد
اور رنگ چمن کو چھوڑ اٹھ تاج سمن کو چھوڑ ہٹ گنگ و جمن کو چھوڑ
اب خود ہیں ہم شہزاد — شہزاد — مرزاد ہم آج سے ہیں آزاد — آزاد — آباد

بادی النظر میں ساغر کا یہ اعلانِ آزادی شیخ چلی کی تمثیلی خیالی پلاؤ سے ملتا ہے ، مگر دراصل ساغر کی وطنی شاعری رجائیت کی حدود سے باہر نہیں نکلتی وہ اپنی ملکی عظمت کی صحیح کیفیت سے روشناس ہونے کی وجہ سے جذبۂ آزادی کی اس چنگاری کو پیش نظر رکھتا ہے جو خاکستر وطن میں برابر سلگ رہی ہے اور جس میں نامساعد حالات میں بھی شعلۂ جوّالہ بن جانے کی قدرت ہر وقت موجود ہے ، یہی وجہ ہے کہ وہ حالات سے مایوس ہونے کی بجائے ایک آزاد اور متحد ہندوستان کا خواب دیکھ رہا ہے اور اسے اپنے ملک کی محبت اس قدر مقدم ہے کہ وہ کسی فروعی جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا ۔

کوئی ہے بہارِ چمن کا پجاری ٭ کوئی ہے گل و یاسمن کا پجاری
بتِ موسوی کو کوئی پوجتا ہے ٭ کوئی قشقۂ برہمن کا پجاری
غلام غلامانِ زمزم ہے کوئی ٭ کوئی موج گنگ و جمن کا پجاری
مگر میرا ذوقِ پرستش جدا ہے
میں ساغر ہوں اپنے وطن کا پجاری

ساغر جذبۂ آزادی سے اس قدر سرشار ہے کہ اس کی نگاہ صرف ہندوستان کی سرزمین غلامان تک نہیں یعنی گو وہ صرف ہندوستانی ساغر نظر آتا ہے ، مگر جب وہ ہندوستان سے باہر تمام ایشیا پر نظر ڈالتا ہے اور اسے ایک عام مصیبت ہر طرف نظر آتی ہے تو اس کی ہمدردی وسیع تر ہو جاتی ہے اور وہ ہندوستان کے ساتھ ساتھ ایشیا کے جملہ سیاسی و تمدنی پسماندگی سے اظہار ہمدردی کرتا ہے ۔

ساغر وطن کا پرستار ہونے کی وجہ سے مجاہدینِ وطن کا قصیدہ خواں بھی ہے ، مگر ساغر کی مدحیہ شاعری خاص نوعیت کی ہے ، اس نے رواج کے خلاف جہاں امرا اور بادشاہوں کی تعریف نہیں کی وہاں مبالغہ جو قدیم قصیدہ نگاری کا لازمی جز تھا بالکل نہیں برتا ، اس کے نزدیک قدیم معیار لفاظی ہونے کے باوجود بے سروپا امور کا بیان حتی الوسع آنے نہیں پاتا ، چنانچہ اس کے کلام میں بہادر شاہ جیسے مظلوم شہنشاہ ، حیدر علی اور ٹیپو جیسے حریت پسند تاجدارانِ ہند ، مولانا محمد علی مرحوم ، پنڈت موتی لال نہرو ، اور تصدق احمد خاں شروانی جیسے قائدین گذشتہ گاندھی ، ابو الکلام آزاد جواہر لال نہرو ، عبد الغفار خاں جیسے بزرگانِ وطن کی تعریف میں جو نظمیں ملتی ہیں وہ بڑی حد تک سچے جذبات کی حامل ہیں ۔

ساغر کی "سیاسی" شاعری میں ایک بات اور قابل غور ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اپنے میدان سے ہٹ کر اِدھر اُدھر غیر متعلقہ امور کی طرف ہاتھ پاؤں نہیں مارتا، اردو کے اکثر شعرائے کرام قومی شاعری پر قلم اٹھاتے وقت جمہور کے بعض حصوں کو بھی اپنی حمایت کا مشق بنا لیتے ہیں مثلاً کوئی کسان کا دکھڑا سنانے لگتا ہے، کوئی مزدور کا رونا رونے لگتا ہے، کوئی سرمایہ داری کے خلاف آوازہ اٹھاتا ہے، کوئی اجتماعی حکومت کی مخالفت میں علم جہاد بلند کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان شعراء کے پیش نظر کوئی مخصوص اور معین مطمح نظر نہیں ہوتا، چنانچہ جذبات اسی قسم کی الٹی شکلیں اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں مگر ساغر اس قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کرتا۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کے مقابلے میں ساغر کی قومی شاعری حد درجہ روکھی پھیکی اور بے کیف معلوم ہوتی ہے مگر اس میں ساغر کی نظموں کا قصور نہیں، تقابلی مطالعے کا نتیجہ عام طور پر یہی ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بعض ایسے مقامات پر ساغر بجائے شاعر ہونے کے واعظ کا دعوے دار ہوتا ہے؛ جہاں وہ جذبات کی تولید کے بجائے تلقین اور رہبری کا کام شروع کر دیتا ہے۔

ہمیں یہ امر بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ اقبال کی نظموں کی روح رواں ان کی فکر عمیق ہے جس کی وجہ سے زمانہ حاضرہ کے اہل نظر ان کے اس قدر گرویدہ ہیں کہ ان کی پرستش غلو کا رنگ لئے ہوئے ہے، برخلاف اس کے ساغر کے ماخذ اس کے پُرجوش جذبات ہیں، کیونکہ اس کی طبیعت کو فلسفیانہ کاوش اور تجسس سے کوئی کام نہیں۔

اس امر کے علاوہ دو اور باتیں ہیں شاید ساغر کی قومی شاعری کا مطالعہ کرنے والے کو کھٹکیں گی، ایک تو اس کے اکثر اشعار کی سستی بندش ہے جس کی ذمہ دار اس کی کثرت نگاری ہے، دوسرے اس کی محاورہ واپیل جس کی وجہ اس کی مشکل زبان ہے، اس میں شک نہیں کہ مسلسل اور طویل نظمیں اپنی مربوط خیالی کی وجہ سے اپنے لئے مستقل جگہ بنا لیتی ہیں، مگر ان سے ایک یہ عیب عام طور پر شاعر کے کلام میں رہ جاتا ہے کہ اس کے اکثر مقامات پر شعر گوئی کی بجائے شعر سازی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے چنانچہ ساغر نے کبھی کبھی اپنی قابلیت پر بھروسہ کر کے شعر کے سرانجام کرنے میں زیادہ کوشش سے کام نہیں لیا، اس کے ہاں کئی الفاظ غلط، بہت سے مصرعے بے ربط اور متعدد اشعار بے معنی ہیں، دراصل داخلی شاعری کیلئے جہاں اچھے خیالات اور صداقت شعاری کے علاوہ حسن اور صفائی بیان کی بھی ضرورت ہے وہاں تناسب اور اختصار کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ داخلی شاعری میں شاعر جب مضامین کے لئے اپنے دل کے گوشے ٹٹولتا ہے تو اس کو ایک حد تک پہنچنے کے بعد یہ تجسس و تحقیق ختم کرنی پڑتی ہے، دل آخر دل ہے انسائیکلو پیڈیا برٹینکا نہیں، یہی وجہ ہے کہ ساغر کے کلام میں کثرت نگاری اور بسیار گوئی کی وجہ سے اکثر مقامات پر تصنع کا شبہ پڑتا ہے اور تکلف اور آورد کا رنگ تو چھپائے سے نہیں چھپتا۔

ساغر میں دوسرا نقص اس کے کلام کے زیادہ حصے کا عموماً اور قومی شاعری کا خصوصاً مشکل زبان میں ہونا ہے، دراصل جس قسم کی قومی شاعری ساغر کا موضوع سخن ہے اس کے مخاطب عوام ہوا کرتے ہیں، ظاہر ہے عوام کے لئے اسے اپنے کلام میں آسان فہم زبان کو استعمال کرنا چاہیئے کہ جب اس کے مخاطب اسے سمجھ نہ سکے تو پھر اس شور و واویلا کا مقصد کیا نکلے گا، مگر ساغر کی زبان جوشیلے جذبات کی مظہر ہونے کی وجہ سے بالکل عام فہم نہیں، کیونکہ پرشکوہ الفاظ، پیچیدہ تشبیہات اور طویل استعارات کا استعمال ساغر کی شاعری کی کنجی ہے، ہمارے ہاں یہ یقین ہو گیا ہے کہ اس علمی دور میں شاعر کا رعب اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے جب وہ بعید از فہم ترکیبوں نامانوس لغات اور غیر ضروری اظہار سے اپنے کلام کو مزین کرے، غالباً اسی خیال کی وجہ سے ساغر کے ہاں غالب کے اولین دور کی انشائے خصوصی، نامانوس محاورے ثقیل ترکیبیں اور لغات غریبہ کی جھلک نظر آتی ہے، قومی شاعری کے علاوہ عام موضوع کی نظموں میں بھی اس کے طبعی جوش اور ولولے کے ساتھ ساتھ مشکل زبان اس کی شاعری کا نمایاں وصف ہے، اس پر بھی اگر مسز سروجنی نائیڈو نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ساغر اپنی نظموں کے لئے "ایسے سلیس اور دلکش الفاظ استعمال کرتا ہے جو عوام الناس کی روزمرہ بول چال سے بیشتر مشابہت رکھتے ہیں" یا یہ کہ "ساغر نے زمانہ حال کی اردو شاعری میں زبان کی نرمی اور دلفریب شیرینی پیدا کر دی ہے" تو سخت حیرت ہوتی ہے بلکہ بجا طور پر شبہ گذرتا ہے کہ شاید موصوفہ نے ساغر کے کلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ کیونکہ ساغر کا کلام بعض مقامات پر بے ضرورت

لفاظی کی وجہ سے اچھا خاصا گورکھ دھندا بن گیا ہے جس کے معمے حل کرنے کے بعد بھی "حاصلِ کلام" کو معلوم کرنے کی حسرت رہ جاتی ہے، یقین نہ آئے تو یہ سن لیجئے۔

اک مختصر مربع توسیع و اختصار | رخسارۂ حیات کا خالِ فروغ بار
آغازِ ابتدا کا وہ اک نقشِ اولیں | انجامِ انتہا کا تتمہ مآلِ کار
دیباچۂ فسانۂ موہومِ کائنات | سرنامۂ صحیفۂ منشائے کردگار
اک قطرۂ چکیدہ ابر ازل محیط | صہبائے نابِ ساغرِ کن خالقِ خمار
ٹپکا ہوا اک اشکِ تمنائے بے پناہ | بھٹکا ہوا سا عاشقِ تنہائے بیقرار
نابود اور مشرقِ خورشیدِ ہست و بود | محدود اور موجۂ دریائے بے کنار
عکسِ سیاہ مردمکِ چشمِ دو جہاں | صورت نگارِ کون و مکاں ورشا ہوا
قندیلِ عرش شمعِ حرم نجمِ بت کدہ | ماہِ کنشت مہرِ کلیسا گلِ بہار

تکوینِ کائنات کا نقشہ کہیں جسے
صد نکتہ در کنار ہے نقطہ کہیں جسے

وہی ٹیڑھی ترچھی چالیں وہی مشکل پسندی وہی صوری اور معنوی نقشہ ہے جو مومن کے ساتھ غزل میں مخصوص ہے بلکہ اپنے لطف گویائی اور مضمون آفرینی سے شاگرد نے اُستاد کو بھی ہیٹی دیدی ہے، ساغر کی اس لفاظی کے طفیل جتنی نئی ترکیبیں وضع ہوئی ہیں اس تفصیل کی اس اجمال میں گنجائش نہیں مگر نمونہ دیکھنا ہی ہو تو چند ایک یہ ہیں، خاک زارِ شامِ غربت۔ گراں خوابئ گل خانہ ویراں۔ ارژنگِ یاسمیں رنگیں عروسِ رنگ دلہ۔ حال پرست ماضی۔ گردابِ دور و تسلسل۔ شام دار السرور۔ قوتِ تاراجئ گل۔ چشمِ نوعروسِ وقت۔ غنچگئ یاسمن۔ کشمیرِ مستی۔ پیامِ زرنگار۔ گہوارۂ نگاہ و شباب وغیرہ وغیرہ

لفاظی اگر موقع و محل کے مطابق ہو تو بری نہیں گذرتی یا اس سے اگر شاعر گانے کے دوران میں بادل کی گرج، بجلی کی کڑک، شیر کی دھاڑ، ہاتھی کی چنگھاڑ اور اژدہے کی پھنکار کا چربہ اُتارنا چاہتا ہے تو دوسری بات ہے لیکن اگر نری علمیت کے رعب کی خاطر یہ زبان استعمال کی گئی ہو تو پھر بے کیف ہے، ساغر کی طبیعت پر لفاظی کا کچھ ایسا رنگ غالب ہے کہ نظم تو نظم رہی نثر میں بھی وہ اپنا مافی الضمیر واضح کرنے کے لئے اسی زبان سے استمداد کرتا ہے جس کی بھول بھلیوں میں آج سے ساٹھ ستر برس پیشتر پھنس کر اردو زبان کی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، مثلاً کتاب کا انتساب ملاحظہ فرمائیے۔ "جرعات" کے پہلے چند پیروں پر نظر دوڑائیے اور اگر ان سے بھی طبیعت سیر نہ ہو تو پھر کتاب کے آخر میں "اتمامِ کیف" کے زیرِ عنوان جو کچھ ہے اسے پڑھ کر دیکھ لیجئے، ہر فقرہ بولتا ہوا جادو اور ہر جملہ طلسمِ معانی نظر آئے گا۔

یہاں پر ساغر کے کلام میں ہندی الفاظ کے اثرات کے متعلق بھی ایک بات قابلِ غور ہے در اصل ساغر کی چند نظمیں ایسی ہیں جنکو دیکھ کر مسز سروجنی نائیڈو کی طرح دھوکا ہو جاتا ہے کہ ساغر کی قادر الکلامی کی وجہ سے اس کے کلام میں "ہندی الفاظ بے ساختگی کے ساتھ بغیر کسی تصنع کے فارسی منظومات کی مشکل تر مقررہ بندشوں میں گھل مل جاتے ہیں"۔ مگر ساغر کے کلام کا ایک معمولی سا مطالعہ صاف بتلا دیتا ہے کہ ساغر کی طبیعت کو کس زبان سے زیادہ مناسبت ہے جہاں ایک طرف بادۂ مشرق کے مختلف عنوانات پر نظر ڈالنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاعر اپنے مطالب کی ترجمانی کس زبان سے اعانت کرتا ہے جیسے بادۂ مشرق کے ابواب کے عنوانات۔ صبحِ نو، ہدیۂ روح، پیامِ سرِ دش، حریمِ فطرت، نقوشِ باقی، صنم کدۂ حیات، حدیثِ گل، غنچہ زار، رموزِ میکدہ، جرعۂ آخریں، ساغرستان، روحِ بادہ، یا ان میں سے کسی ایک باب کے موضوعی عنوانات جیسے جامِ نیم شبی، حدیثِ بیخودی، اشکِ مے گسار، تجلیِ کیف، رندی و خردمندی، سلامِ اے بزمِ رنداں، وہاں مولانا عبدالحق کے دیباچے میں موصوف کا یہ خیال بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ بحروں کے تنوع سے ساغر کے حسنِ انتخاب اور اس کے ذوقِ موسیقیت کا پتہ چلتا ہے یہ فارسی کی جدید شاعری کا اثر معلوم ہوتا ہے، ترنم اور بحروں کی جدت یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو خاصکر ساغر نے جدید فارسی شاعری سے حاصل کی ہیں" ظاہر ہے ساغر ہندی کی طرف برائے نام راغب ہے۔

در اصل آج کل اردو میں پھر قدیم شاعری کی طرح ہندی اثرات کو زندہ کرنے اور بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے، نوجوان شعرا خصوصیت سے اس چیز کی طرف مائل ہیں مگر کسی کے کلام میں ایک آدھ لفظ اگر ہندی کا آجائے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ اس کے کلام میں "ہندی الفاظ اردو کے ساتھ گھل مل گئے ہیں" یا اگر گھل مل بھی گئے ہوں تو اس جدت کا اس سے اچھا

یا بُرا ہونا بھی ثابت نہیں ہوتا، چند لفظوں کی بنا پر اگر ساری شاعری کے متعلق ایک وسیع نظریہ پیش کیا جا سکتا ہو تو پھر ڈاکٹر صاحب کی "من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا" والی غزل کا یہ مصرع کہ "اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے" یا بال جبریل سے "ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن" والی غزل کو مدنظر رکھ کر ڈاکٹر صاحب کے متعلق بھی اُسی وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری میں ہندی الفاظ گھل مل جاتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ آج کل اردو میں ہندی کے اثرات ضرور دخیل ہو رہے ہیں مگر ان سے متاثر ہونے پر کسی شاعر کا کلام نہ اچھا ثابت ہوتا ہے نہ بُرا، ہاں ان کے صحیح استعمال سے اس کی ذہانت اور ادبی استعداد کا پتہ ضرور چلتا ہے، اِس عہد میں ہندی بحروں کو اُردو میں رواج دینے کی تحریک شاید پہلے پہل عظمت اللہ خاں مرحوم کی شاعری سے شروع ہوئی تھی، اب تو حفیظ نے ہندی کی طرز پر اردو میں باقاعدہ گیت لکھ کر اصنافِ شاعری میں ایک نئی ایجاد بھی کر ڈالی ہے، مگر اس اجتہاد میں بھی حفیظ کی احتیاط اس کی ذہانت کی دلیل ہے، وہ سمجھتا تھا کہ اردو شاعری کی تمام اصناف موضوع کی ضرورت سے بڑھ کر اپنی ظاہری شکل اور فنی قیود کی پابند ہیں، اردو کی ہر صنف کی نہ تو شکل اب بدلی جا سکتی ہے نہ اس میں کسی دوسری زبان کے الفاظ کو خواہ مخواہ گھسیڑا جا سکتا ہے، چنانچہ اس نے ہر قسم کی نظم میں ہندی الفاظ اور ہندی خیالات کو مشترک کرنے کی بجائے صرف گیتوں کی ایجاد پر اکتفا کیا اور اسی ایک صنف کے توسط سے اس نے اردو شاعری میں ہندی شاعری کی روح کو روشناس کرایا، اگر اس قسم کی احتیاط نہ برتی جاتی تو زبان ہر قسم کی پابندی سے آزاد ہو کر کھچڑی ہو جاتی اور اس کی حیثیت چھاؤنی کے گھسیاروں کی زبان سے زیادہ نہ رہتی لہذا مناسب یہی ہے کہ ہندی الفاظ اور ہندی خیالات کی ادائیگی کے لئے صرف گیتوں کی طرف توجہ دی جائے، اور خواہ مخواہ ہندی کے الفاظ کو اردو کی ہر قسم منظومات میں داخل کرنے کی سعی نہ کی جائے، ورنہ اس سے اردو شاعری کی شکل اس طرح بگڑ جائے گی کہ وہ پہچانے سے نہیں پہچانی جائے گی۔ جہاں تک ساغر نے گیت لکھے ہیں مجھے اس کے کلام کی بہت قدر ہے مگر جہاں وہ صحیح راستے سے بھٹک کر ڈگمگاتا ہوا اِدھر اُدھر قدم رکھ دیتا ہے تو اس کی یہ بے راہروی مجھے پسند نہیں آتی، چنانچہ میں "بھکارن" میں ہندی الفاظ کی بے ضرورت استعمال کو اس لحاظ سے اچھا نہیں سمجھتا کہ اس سے باقی کے اصناف شعری میں بھی ہڑبونگ مچنے کا خدشہ ہے، اور اگر اس جذبے کے اخراج کے لئے صحیح راستہ اختیار نہ کیا گیا تو پھر زبان کا اللہ ہی محافظ ہے، ساغر نے اپنے گیتوں میں ہندی کا استعمال جس خوبی سے کیا ہے وہ اس کے آرٹ کا اچھا نمونہ ہے، ان میں ہندی کے الفاظ کی نشست بحر کا ترنم اور خیال کی ادائیگی یہ سب اچھی بھلی ہیں۔

کہیں چاند اور کہیں تم ہو ستارے   نرالے ہیں تمہارے روپ سارے
ہماری زندگی کے ہو سہارے   بسو ہر وقت تم دل میں ہمارے
بسو ہر وقت تم دل میں ہمارے

نہ جاؤ روٹھ کر جمنا کنارے   نہ سورج میں کرو چھپ کر اشارے
نہیں پوجا تمہاری ہوگی پیارے   شوالہ ہے یہی قابل تمہارے
بسو ہر وقت تم دل میں ہمارے

یہ سُندر چھب یہ تیور پیارے پیارے   ہماری جان ہیں درشن تمہارے
نہ ڈھونڈو پریت کو تم دوارے دوارے   اسی میں پریم کے بہتے ہیں دھارے
بسو ہر وقت تم دل میں ہمارے

بہرصورت یہ ایک جملہ معترضہ تھا، ہم پھر اصلی موضوع کی طرف پلٹتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ وطنی مسائل سے ہٹ کر ساغر نے کائنات کے دلچسپ اور حسین موضوعات پر بھی نظمیں لکھی ہیں، آج کل اردو شاعری میں فطرت کی پرستارانہ عقیدت کے زیر اثر مناظرِ وقت اور موسم کی کیفیتوں پر بھی نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ ساغر بھی فطرت کی عکاسی کے غیر رسمی اسلوب کی طرف پوری طرح راغب ہے، وہ اچھا خاصا منظر نگار شاعر ہے جو ہمیں اپنے پر شکوہ بیانات سے فطرت کے مختلف مظاہر کے جذباتی اور رومانی پہلوؤں سے آشنا کرتا ہے، ساغر کے مناظر ہماری عام زندگی کے مناظر ہیں، وہ اردو کے کئی دوسرے شعراء کے برعکس مہذب اور شائستہ معاش کو چھوڑ کر اپنا مواد جنگل اور دیہات کی زندگی اور اس کے متعلقات میں فراہم نہیں کرتا، بلکہ وہ اپنے تاثرات کیلئے ہر جگہ سے سامان مہیا کر لیتا ہے، اور اپنے مناظر کی تشریح اس طرح کرتا ہے کہ ہمیں ان کے روحانی مفہوم سے بھی اطلاع ملتی ہے

ساغر منظر کشی کی عمارت کو دور از فہم تخیل کی بنیادوں پر کھڑا نہیں کرتا بلکہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے اس کے تاثرات نہایت سیدھے سادے ہیں جنہیں وہ ایک ایسے شگفتہ انداز میں بیان کرتا ہے کہ ان میں شعریت کی جان پڑ جاتی ہے، مثال کے طور پر صبح کے سکوت کا منظر ملاحظہ فرمائیے۔

وداع ہوتی ہے ظلمتِ شب سحر کھڑی جھلملا رہی ہے
اندھیریاں ہو رہی ہیں رخصت سواریٔ نور آ رہی ہے
ستارے انگڑائی لے رہے ہیں قمر ہے آسودۂ منازل
ردائے انجم بہ سر ثریا وداع کے گیت گا رہی ہے
گداز کے کیف سے کواکب ٹپکنے والے ہیں بن کے شبنم
صبا بہ اندازۂ تراوش گلوں کے دامن بڑھا رہی ہے
کنارِ حسرت میں سونیوالی نہ دفعتاً کوئی چونک اٹھی
جہان پر صبح کی تجلی سکوت بن بن کے چھا رہی ہے

زمیں بھی ساکت سماں بھی ساکت
شجر بھی چپ ہیں ہوا بھی چپ ہے
ندی بھی خامش ندا بھی چپ ہے

خموش ہے نہر کی روانی ٹھہر گیا ہے سمٹ کے پانی سحر کی معصوم ضوفشانی سکوت میں مسکرا رہی ہے

شبِ ماہ میں "تاج" کی تصویر کی ایک جھلک دیکھئے:۔

نظر کی صباحت نگاہوں کی نزہت عجب منظرِ تازگی ضیا ہے
نقاب اپنے رخ پہ لئے بجلیوں کی کوئی حور ہے یا فرشتہ کھڑا ہے
اِدھر چاند ہے ضوفگن بے محابا اُدھر تاج ہے نو بہارِ نظارہ
نظر تاب اِک پیکرِ مرمریں ہے کہ ٹکڑا کوئی عالمِ نور کا ہے

یہ نقشِ منور
منور مطہر
مرصع مشجر
محبت کا پیکر
جمیل اور رعنا خموش اور گویا سہیل و ثریا
شعاعوں کے جھرمٹ میں جلوہ نما ہے

ساغر نے موسم اور سمے کی کیفیتوں یا مقامی مناظر پر ہی نظمیں نہیں لکھیں بلکہ ہر اس چیز پر اس نے قلم اٹھایا ہے جس میں اسے رمقِ حسن نظر آتی ہے، چنانچہ وہ فطرت کے ہر قسم کے مظاہر میں حسن و خوبی کے پوشیدہ سے پوشیدہ پہلو ڈھونڈھ لیتا ہے، اس کی نظر میں ہندو خاتون، ہندو دیوی، کنیزِ حرم، عورت کی ذات ہی عقیدت کی حقدار نہیں بلکہ وہ پجارن، بھکارن اور مالن تک کے اپنے قلم کو جنبش دیتا ہے، اس میں شک نہیں کہ ان نظموں کے آخر میں شاعر جب ان کے باطنی اور صوری محاسن پر اظہارِ خیال کرتا ہوا ایکلخت ان سے رشتۂ محبت جوڑنا شروع کر دیتا ہے اور اپنی ذات کو درمیان میں لے آتا ہے تو وہ بوالہوس یا نظرباز معلوم ہوتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ حسن کہیں ہو کسی شکل میں ہو ہر انسان کا دل اس کی طرف کھنچتا ہے، شاعر کے دل کو تو حسن کے ساتھ وہ لگاؤ ہے جو لوہے کو مقناطیس سے یا تنکے کو کہربا سے ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب اسے کسی چیز میں حسن نظر آنے لگتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر اسکی طرف کھچا چلا جاتا ہے، اس میں رکیک خیالات کو دخل نہیں ہوتا، نہ خود شاعر کا مدعا اپنے سفلی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

تاہم اس میں کلام نہیں کہ کئی جگہ پر ساغر کا اندازِ بیان ایسا پیچ پیچ ہو جاتا ہے کہ طبیعت مکدر ہو جاتی ہے، مثلاً مطربہ کے عنوان پر جو نظم ہے اس میں اس قسم کے شعر کس قدر مبہم اور خالی از شعریت ہیں۔

ہونٹوں میں اس کے بربطِ مضراب جنکی لرزش دل ہے رباب اس کا ایسی وہ مطربا ہے
ہر صبح بھیرویں ہے ہر شام اس کی دیپک نغموں کی ہے وہ دیوی راگ اس کا دیوتا ہے
آنکھ اسکی موہنی ہے لحن اس کی موہنی ہے ابرو ہیں اسکے دوہے زلف اسکی استرا ہے

تشبیہات کی اس سے زیادہ بھونڈی تصویر شاید ہی کہیں ملے۔

ساغر کا کلام کچھ انہیں اصناف تک ہی محدود نہیں، اس نے بہت سی غزلیں بھی لکھی ہیں اور متعدد رباعیاں بھی کہی ہیں، ان دونوں کی ایک کافی تعداد "بادۂ مشرق" میں موجود ہے گو نری تغزل کی شاعری کا دور اردو سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا ہے، پھر بھی اردو کے کسی شاعر کا کلام ایسا نہیں ملتا جس میں غزلیات ایک قابلِ اعتنا مقدار میں نہوں، لیکن جب سے مرزا غالب نے اپنی نگاہ شاہدانِ بازاری کے کوٹھوں سے ہٹا کر انسانی زندگی کے نازک اور پیچیدہ تر مسائل کی طرف لگائی تھی، غزل کا اصل اصول ہی بدل گیا ہے، آج جدید شاعروں نے اس کا ظاہر اور باطن اسقدر بدل ڈالا ہے

کہ بجائے مبالغہ آمیز جذبات کے اظہار کے اب فلسفیانہ حقائق اور حیات کے سنگین اور دلچسپ پہلوؤں کی تصویر کشی کا ذریعہ بن گئی ہے مگر اس موقع پر یہ امر بڑا دلچسپ ہے کہ ساغر کی غزل بالکل سادے رنگ کی ہے، بات یہ ہے کہ ساغر کے کلام میں فلسفیانہ مضامین نہیں ملتے، غزل میں بھی اس نے سنگین غور و فکر کی بجائے تغزل کا ایک شگفتہ رنگ اختیار کیا ہے جو اس پر بڑا پھبتا ہے، مگر اس موقع پر خواجہ حسن نظامی صاحب کے دیباچے کا ایک اقتباس ضروری ہے، فرماتے ہیں: "ساغر کے کلام میں شاعری ہوتی ہے فلسفہ ہوتا ہے تصوف ہوتا ہے، روزمرہ کی زندگی کے نظارے ہوتے ہیں، ان کے اشعار میں شوکتِ الفاظ اور پرکیف بندشیں ہوتی ہیں، جدت آمیز پیرایہ بیان ہوتا ہے، ان کا کلام شاعری کے سب ہتھیاروں سے مسلح معلوم ہوتا ہے اسی لئے میں ان کو شاعری کا ہر ہٹلر کہتا ہوں" یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ حضرت خواجہ صاحب نے یہ کس طرح باور کر لیا کہ ساغر کے کلام میں تصوف بھی ہے اور فلسفہ بھی، شاعر کی شاعری خالصتاً موسیقانہ لی رِیکل ہے جس میں حسن و عشق کے داخلی جذبات اور قلبی واردات کا بیان ہے، یہ ٹھیک ہے کہ داخلی شاعری اکثر غیر شعوری طور پر فلسفیانہ اور متصوفانہ نظر آتی ہے مگر ہر شاعر کے متعلق یہی کہنا کہ اس میں تصوف بھی ہے اور فلسفہ بھی، ضد بھی ہے اور بے خبری بھی، سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرنا اور بات ہے، شعرا کے کلام کا خود مطالعہ کر کے ان کے عیب و صواب کو جانچنا اور۔

یہ ہے معنی آفرینی اور اسے کہتے ہیں سخن فہمی، اب اگر حالت یہی رہی تو پھر کیا تعجب اگر کل کو اردو کے ہر مصرعہ کے جملہ حقوق بحق صوفیائے کرام محفوظ ہو جائیں، داغ تو خیر جائیگا ہی، خدشہ ہے کہیں اردو سے جرکین کی سی متاعِ عزیز بھی نہ چھن جائے کیونکہ اگر معنی آفرینی کی یہ کیفیت اسیطرح چلتی رہی تو پھر جس شعر کو آپ چاہیں گے راجہ جی کا ہاتھی، پنڈت جی کی بہلی اور مولوی صاحب کا گھوڑا ثابت کر کے رکھدیں گے، اور اگر ہر شخص اپنی تفریح کے لئے اسی طرح اشعار کو مروڑ تا توڑتا رہا تو پھر رنڈی کے ناچ، بھانڈوں کی نقل، ہیجڑوں کے مجرے، مرغوں کی پالی اور چوسر کی بازی کے لئے کہیں باہر نجانا پڑے گا، سب سامانِ تفریح یہیں مہیا ہو جایا کرے گا، غضب ہے کہ شاعر کے منہ سے طفل دراز کا لفظ نکلتا ہے اور اس کے شارحین شور مچانا شروع کر دیتے ہیں کہ لیجئے اقلیدس کا ایک معمہ حل ہو گیا۔

باقی رہا فلسفہ سو یہ بھی ساغر پر بہت بڑا اتہام ہے، ساغر جہاں صوفی یا فقیہہ نہیں وہاں حکیم بھی نہیں، وہ کسی حکیم کے منفرد مشاہدات کو پیش کرنے کی بجائے حسن و عشق کے متعلق اپنے منتشر خیالات اور جذبات کا سچا سچا اظہار کرتا ہے، کیونکہ اپنے مزاج کی رنگینی کی وجہ سے اس کی طبیعت ان خشک مباحث سے نفور رہتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس کی غزل یا کسی دوسری موضوعی نظم سے ہستی کے اہم مسئلوں کے متعلق اس کی کوئی مستقل رائے دستیاب نہیں ہوتی اور اس کے کلام سے صاف صاف پتہ نہیں چلتا کہ دنیا اور حیاتِ دنیا کو وہ کیا سمجھتا ہے، مقصدِ زندگی اس کے نزدیک کیا ہے، انسان اور کائنات میں وہ کسی قسم کا تعلق دیکھتا ہے، خالق اور مخلوق میں کیا علاقہ سمجھتا ہے، اس میں شک نہیں کہ شاعری درحقیقت زندگی کی تنقید ہے اور ہمارے روزمرہ کے واقعات کی تفسیر۔ لیکن اس کے پیشِ نظر اگر ہم محض الفاظ کے الٹ پھیر ہی میں پڑے رہیں تو پھر جعفر زٹلی بھی بہت بڑا فلسفی نظر آئے گا، ساغر اپنے مخصوص رنگ کا مالک ہے غور و فکر کی بجائے پرجوش جذبات اس کے ماخذ ہیں فطرتِ انسانی کے جذباتی پہلوؤں سے زیادہ واسطہ رکھنے کی وجہ سے استدلال اور تفکر کو متاثر کرنا اس کا کام نہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ بلند پروازی اور فلسفیانہ غور و تعمق کی کوشش نہیں کرتا۔ "شفق کی پیشین گوئی" میں شاید پہلی نظر میں فلسفیانہ نظر آئے مگر غور کیجے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعر جس طرح پر معلول کی علت بیان کر رہا ہے اس سے اس کا کلام بجائے فلسفہ ہونے کے سائنس کا تکملہ ہے، اسی طرح "استقلال" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کو بھی فلسفیانہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسمیں بھی نرے مفروضات کی تفصیل ہے، کوئی نئی بات نہیں۔ "تیتری کی درسگاہ" میں شاعر کا بیان اس قدر مبہم ہے کہ جو بات وہ واضح کرنا چاہتا ہے اس کا مفہوم آخری شعر تک پہنچ کر بالکل ہی چیز غتربود ہو جاتا ہے، یہ تو تھیں نظمیں، غزل میں بھی فلسفیانہ مضامین بالکل دکھائی نہیں دیتے ساغر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ اپنے وارداتِ قلبی کو پرپیچ فلسفہ میں ملفوف کرنے کی بجائے سادگیِ بیان سے کام لیتا ہے

اسی لئے ساغر سے یہ توقع نہیں رکھی جاتی کہ وہ بھی اقبال یا غالب کی طرح ہر شعر میں کائنات کے عمیق اور سنگین مسائل سے بحث کرتا پھرے، ایک فلسفی کا کام جہاں پیغام فطرت کے رازوں کی تلاش ہے، ساغر کا کام مظاہر فطرت میں حسن کی تلاش ہے اور بس ؎

ساغر کی غزل میں چند الفاظ اس التزام کے ساتھ گھڑی گھڑی آئے ہیں کہ ان کا بکثرت استعمال ذوق سلیم پر ناگوار گذرتا ہے مثلاً مسکرانا، اب یہ لفظ کچھ اس طرح استعمال ہوا ہے کہ بہت کم ایسی چیزیں ہیں جنکو ساغر نے مسکراتا ہوا نہ بتلایا ہو، زمین آسمان، چاند ستارے، ندی نالے، وحوش و طیور، اشجار و اثمار سب پڑے مسکراتے ہیں، اسی طرح کافر کا لفظ آیا ہے تو صرف کافر نظر ہی نہیں بلکہ کافر صبحیں کافر گھٹائیں کافر یہ کافر وہ۔ دوشیزگی کا لفظ آیا ہے تو ہر شئے پر دوشیزگی چھا رہی ہے انگڑائی کا لفظ آیا ہے تو صرف یہی نہیں کہ ہاتھی بھینسے اور دھ بلاؤ مگرمچھ یا آسٹریلیا کے کنگرو اور بورینو کے اورنگ اوٹان ہی کو انگڑائی سے فرصت نہ ہو بلکہ خود فضا تک اسی حرکت میں منہمک ہے، اور "ہر تان میں کرشمہ انگڑائی لے رہا ہے"۔ باقی رہیں رباعیات، گو ساغر کی رباعیات میں اسکی پختگیٔ فن کی جھلک نظر آتی ہے، مگر کئی مقامات پر اپنے مفہوم کو اس نے جس طرح ادا کیا ہے وہ بھی ذوق سلیم کے حد درجہ منافی ہے، مثلاً یہ رباعی کس قدر مضحک تصور کو پیش کرتی ہے کہ

ماہ و خورشید آج پینے آئیں — زہرہ کو عدو میکدہ میں لائیں
وہ عالم کیف و وجد ہو اے ساقی — لولے کریں رقص اور گونگے گائیں

ذرا آنکھیں بند کرکے اس خیال کو تصور میں دیکھئے کس قدر خوفناک اور حد درجہ غیر شاعرانہ کیفیت نظر آتی ہے "لولے کریں قص اور گونگے گائیں" لاحول ولاقوۃ، الا باللہ العلی العظیم۔ واعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

ساغر کی شعری کوشش ہر طرح کی حوصلہ افزائی کی مستحق ہے، اس کی عمر ابھی زیادہ نہیں اس لحاظ سے اس سے بہت سی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں، اگر وہ راہ راست پر رہا تو یقیناً وہ ادب اردو میں اپنے لئے جگہ بنالے گا، اور اگر جھوٹی واہ واہ اور مبالغہ آمیز تحسین و آفریں ہی پر اس کے کان رہے تو انجام معلوم!

(محمود نظامی)

ایک ڈرامہ :-

عمل کے لئے لازمی

(از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج۔ بی اے)

کردار :- (۱) ڈراما نویس (۲) ایکٹر۔
مقام :- ڈراما نویس کے دفتر کا کمرہ۔
وقت :- رات کا گھڑیال دو بجاتا ہے۔

ایکٹر - ہوں۔ تو مختصر یہ کہ ڈراما لکھ مارا تم نے ؟

ڈراما نویس - جناب !

ایکٹر - مگر میرے عزیز ڈراما سنانے کے لئے یہ وقت تم نے کیا تجویز کیا ! رات کے دو بجے ڈرامے سُنے جاتے ہیں بھلا ؟

ڈراما نویس - ارے بھائی تم ایکٹروں کے دن کے وقت کا کچھ ٹھیک بھی ہو، نو بجے تو سوتے ہوئے اُٹھتے ہو، دس بجے نئے کھیل کی رہرسل کے لئے چل دیتے ہو، دوپہر کو کھانا کھا کر نیند پوری کرتے ہو، شام کا وقت تمہارا تفریح اور گھومنے پھرنے کے لئے مخصوص ہوتا ہے، ایسی صورت میں سوائے اس کے چارہ کیا تھا، کہ رات کے تماشے کے بعد تمہیں بُلایا جائے، اور اطمینان سے تنہائی اور یکسوئی میں بیٹھ کر ڈراما سُنا ڈالا جائے۔

ایکٹر - تماشے کے دوران میں ٹیلیفون کے ذریعے تمہارا پیام پہنچا۔ تو میں سمجھا۔ اللہ جانے کیا اہم بات ہے، جس کے لئے رات کے دو بجے مدعو کیا جا رہا ہے۔

ڈراما نویس - لیجئے۔ پہلے آپ کافی پیجئے۔

ایکٹر - نہ۔ شکریہ۔

ڈراما نویس - سچ مچ نہ پئیں گے ؟ آپ ہی کے لئے تو بنوائی تھی میں نے۔

ایکٹر - ضرورت نہیں (ہنس کر) ہاں اگر کھیل سننے سے نیند آ جانے کا اندیشہ ہو، تو جدا بات ہے۔

ڈراما نویس - سنکر تجربہ کر لیجئے .... تو سگرٹ تو سلگائیے۔

ایکٹر - شکریہ ! (سگرٹ سلگاتا ہے) بھائی واقعہ یہ ہے کہ ڈراما سننے سے مجھے وحشت بڑی ہوتی ہے۔

ڈراما نویس - ہر ایکٹر کا یہی حال ہوتا ہے۔

ایکٹر - ہر اچھے ایکٹر کا کہتے تو میں آپ کی رائے سے اتفاق بھی کرتا .... بہرحال فرمائیے۔

ڈراما نویس - کھیل کا نام ہے "دو رنگی دُنیا"۔ لکھا گیا ہے خاص آپ کیلئے

ایکٹر - غالباً اس کا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت تو نہ ہو گی ؟

ڈراما نویس - کر دیں تو شاید آپ کی سلیم الطبعی کا ایک کمزور سا ثبوت بہم پہنچ جائے، بہرحال۔ تو پہلا سین ہے۔ صولت کے مطالعہ کا کمرہ، یہ صولت کا پارٹ جناب کے لئے ہے، اب منظر کی تشیل پڑھ کر آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا، عام طور پر جس قسم کے آراستہ کمرے ہوتے ہیں، ویسا ہی ایک کمرہ ہے

لکھنے پڑھنے کی میز پر ایک ٹیلیفون دھرا ہے۔

ایکٹر۔ ضروری بات ٹھہری۔

ڈراما نویس۔ ضروری بات ٹھہری سے جناب کی مراد کیا ہے؟

ایکٹر۔ منتظر ہوں۔ کہ ایسا ڈراما کب کوئی لکھتا ہے، جس میں ٹیلیفون کی ضرورت لاحق نہ ہو جائے۔

ڈراما نویس۔ کیوں؟ ٹیلیفون اب نہایت عام اور روزمرہ استعمال میں آنے والی شے ہے۔ میرے اپنے ہاں بھی موجود ہے۔

ایکٹر۔ یہ تو میں مانتا ہوں کہ عام چیز ہے، اور بہت مفید چیز بھی ہے لیکن ڈراما میں ———

ڈراما نویس۔ ڈراما میں کیا؟

ایکٹر۔ ٹیلیفون ڈراما نویس کی طبیعت کے عجز کا اظہار کرتا ہے۔ ہر ڈراما نویس اس قسم کے کمزور ذرائع محض اس لئے استعمال میں لاتا ہے۔ کہ پلاٹ کی بعض مشکلات سے عہدہ برآ ہو۔ بعض بزرگوں نے تو۔ اللہ ان کی مغفرت کرے ٹیلیفون سے کھیل کا پلاٹ تک واضح کرنے کی خدمت لی ہے۔

ڈراما نویس۔ میرے ہاں ان میں سے کوئی بات بھی نہیں۔

ایکٹر۔ تو پھر ٹیلیفون کو ڈراما میں گھسیٹ کیوں لیا؟

ڈراما نویس۔ اس لئے کہ ڈراما کے عمل کے لئے یہ شے لازمی قرار دی جا سکتی ہے۔

ایکٹر۔ تو یہی تو بک رہا ہوں، کہ قرار نہیں دینی جانے چاہئے تھی ...... بہر حال فرمائیے۔

ڈراما نویس۔ دوسری اہم چیز ایک پستول ہے، جو لکھنے پڑھنے کی دراز میں رکھا ہوا ہے۔

ایکٹر۔ جانتا تھا کہ ہوگا۔

ڈراما نویس۔ آخر کیوں نہ ہو؟

ایکٹر۔ میرے عزیز۔ تم سب کو ڈراما لکھنے کا شوق ہوتا ہے، ڈراما کو کسی قسم کی ترقی دینے کا شوق کیوں نہیں ہوتا؟ بس تمہارے اتنے ہی بیان سے میں نے سمجھ لیا کہ یہ ڈراما کس نوع کا ہے،

ڈراما نویس۔ اسی نوع کا ہے جس نوع کے ڈراموں میں تم پارٹ کرتے ہو۔

ایکٹر۔ اونہہ! بھائی میرے مجھے پارٹ کرنے کے لئے کسی نئے قسم کے ڈراما کی تلاش ہے، ٹیلیفون تو خیر میں ہضم کر گیا، یہ پستول کس طرح حلق سے اُتاروں؟

ڈراما نویس۔ اس کے بغیر میرا کام جو نہیں چل سکتا۔

ایکٹر۔ اب تم اسے بھی ڈراما کے عمل کے لئے لازمی شے قرار دے رہے ہوگے واہ صاحب واہ۔

ڈراما نویس۔ قطعی۔

ایکٹر۔ میرے خیال میں اگلی بات جناب اب یہ فرمائیں گے۔ کہ ہندوستان کے ہر معزز گھرانے میں پستول میز کی دراز میں ضرور رہتا ہے؟

ڈراما نویس۔ گمان غالب تو یہی ہے۔

ایکٹر۔ شاید آپ کی اپنی میز کی دراز میں بھی موجود ہو؟

ڈراما نویس۔ ہاں میری پوچھتے ہیں تو میرے ہاں تو واقعی موجود ہے۔ یہ دیکھئے۔

(دراز کھول کر پستول نکالتا اور میز پر دھر دیتا ہے)

ایکٹر۔ لاحول ولا قوۃ! مرد آدمی تمہارا اس شے سے کیا واسطہ؟ کیا نکتہ چیں نقادوں کو بھگانے کے واسطے رکھا ہوا ہے؟

ڈراما نویس۔ کام میں نہیں لاتا، مگر احتیاطاً رکھ چھوڑا ہے، ابا جان فوج میں ملازم تھے، ان کے زمانے سے گھر میں موجود ہے

ایکٹر۔ بھائی سچ پوچھتے ہو، تو ان چیزوں نے تمہارے ڈراما میں میرے لئے تو کوئی دلچسپی چھوڑی ہی نہیں۔

ڈراما نویس۔ کیا مطلب؟ نہیں سننا چاہتے ڈراما؟

ایکٹر۔ عزیز من یہ جو طرح طرح کے انوکھے اور دور از قیاس واقعات سے بھرے ہوئے ڈرامے ہوتے ہیں، مجھے انکے خیال سے بھی متلی سی ہونے لگتی ہے؛

میں چاہتا ہوں کہ سٹیج پر صرف روزمرہ کی عام زندگی پیش کی جائے۔

ڈراما نویس ۔ مگر میرے ڈرامامیں تو کوئی انوکھے واقعات نہیں ۔
ایکٹر ۔ انوکھے واقعات نہیں! یعنی ٹیلیفون اور پستول سے بسم اللہ کرکے جناب یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ نے شکنتلا کے پائے کی کوئی چیز لکھ لی ہے؟
ڈراما نویس ۔ میں نے تو سیدھے سادے انسانوں کی زندگی پیش کی ہے
ایکٹر ۔ اور اس میں ڈراما کا زور بھی ہے؟
ڈراما نویس ۔ پستول جناب نے ملاحظہ فرمالیا، یہ ہے تو زور بھی ضرور ہوگا۔
ایکٹر ۔ علاوہ ازیں پریشانی اور اضطراب کی ایک قیامت ٹیلیفون پر بھی برپا ہو جاتی ہوگی ۔
ڈراما نویس ۔ کم وبیش ۔
ایکٹر ۔ میرے دوست اِن حرکتوں سے کام نہ چلے گا ۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ کہ لوگ کمر میں پستول لٹکائے پھرتے ہوں ۔ کم از کم ان لوگوں کا حال یہ نہیں ۔ جو انسان کہلائے جاسکتے ہیں، باقی رہا ٹیلیفون تو یہ آلہ موجودہ زمانہ میں عموماً صرف اس غرض کے لئے استعمال ہوتا ہے کہ تار گھر سے ٹھیک وقت پوچھ لیا۔ کسی سے ملاقات کا وقت مقرر کرلیا، یا کسی دوکان سے کسی شے کی قیمت دریافت کرلی ۔
ڈراما نویس ۔ یہ جناب کا ایمان ہے؟
ایکٹر ۔ ارے بھائی، میں ایک عام قسم کا آدمی ہوں، میکلوڈ روڈ پہ ایک عام قسم کے مکان میں رہتا ہوں، میرے ملازم عام قسم کے ہیں، اور عام قسم کے بچوں کا باپ ہوں۔
ڈراما نویس ۔ اور ایک عام قسم کی بیوی کے شوہر بھی؟
ایکٹر ۔ خیر یوں بھی کہہ لیجئے ۔
ڈراما نویس ۔ گو ہر یہ بات سنیں تو نہ جانے دل میں کیا کہیں ۔
ایکٹر ۔ سمجھ جائیں کہ میری مراد کیا ہے ۔
ڈراما نویس ۔ (طنزاً) جتنی اچھی طرح آپ کی بیگم صاحبہ کو میں جانتا ہوں، اس کا خیال کرکے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ سمجھ جائیں گی اور کیا جناب بھی عام قسم کے شوہر واقع ہوئے ہیں؟
ایکٹر ۔ بالکل ۔
ڈراما نویس ۔ خوش ہیں؟
ایکٹر ۔ نہایت ۔
ڈراما نویس ۔ گو ہر خوش ہیں؟
ایکٹر ۔ بیشک کیوں نہ ہوتیں ۔
ڈراما نویس ۔ تم بہ ظاہر مطمئن اور بھاری بھر کم قسم کے لوگ کس قدر دروغ گو واقع ہوئے ہو ۔ تم لوگ اپنے آپ سے بھی جھوٹ بول لیتے ہو۔
ایکٹر ۔ کیا کہہ رہے ہو؟
ڈراما نویس ۔ میرے خیال میں جو کچھ میں نے کہا۔ آپ نے واضح طور پر سُن لیا ہے ۔
ایکٹر ۔ بیٹھے بیٹھے یک لخت اتنے متین کیوں بن گئے آپ؟
ڈراما نویس ۔ میں ہمیشہ متین رہتا ہوں، متانت میرے پیشے کا لازمی جزو ہے ۔
ایکٹر ۔ ارے بھائی مجھے کیا معلوم تھا، تم اتنے نازک طبع واقع ہوئے ہو، ڈراما کے متعلق ذرا سی تنقید سے سلگ اٹھو گے ۔
ڈراما نویس ۔ ڈرامے کی بات نہیں، تمہاری بات ہے ۔
ایکٹر ۔ میری کیا بات؟
ڈراما نویس ۔ تمہاری اور تمہاری عام قسم کی زندگی کی، تم اُن ذلیل ایکٹروں میں سے ایک ہو جنہیں اس بات کا جنون رہتا ہے کہ سٹیج پر فطرت کو اپنی اصلیت میں دکھائیں، جو سمجھتے ہیں کہ سٹیج پر چائے پی لینا اور رانڈا کھا لینا ڈراما کے فن کی معراج ہے، میرے خیال میں جناب کے نزدیک اسٹیج پر سسر سے سالے کا لفظ آجانا بھی حد درجہ شرمناک ہوگا، تم سے تو بات کرکے اُبکائی آتی ہے ۔
ایکٹر ۔ جناب کو جو کچھ فرمانا تھا فرما چکے؟
ڈراما نویس ۔ نہیں ابھی نہیں، ابھی میں چاہتا ہوں کہ آپ کو خود پسندی کے

اس خول میں سے باہر نکالوں، جس میں جناب نہایت دلجمعی سے تشریف فرما ہیں کہ آپ کی نظر وسیع ہو سکے۔

ایکٹر۔ کیا احمقوں کی سی باتیں کرنے لگے۔

ڈراما نویس۔ جی نہیں، میں مردوں کی سی باتیں کر رہا ہوں اور جناب کی طرح میں عام قسم کا ایک مرد نہیں ہوں اور جناب کی طرح آپ کی بیگم صاحبہ بھی عام قسم کی ایک عورت نہیں ہیں۔

ایکٹر۔ بک کیا رہے ہو؟

ڈراما نویس۔ بیشک، آپ کو جو ڈراما سے ناواقف ہیں، کیا معلوم میں کیا بک رہا ہوں، پچھلے چھ مہینے سے ایک ڈراما آپ کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے، پھر بھی آنکھوں والے اندھے کو پتہ نہ لگ سکا، کہ کیا ہو رہا ہے۔

ایکٹر۔ ان باتوں سے میری بیوی گوہر کا کیا تعلق ہے؟

ڈراما نویس۔ جا کر گوہر سے دریافت کیجئے کہ مجھ سے اس کا کیا تعلق ہے

ایکٹر۔ تم سے؟ تم اور وہ مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہو، اور کیا؟

ڈراما نویس۔ صرف جانتے ہی ہیں؟

ایکٹر۔ (متانت سے) ہاں احمق نہیں ہوں میں۔

ڈراما نویس۔ اور میں عام قسم کا مرد نہیں ہوں۔

ایکٹر۔ کیوں ایک بے معنی لفظ کو دُہرائے چلے جا رہے ہو۔

ڈراما نویس۔ اب جناب اس لفظ کو بے معنی قرار دینے لگے، کچھ دیر پہلے جناب اس لفظ پر ناز فرما رہے تھے۔

ایکٹر۔ میری بیوی کے متعلق جو کچھ کہنا ہے، صاف صاف کہتے کیوں نہیں؟

ڈراما نویس۔ صاف صاف؟ تو سنئے، کہ عام قسم کے مرد عورتوں کو سنبھالنے کے اہل نہیں ہوتے، اصلی عورتوں کو اس شے کی تلاش ہوتی ہے، جن سے ان کا خون رگوں میں جلترنگ کی طرح بجنے لگے،

ایکٹر۔ جناب کیا اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ میری بیوی کیلئے دوست سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتے ہیں؟

ڈراما نویس۔ اسے مجھ سے عشق ہے۔

ایکٹر۔ جھوٹے، کمینے؟

ڈراما نویس۔ میرے دوست احتیاط با احتیاط! یہ ڈراما ہے۔

ایکٹر۔ یہ حقیقت ہو تو تم میرے ہاتھ سے زندہ نہ بچنے پاؤ۔

ڈراما نویس۔ یہ فقط نصف حقیقت ہے۔

ایکٹر۔ (حقارت سے) بس؟

ڈراما نویس۔ باقی نصف یہ ہے کہ مجھے بھی اس سے عشق ہے۔

ایکٹر۔ (خطرناک سکون سے) یہ باتیں کیوں مجھ سے کہہ رہے ہو؟

ڈراما نویس۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ کل تک ویسے بھی آپ کو معلوم ہو جانا تھا۔

ایکٹر۔ کیونکر؟

ڈراما نویس۔ ہم نے طے کر رکھا ہے کہ کل ہم دونوں اکٹھے بھاگ جائیں گے روز روز کی بہانہ سازیوں، پوشیدہ ملاقاتوں اور ذلیل ہوٹلوں میں راتیں بسر کرنے سے ہم اکتا چکے ہیں۔

ایکٹر۔ کمینے، سؤر!

ڈراما نویس۔ اوسط درجے کے ہوٹلوں میں ہمیں اندیشہ رہتا ہے کہ ہم شناخت نہ کر لئے جائیں۔

ایکٹر۔ مجھے ان سب باتوں پر یقین کرنے کے لئے صرف ایک لفظ سننے کی ضرورت ہے۔

ڈراما نویس۔ اپنی بیگم صاحبہ سے؟ سن لیجئے گا، بشرطیکہ ملاقات نصیب ہو؟

ایکٹر۔ نصیب؟ وہ اس وقت گھر پر ہے۔

ڈراما نویس۔ جناب غلطی پر ہیں۔

ایکٹر۔ تو سمجھتا ہے، مجھے علم نہیں، میری بیوی کہاں ہے، میں ابھی دکھائے دیتا ہوں۔

ڈراما نویس۔ قابل رحم احمق ہو۔

ایکٹر۔ (ٹیلیفون کرتا ہے)

ڈراما نویس ۔ جب میرے پیام کے جواب میں آپ نے تھیٹر سے مجھے
فون کیا، اور کہا ۔ آپ تماشا ہو چکنے کے بعد میرے پاس آئیں گے
اور میرا ڈراما سنیں گے تو آپ کی بیگم صاحبہ میرے پاس
تشریف رکھتی تھیں ۔

ایکٹر ۔ میری بیوی گھر پر تھی، اس نے خود کہا تھا کہ وہ کہیں باہر نہیں
جا رہی، وہ تھیٹر بھی نہ آئی تھی ۔

ڈراما نویس ۔ اس کے سوا وہ آپ سے اور کہہ کیا سکتی تھی ؟
(وقفہ جس میں ڈراما نویس کے گھر خالی گھنٹی بجنے کی آواز
آتی رہتی ہے)
دیکھا ؟ جناب کو کوئی جواب نہیں مل رہا ۔

ایکٹر ۔ وہ سو رہی ہے (ٹیلیفون بند کر دیتا ہے) میں تجھے گھر لے جا کر
ثابت کر سکتا ہوں، کہ وہ وہیں ہے ۔

ڈراما نویس ۔ جی نہیں، آپ کی بیوی گھر پر موجود نہیں ہے ۔

ایکٹر ۔ کیوں ؟

ڈراما نویس ۔ اس لئے کہ وہ ابتک اس گھر سے رخصت نہیں ہوئیں ۔

ایکٹر ۔ وہ یہاں ہے ؟

ڈراما نویس ۔ جی ہاں، یہاں ہیں، اس گھر میں، میری خوابگاہ میں
یہاں وہ اُسوقت بھی تھیں، جب میں نے آپ کو فون کیا تھا،

ایکٹر ۔ میں اس گھر کا ایک ایک کونہ دیکھوں گا ۔

ڈراما نویس ۔ جناب اس کمرے سے قدم باہر نہیں رکھ سکتے ۔

ایکٹر ۔ مجھے روکے گا ؟

ڈراما نویس ۔ جبتک میرے جسم میں خون کی ایک بوند بھی موجود ہے ۔

ایکٹر ۔ اونہہ ہونہہ!

ڈراما نویس ۔ اور گو جناب کا نہیں ۔ مگر میرے جسم کا خون واقعی
لال ہے ۔

ایکٹر ۔ جان عزیز ہے یا نہیں ؟

ڈراما نویس ۔ جان ؟ بہت ـــــ اور گوہر کو بھی ۔

ایکٹر ۔ میں کہتا ہوں، راستہ چھوڑ دے ۔

ڈراما نویس ۔ ناممکن ۔

ایکٹر ۔ (جلدی سے پستول گھسیٹ کر) ہٹ جا، ورنہ اسی پستول سے
بھیجا پاش پاش کر دوں گا ۔

ڈراما نویس ۔ میری جان لوگے ؟

ایکٹر ۔ میں اپنی بیوی کا پتہ لگانا چاہتا ہوں، اور کوئی خیال مجھے
اس سے باز نہیں رکھ سکتا ۔

ڈراما نویس ۔ پستول رکھ دو اور بیٹھ جاؤ ـــ نہیں ؟ ـــ بہت
اچھا، پستول سنبھالے رکھو اور بیٹھ جاؤ ۔ مجھے تم سے کچھ
کہنا ہے ۔

ایکٹر ۔ کہو !

ڈراما نویس ۔ میز پر ٹیلیفون اور دراز میں پستول دونوں چیزیں
کھیل کے عمل کے لئے لازمی ہیں ۔ آیا سمجھ میں ؟

ایکٹر ۔ (ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گر جاتا ہے) اوہ !

ڈراما نویس ۔ جی ۔ تو میں کیا پڑھ رہا تھا، میرے ڈرامے کا
پہلا سین ہے ۔ صولت کے مطالعے کا کمرہ، منظر کی
تمام تفصیل پڑھ کر آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا ۔
عام طور سے جس قسم کے آراستہ کمرے ہوتے ہیں، ویسا
ہی ایک کمرہ ہے، لکھنے پڑھنے کی میز پر ....

(سید امتیاز علی تاج)

A.I

ایم۔ایل۔اے

(از جناب پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی۔ایم۔اے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

دنیا میں جب قابل آدمیوں کی تعداد زیادہ اور خوراک کم ہوجاتی ہے۔تو ہر چھوٹی بات بڑی اور بڑی بات چھوٹی معلوم ہونے لگتی ہے۔اور ہم اس کے درپے ہو جاتے ہیں۔کہ کوئی ایسی بات کہیں۔کہ لوگ متعجب ہو جائیں اور کوئی کام ایسا کریں۔کہ پٹتے پٹتے بچیں۔ لیکن ان دونوں باتوں میں سے کوئی بھی وقوع میں نہ آئے تو سمجھ لیجئے۔کہ جنگ قریب اور دلی دُور ہے۔

مانی ہوئی باتوں کے خلاف کوئی بات کہنا اپنی روشن خیالی کی دلیل ہو یا نہ ہو، زمانہ کے ترقی پذیر ہونے کا بہت بڑا ثبوت ہے۔اور جب تک زمانہ ترقی پذیر ہے۔افراد کی کمزوری اور جماعتوں کی دست درازی ہمیشہ نظرانداز کیجائیگی مفروض کیجئے۔ہم کسی بڑے آدمی کو بیوقوف یا از کار رفتہ قرار دیتے ہیں۔یا بیوقوف یا از کار رفتہ کو بڑا آدمی گردانتے ہیں۔یہ بات معقول ہو یا نامعقول۔اس کے دلچسپ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ایسی ہی باتوں سے ہماری دلچسپی بڑھتی ہے۔اور ظاہر ہے دلچسپی کی ابتدا ادھر ہی سے ہوتی ہے۔جہاں سے مبالغہ شروع ہوتا ہے۔اور مبالغہ وُہ چیز ہے جو دلچسپ ہے۔تو سب کچھ ہے ورنہ صرف ناگزیر حماقت ہے۔

روایت ہے کہ جب پُرانی دنیا سے نئی دنیا کا جنم ہُوا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ وُہ اب تک بڑی حماقت میں مبتلا تھے۔اور آپ تو جانتے ہیں۔جب کسی کو اپنی حماقت کا احساس ہوتا ہے۔تو اس کو احمق تر بننے کے علاوہ چارہ نہیں ہوتا۔اس حماقت کا انکشاف ہونا تھا۔کہ دُنیا کے مشاعرہ میں ایک مصرعہ طرح دیدیا گیا۔(یعنی) ابتک افراد نے جماعت کو نظرانداز کر رکھا تھا۔اور وقت آگیا ہے۔کہ افراد اپنے حق پر قابض ہو جائیں۔چنانچہ اس مصرعہ طرح پر طبع آزمائی ہونے لگی۔کہا یہ جانے لگا۔کہ آجتک ایک عقلمند کے ہاتھ میں ہزار بیوقوفوں کی نکیل تھی۔وہ جدھر چاہتا تھا۔اُنھیں گھما دیتا تھا۔اس قباحت کا علاج یہ ہے کہ ہزار بیوقوفوں کے ہاتھ میں ایک عقلمند کی نکیل دیدیجائے۔عقلمند کے لئے یہ زمانہ اور یہ موقع بڑا نازک تھا لیکن عقلمند پھر عقلمند تھا۔اُس نے اپنی نکیل تو بیوقوفوں کے ہاتھ میں رہنے دی۔لیکن اپنا ذہن و دماغ اپنے ہی لئے محفوظ رکھا۔عقلمند کا کچھ نہ بگڑا۔بیوقوفوں کو بھی شکایت کا موقعہ نہ رہا۔اور الکشن ہونے لگے۔

قومی بیداری میں الکشن کا بہت بڑا درجہ مانا گیا ہے۔اور جس زور شور کے ساتھ الکشن . . . لڑایا جاتا ہے۔اُسی اعتبار سے قومی بیداری کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔مجھے اس سے بحث نہیں کہ کونسی جماعت کس اُصول کیلئے الکشن لڑتی یا لڑاتی ہے۔مجھے تو اس سے سروکار ہے۔کہ ہمارے کس اُصول پر الکشن بازی ہوتی ہے۔اُصول کے لئے لڑنا یا اُصول پر لڑنا میرے نزدیک دو علیحدہ باتیں ہیں۔ممکن ہے کہ آپ کے نزدیک نہ ہوں اور یہ میں اس لئے کہہ دیتا ہوں کہ ہم آپ الکشن کے سلسلہ میں کہیں سر پھٹول کی خاطر نہ کہیں لڑنے لگیں۔فرض کیجئے۔ہم میں آپ سے کوئی صاحب مریخ پر قبضہ کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔اس آمادگی کے دو پہلو ہیں۔اوّل تو مریخ کا تصرف میں لایا جانا دوسرے مریخ کی سڑکوں کی مرمت کا ٹھیکا لینا۔ظاہر ہے کہ مریخ پر قبضہ کرنے کے لئے ہم کو قانون سے مدد لینی ہوگی یا میونسپلٹیوں سے۔کہ ہم واقعی مریخ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔یا اپنے سڑک کوٹنے والے انجن کا مصرف تلاش کرنا چاہتے۔لیکن مجھے اندیشہ ہے میونسپلٹی اور مریخ کے مسائل ہمارے بہت سے سننے والوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔کیونکہ میں نے بھی انہیں کچھ یونہی سا سمجھ رکھا ہے۔اس لئے میں اس مسئلہ کی وضاحت مثال سے کر دینا چاہتا ہوں۔مثال کو اصل سمجھ کر آپ میری جان کے پیچھے نہ پڑ جائیے گا۔کیونکہ آپ نے سُنا ہوگا۔مثال را چہ زوال۔"

جب الیکشن کا زمانہ آتا ہے یا موسم یا ہم خود بدلنے لگتے ہیں تو اس کے آثار پہلے سے نمایاں ہونے لگتے ہیں۔فرض کر لیجئے ہم بچپن سے جوانی کی حدود میں آرہے ہیں۔دل میں خواہ مخواہ ایسی باتیں پیدا ہوں گی جن کا

لازمی نتیجہ پٹ جانا ہوتا ہے۔ اسی طرح فرض کر لیجئے۔ برسات کی آمد ہے۔ ہوا کے پہلے جھونکے ہی بلکہ اس سے بھی پہلے آپ کا جوڑ جوڑ گذشتہ واقعات کی یاد تازہ کرانے لگے گا۔ یعنی کب اور کہاں کہاں پٹے تھے۔ ہم ان سے سبق نہ سیکھتے رہیں اور بڑھاپے میں جوانی کی یادیں نہ آتی رہے تو آپ یقین مانیئے آپ بڑھاپے میں پٹ جائیں گے اور یہ زمانہ اس قسم کی تفریحات کے لئے ذرا نازک ہوتا ہے۔

اسی طرح الکشن کا زمانہ بھی اپنے آثار پہلے سے واضح کرنا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے غازی میاں کے میلے میں ڈفالی اپنی ڈف بجاتے ہیں۔ اور عورتیں اور جھنڈے اپنے اپنے طور پر وجد کرتے اور سر دھنتے ہیں۔ اسی طرح الکشن کے زمانہ میں لیکچر، پمفلٹ، دعوت، قرض، ادھار، رونا، گڑگڑانا، چیخ پکار، مار دھاڑ، جوتم پیزار کا بازار گرم ہوتا ہے۔ کوئی قرض لیتا ہے، کوئی بیوی کا زیور بیچتا ہے، کوئی اپنی موٹر خریدتا ہے، کوئی پرانی عداوت کو نئی محبت سے بدلتا ہے، اور کوئی پرانی محبت کو نئی عداوت پر بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ صوفیا نے تزکیۂ نفس کے لئے بڑی بڑی مشقیں تجویز کی ہیں۔ مثلاً بدنامی اور رسوائی مول لینا، ذلیل پیشے اختیار کرنا وغیرہ وغیرہ، تاکہ غرور اور خود پسندی کا قلع قمع ہو جائے۔ الکشن میں بھی یہی ہوتا ہے۔ فرق نیتوں کا البتہ ہوتا ہے۔ تصوف و اخلاق میں انسانی فضائل کی برتری اور فرعونیت کا استیصال منظور ہوتا ہے۔ الکشن میں حکومت کی بازیگری، کمیٹی کی ممبری اور ٹھیکے کی نیلام پر مدِنظر ہوتی ہے۔ آپ اپنی اور دوسروں کی دانست میں کتنے ہی قابل، معقول اور شریف النسب کیوں نہ ہوں۔ الکشن میں کھڑے ہو جایئے۔ آپ کے یہ سارے فضائل چوری کے مال اور لاٹھی کے گز سے ناپے جانے لگیں گے۔ یہاں تک آپ میں وہ باتیں ثابت کر دی جائیں گی۔ جو چوروں، اچکوں، بے ایمانوں اور احمقوں میں عام طور پر ملتی ہیں۔

اب آیئے تھوڑی دیر کے لئے میں یا آپ کسی الکشن میں ممبر منتخب ہونے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ اب تک ہمارے آپ کے جیسے شیریں تعلقات رہے ہیں۔ یعنی میں جو چاہوں کہتا جاؤں اور آپ سب کچھ سنتے جائیں وہ ختم ہو جائیں گے، اب آپ کے جو کچھ جی میں آئے گا آپ میرے متعلق کہیں گے اور میں جو کچھ جی میں آئے گا، آپ کے بارے میں کہوں گا۔ کوئی کسی کا سننے گا نہیں کہیں گے سب کچھ سنیں گے اسی وقت جب الکشن بازی کے بجائے مقدمہ بازی پر اُتر آئیں گے اُس وقت کوشش یہ کریں گے کہ عدالت میں وہی باتیں کہیں جو نہ کہی گئی ہوں۔ اور نہ کبھی کہی جانے کے قابل ہوں اور نہ سنی ہوں اور نہ سنی جانے کے قابل ہوں۔ جن کو بزرگوں نے ناشُدنی اور ناشنیدنی دونوں کہا ہے لیکن ابھی سے عدالت کی بشارت کیوں سنیں یا سنائیں۔ عدالت کا دروازہ تو اس وقت کھٹکھٹایا جائے گا۔ جب ریڈیو اور سنجات کے دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور آپ تو جانتے ہیں اسی قسم کے بعض دروازے بند ہونے لگتے ہیں تو قیامت آ جاتی ہے۔

لیکن میں آپ کو اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ کم سے کم اس وقت تک جب تک کہ آپ میرے مقابلے میں خود الکشن میں کھڑے نہ ہو جائیں۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ مجھ پر جو کچھ گزر چکی ہے اُس کا حال آپ کو سنا دوں۔ بہت ممکن ہے آپ الکشن کے ارادہ سے باز آ جائیں۔ ورنہ مواقع آتے ہی رہتے ہیں۔ فوتی فراری کے اس سلسلہ میں آپ بھی قسمت آزمائی کر لیجئے گا۔ میں الکشن میں کھڑا ہونے کے لئے آمادہ نہ ہوتا تھا۔ لیکن میرے دوستوں نے مجھے بتایا کہ میں.. اپنی قابلیتوں سے ملک و قوم کو محروم رکھ کر بڑا ظلم کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ دوسرا شخص جو اس جگہ کے لئے کھڑا ہوا ہے۔ وہ انتہا درجہ کا خود غرض اور نامعقول ہے۔ قوم اور ملک اُس کے ہاتھوں تباہ ہو جائیں گے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ میں اس شخص کو کامیاب نہ ہونے دوں۔

لیکن بات یہ ہے کہ مجھے اس کا مطلق فکر نہ تھا کہ اُس شخص سے ملک و قوم کو کتنا نقصان پہنچے گا۔ اور مجھے کچھ اس پر بھی اعتماد نہ تھا کہ میں قوم و ملک کو عرش پر پہنچا دوں گا۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے میرے طرفداروں اور میرے حریف کے طرفداروں میں چشمک تھی اور وہ دونوں چاہتے تھے۔ کہ ہم دونوں کو لڑا کر خود جی کا حوصلہ نکال لیں۔

آپ کو نہیں معلوم، انسان اپنی تعریف سن کر کسقدر اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے وہ اپنی نااہلی سے خوب واقف ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں چاہتا کہ اُس کی نااہلی سے دوسرے واقف ہوں، اور یہی اُس کی نااہلی کی سب سے بڑی پہچان ہے۔ اس لئے کہ نااہلی وہ چیز ہے جو صرف ظاہر ہونے کے لئے بنائی گئی ہے اور سب سے بڑا نااہل وہ ہے جس کی نااہلی کا انکشاف اس وقت ہو جب وہ اُس کی روک تھام نہیں کر سکتا۔

چنانچہ میں اللہ کا نام لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایسے مواقع پر اللہ کا نام اللہ کے لئے نہیں لیا جاتا، بلکہ محض اس لئے کہ اس موقع پر فقرہ کی ترتیب ہی اللہ کے نام سے ہوتی ہے۔ روپے کا سوال ہوا، کچھ قرض لئے، کچھ بیچا، کچھ خیرات مانگا، کچھ چرایا۔ اشتہارات چھپوائے۔ سیکنڈ ہینڈ موٹر خریدی۔ دو چار غنڈے نوکر رکھے۔ ایک آدھ فتوے لکھوائے۔ ایک پرانا سا ریڈیو خریدا۔ دو چار مایوس الحال وکیلوں کو کرایہ پر لیا، پانچ سات طالب علموں کو پکڑا، دو چار لیڈروں کو منی آرڈر بھیجے۔ کچھ مولوی، ایک آدھ اخبار نویس، دو چار گنڈے تعویذ والے غرض ان سب کو لئے دیئے میدان میں نکل پڑا۔

ایک گاؤں میں ووٹروں کی تعداد زیادہ تھی وہاں پہنچا۔ خبر کی گئی جلسہ ہوگا۔ ڈیرے لگائے گئے، کھانا پکنا شروع ہوا۔ نفیری بجنی شروع ہوئی۔ آذان دی گئی، دیہاتی جمع ہوئے۔ مولوی صاحب نے اللہ رسول کا واسطہ دلایا۔ طالب علموں نے "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگایا، وکیلوں نے معاملے کی بات شروع کی۔ گنڈے تعویذ والوں نے فصل تیار ہونے، قرض ادا کرنے اور بچے پیدا ہونے کے تعویذ دینے شروع کر دئے۔ ریڈیو نے ہیضہ کا پرچہ ترکیب استعمال سنانا اور بازار کے بھاؤ بتانا شروع کر دیا۔ لیڈروں نے کھانے کی فہرست اور غسل خانہ کے اہتمام پر نظر ڈالی۔ غنڈوں نے ڈنڈے سنبھالے اور اس خاکسار نے وضو کرنا شروع کیا۔ اپنے پرائے سبھی کی نظر پڑ رہی تھی۔ وضو کرنے کی مشق بھی یونہی سی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہاتھ دھونے سے پہلے منہ دھونا شروع کر دیا۔ اور آخر میں پاؤں دھونے سے پہلے ناک میں پانی ڈال کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ قیامت یہ ہوئی کہ لوگوں نے امامت بھی میرے ہی سپرد کی۔ نماز پڑھنے ہی کی کب توفیق ہوئی تھی کہ امامت کے فرائض بھی سپرد کر دئیے گئے۔ عید بقرعید میں کن انکھیوں دیکھ ہاتھ باندھنا چھوڑ دیتا تھا۔ امامت کیا کرتا۔ دوسرے یہ کہ موسم ابر آلود تھا۔ گھبراہٹ بھی تھی، دوسروں کی زبردستی سے امامت کیلئے کھڑا تو ہوگیا۔ لیکن کھڑے ہو جانے کے بعد یہ شک ہوا کہ عصر کی نماز پڑھانی تھی یا مغرب کی۔ عصر کی چار رکعتیں پڑھوں یا مغرب کی تین، آواز سے پڑھوں یا بغیر آواز کے۔ نیچے اوپر دیکھ کر اور کچھ نہ سمجھ کر ایک آہ سرد کھینچی اور خود ہی تکبیر کہنے لگا۔ مقتدیوں میں سے کسی نے زور سے تکبیر شروع کی تو میں سمجھا کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ نماز شروع کی، عصر کی نماز تھی۔ مغرب کا شبہ تھا بوکھلاہٹ پہلے سے طاری تھی۔ بے اختیار بلند آواز سے الحمد شروع کر دی۔ کچھ لوگ کھانسے کھنکارے۔ میں نے سمجھا موسم خراب ہے۔ راستہ کی گرد و غبار اور عام چیخ پکار کے سبب سے لوگوں کا گلا خراب ہو رہا ہے۔ قیامت اس وقت آئی جب میں نے قُلیا کی سورۃ شروع کر دی۔ میں یہ سمجھتا تھا کہ چھوٹی سی سورہ ہے جلد ختم ہو جائے گی۔ لیکن اس میں ایک فقرہ کچھ ایسے موقع سے آگیا ہے کہ ذرا زبان ڈگمگائی پھر عمر بھر پڑھتے جائیے سورہ ختم نہ ہو۔ الٰہی اب کیا ہو۔ جی چاہتا تھا کہ سجدے میں چلے جائیے اور پھر عمر بھر نہ اُٹھیے۔ رکوع کا تو بہانہ تھا بے اختیار سجدے میں گیا۔ تھوڑا پڑھا۔ بہت کچھ سوچا کوئی بات سمجھ میں نہ آئی کراہتا ہوا اور کچھ پڑھتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اس دفعہ صرف قل ہو اللہ پر اکتفا کی اور ذرا دم لیا۔ دوسری رکعت بھی ختم کی، تیسری رکعت میں خوشی تھی کہ سورہ نہ پڑھنی پڑے گی۔ التحیات پڑھنے بیٹھ گیا۔ لوگوں پر زلزلہ کا دورہ پڑ ہی رہا تھا۔ اس دفعہ اس انداز سے شروع ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ نماز اور میرا فاتحہ ساتھ ہی ہوگا۔ سلام پھیر کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ اس میں بھی کچھ عربی کے کلمات پڑھنے تھے، التجا عمر بھر کی تھی۔ دعا کبھی نہ مانگی تھی۔ اردو میں دعا مانگتا تو

قبول نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے ردوقبول کا سوال بھی نہ تھا، خیال تھا کہ مقتدی یعنی ووٹر کیا کہیں گے - عربی کا فقرہ کوئی یاد نہ آتا تھا - خط وکتابت یا اخباروں میں اکثر اِنّا للّٰہ وانا الیہ راجعون سُنا تھا - نہایت حزیں اور رقت آمیز لہجہ میں یہی پڑھ کر اُٹھ کھڑا ہوا - ایک طرف سے آواز آئی - جو کافی معنی خیز تھی - آمین یارب العالمین

اس کے بعد مجھ پر کیا گزری - خدا کرے کسی پر نہ گزرے - کام کرنے والوں کی فوراً میٹنگ ہوئی - محاذ جنگ بدلا گیا، خاکسار امامت سے ہمیشہ کے لئے محروم کیا گیا اور مجذوب مشہور کر دیا گیا لیڈروں نے کھانا کھانے کے بعد تقریریں شروع کر دی - اور میرے بارہ میں ایسے زوردار کلمات کہے کہ نماز والا واقعہ بالکل بھول گیا - اور ووٹروں نے میری طرف اس طور پر دیکھنا شروع کیا جیسے کوئی کسی پُرجلال فقیر یا چیچک کا ٹیکہ لگانے والے کی طرف دیکھتا ہے -

تین چار مہینے مجھ پر کیسے گزرے - اس کی داستان نہایت طویل ہے - کہاں کہاں اور کیسے کیسے میں نے تقریریں کیں - کہاں کہاں چندے دئے - کتنوں کی شادی کرائی - کتنوں کے عقیقے کرائے - کتنوں کے ختنے میں شریک ہوا، کتنوں کی ڈگریاں ادا کیں - کتنوں کا علاج کرایا - کتنوں کے ہاتھ جوڑے - کتنوں کے پاؤں پکڑے، کتنے فاقے کئے - کتنی میلادیں پڑھیں کتنی قوالیاں سنائیں، کتنی ملاحیاں سنیں، کہاں سر کے بل گیا - کہاں منہ کے بل گرا - کتنے نااہلوں کی جوتیاں سیدھی کیں - کیسی کڑیاں اُٹھائیں، کتنے دھکے کھائے - غرض الکشن میں کامیاب ہوا - دوسرے ہی دن فریق ثانی نے مقدمہ دائر کر دیا کہ الکشن میں بڑی بے عنوانیاں ہوئی تھیں -

بہزار خرابی منتخب ہوا تھا - بسہولت تمام مقدمہ میں پھنسا اور اب با اطمینان خاطر آپ سے رخصت ہوتا ہوں اور یہ سب محض ریڈیو کی خاطر -

("آواز") رشید احمد صدیقی

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔